TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

بنام عندلیب خوش نوا ماہنامہ

رجسٹرڈ نمبر ۴۷۸ اے

جامیت جہاں نماے ہر مجموعہ ریں

(تاریخ اجراء الناظر ۱۳۱۷ھ (از خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر :- ظفر الملک علوی

نمبر ۱	جنوری ۱۹۳۵ء	جلد ۳۹

فہرست

قسم عام - (رنگین سرورق - چکنا کاغذ)	سالانہ مع محصول ڈاک ۶	فی پرچہ ۸
ارزاں ایڈیشن - (سادہ سرورق - کاغذ)	۴	۶

بادۂ کہن

الناظر کی شائع شدہ ۳۰ جلدوں کا ایک مکمل سٹ بھی برغرض فروخت موجود نہیں - صرف ۲۵ یا ۲۸ جلدوں کے چند سٹ ابھی مل سکتے ہیں - اور کچھ جلدیں زیادہ تعداد میں بچی ہیں - اس لیے اس ذخیرے کو ختم کرنے کے لیے ان کی قیمتوں میں

انتہائی تخفیف

کا اعلان کیا جاتا ہے - ہر جلد کا مختصر حال اور رعایتی قیمت درج ذیل ہے :-

(۱) جلد چہارم (جنوری لغایت جون ۱۹۱۱ء)

خاص مضامین نثر :- عجائبات فلک (از مفتی انوار الحق ایم اے) شاہان اودھ کی بے تعصبی (از خواجہ عبدالروف عشرت) معرفت حق (مولوی سید علی اصغر بلگرامی) سکندر مقدونوی (ا - ت) عالم خیال پر ایک نظر (شیخ مشیر حسین قدوائی بیرسٹرایٹ لا) اہمیت شکر (مولوی ابوالحسن الہ آبادی) جاپانی عورت (ف - ک) تقسیم محنت (خان بہادر مرزا سلطان احمد) حضرت فخرالدین عراقی (عبداللہ بینی مولوی معشوق حسین خاں بی اے) عالم خیال کے دوسرے رُخ پر ایک نگاہ (مسٹر محمد سلیمان برسٹرایٹ لا) اسپین اور اسلام (مسٹر ابرار حسین) تسلیم و رضا (ابوالعلا سید احمد ناطق) فطرت (خان بہادر مرزا سلطان احمد)

نظم :- عالم خیال (شوق قدوائی کی یہ نظم بہت مقبول ہوئی اور کتابی صورت میں بار بار چھپ چکی ہے) ایس کیا ہوں (مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی) مہند (شوق قدوائی) ماں کی مامتا (منشی محمد حسین محوی) نوحہ خوانی (مرزا کاظم حسین محشر) مسدس نعتیہ (مولوی سید علی الدین تمنا پھلواروی) عبرت حسرت (علامہ سید علی نقی نظم طباطبائی) حمد باری تعالیٰ (الملک محی الدین) سینس اینڈ ریلیجن (شوق قدوائی) باغ خزاں رسیدہ (محوی)

حجم ۳۶۰ صفحے قیمت سابق عہ
رعایتی قیمت ۸ /

(۲) جلد پنجم (جولائی تا دسمبر ۱۹۱۱ء)

خاص مضامین نثر :- مسلمانوں کی علمی ترقیاں (مولوی محمد نعمت خاں) حق معرفت (مولوی سید علی اصغر بلگرامی) مجوزہ محمڈن یونیورسٹی پر ایک فلسفیانہ نظر (مسٹر ظفر حسن خاں) اُستاد الملک مُلا جیون (قاضی خادم حسین علوی) برجیس فلک (مفتی انوار الحق ایم اے) ہندوستان کے نوشتہ ہائے اسلامی (مولانا تسلیم شمس اللہ قادری) شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (عبداللہ) عورتوں کے حقوق (مولانا سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ) شیخ اوحدالدین کرمانی (عبداللہ) مسلمانان ہند کی معاشرت اور اس کی اصلاح ("ڈاکٹر" کے فرضی نام سے کپتان لطافت حسین خاں آئی ایم ایس نے یہ مضامین لکھے) ذکاوت یا اخلاق (مولوی جواد علی خاں عاقل) مشتری اور اسکا انجام (مفتی انوار الحق ایم اے) مولانا جلال الدین بلخی الرومی (عبداللہ)

اہلیا بائی اور ٹوکوجی ہلکر (عانی خاں) دوا فروش کی بیوی (جلیل قدوائی) عقل انسانی (پروفیسر عقیدت مند ولی الرحمن ایم اے) جسونت راؤ ہلکر (عانی خاں) تعلیمات بشنٹ (مولوی حامد علیخاں) ادب اردو کے اربع عناصر الاربعہ (یہ انعامی مضمون ۱۰ ار کو الگ فروخت ہوتا ہے) ازمولوی سید نصار جامعی) حضرت محبوب الٰہی (عبد اللہ) تنبیہات الرشید (مولوی ضیاء احمد ضیاء ایم اے) گل رعنا (ریویو از سید ہاشمی فرید آبادی) آلتشا بائی اور ملہر راؤ دوم (عانی خاں) جگنناتھ (منشی محمد ظفر ایم اے)
نظم:- نعت سرور کونین (اصغر گونڈوی) نظر کا غم (تپش خورجوی) بی اماں (جلیل قدوائی) لعبت ماتمی (مسلم عظیم آبادی) باد صبا (مولوی وحید الدین سلیم) طرز محبت (اقدس حیدر آبادی) رباعیات (نازش بدایونی)

حجم ۵۰۴ صفحے - قیمت سابق عار

رعایتی قیمت عہ

(۷) جلد سی ام (جنوری تا مارچ سنہ ۱۹۲۶)

(رسالہ استبداد مسلسل)

خاص مضامین نثر:- جمہوریت افلاطون (مرزا محمد عسکری بی اے) عربی رقم (ملا معصوم علی) اودھ پنچ کے بیجا اعتراضات (مولوی محمد محسن تاشیر ایم اے) سالک المنتظر (پروفیسر نسیم الرحمن ایم اے کا یہ رسالہ علیحدہ بھی چھپا ہے) موجودہ طریقہ تعلیم میں ترمیم کی ضرورت (مولوی سید ذہب علی رضوی ایم اے) مشیر قانونی (رنفیل) زبان ممکن ہی ہے یا بگڑ رہی ہے (ڈاکٹر سعید احمد بریلوی) شعرالہند (ریویو از پروفیسر وحید مرزا ایم اے) شہرابی (جلیل قدوائی) ایک برکا ٹکڑا (سید علی عباس حسینی ایم اے) انعامی مضمون (مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے ایل ایل بی - ۵۶ صفحے)
نظم:- تضمین بر غزل ثنائی (مولوی وارث حسین خفاش کرانی وکیل) اخلاقیات (مولوی وحید الدین سلیم)

حجم ۲۰۰ صفحے - قیمت سابق عہ

رعایتی قیمت ۱۰ ار

(۸) جلد سی و دوم (جنوری تا مارچ سنہ ۱۹۲۷)

خاص مضامین نثر:- اردو اور لکھنؤ (پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی) پانچ ناول نگار (سید وزیر حسن دہلوی) سلا حقیقہ عظمٰی (مسٹر احمد علوی بی اے) مسلم یونیورسٹی کی حالت زار (اڈیٹر) ملوکیت و جمہوریت (مولانا حافظ اسلم جیراجپوری) یادگار انیس (ریویو از پروفیسر مسعود حسن رضوی ایم اے) اصلاح سخن (ریویو از قاضی غلام امیر امیر بدایونی) ٹالسٹائے (مسٹر مظہر علی علوی بی اے) دوراہہ (مسٹر صغیر احمد جان) ننھی سایہ پوش لیڈی (مسٹر فخر الزمان) بہترین انشا پرداز (از مولوی محمد منظور فاضل الہ آبادی)
نظم:- نظم خیالات ("ابو عمر") ماتم شاد (مولوی محمد مسلم عظیم آبادی ایم اے) غزلیات:- حضرت ریاض، رضا علی وحشت، مولوی وحید الدین سلیم، (جلیل قدوائی وغیرہ)

حجم ۲۲۰ صفحے - قیمت سابق عہ

رعایتی قیمت ۱۹ر

منیجر رسالہ الناظر لکھنؤ

نئی کتابیں

مقالات شبلی (جلد چہارم) مولانا شبلی کے متفرق مضامین، جو الندوہ اور دیگر جرائد میں چھپے تھے نئی ترتیب سے شایع کیے جا رہے ہیں۔ جلد اول میں مذہبی مضامین (قیمت عہ) جلد دوم میں ادبی مضامین (قیمت ۱۲ر) جلد سوم میں تعلیمی مضامین (قیمت ۸ر) اور اس چوتھی جلد میں تنقیدی مضامین ہیں۔ قیمت عہ

بہار۔ قدیم و جدید شعرائے فارسی اردو کے کلام کا دلچسپ انتخاب الیاس احمد صاحب ایم اے ایل ایل بی نے خاص عنوانات کے تحت کیا ہے۔ جسکے شروع میں مولانا عبدالسلام ندوی مصنف شعرالہند کا تعارف ہے۔ عہ

قربانی۔ پنڈت کشن پرشاد کول (رکن انجمن خادمان ہند) کا طبعزاد معاشرتی ڈراما۔ قیمت ۸ر

اردو کا پہلا ناول نگار۔ مسٹر ادیس احمد ادیب بی اے آنرز نے اس میں ثابت کیا ہے کہ شمس العلما مولوی نذیر احمد مرحوم اردو کے سب سے پہلے ناول نگار تھے، اور انکے افسانوں پر تبصرہ کیا ہے۔ حجم ۱۸۲ صفحے قیمت عہ

مولانا شبلی۔ الناظر کے انعامی مقالہ کا وہ مضمون جسپر مسٹر سعید انصاری بی اے کو انعام دیا گیا تھا، اب دوبارہ مصنف کی نظرثانی و ترمیم کے بعد چھپا ہے قیمت ۸ر

خواب پریشان۔ شکسپیر کے مشہور ڈرامہ سمر نائٹس ڈریم کا ترجمہ از جناب منشی امیر حمد صاحب علوی بی اے۔ ۸ر

عرب کی موجودہ حکومتیں۔ یعنی عرب کی قابل ذکر حکومتوں، نجد و حجاز، عسیر، یمن، لحج، نواحی تسعہ، بحرین، کویت، عراق اور حوادث فلسطین و شام کے مختصر اور جامع حالات مرتبہ مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مع جغرافیہ عرب مرتبہ "طالب علم" مقیم مکہ۔ قیمت ۱۲ر

چنگیز خاں۔ نامور تاتاری فاتح کی سوانحعمری جس نے اپنے عہد کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ ایک انگریزی کتاب سے مولوی عنایت اللہ خلف شمس العلما ذکاء اللہ نے ترجمہ کر کے بحسن و خوبی تمام چھپوائی۔ حجم ۳۵۰ صفحے۔ ۱۲ر

افکار عصریہ۔ پروفیسر محمد نصیر احمد عثمانی معلم طبعیات عثمانیہ یونیورسٹی نے یہ کتاب انگریزی سے اردو میں منتقل کی ہے۔ اس میں سائنس کے مختلف مضامین ہیں جنکے مطالعہ سے عام لوگوں کو زمانہ حال کی بہت سی دریافتوں اور طبعیات کے اہم مسئلوں کے متعلق کافی معلومات ہو جائیگی۔ غیر انگریزی داں طبقہ کے لیے یہ کتاب نہایت مفید ہے قیمت ۱۲ر

رس۔ یعنی فلسفۂ انبساط۔ سنسکرت ادب کے [illegible] مولوی [illegible] الرحمن صاحب شاستری نے جو مسلم یونیورسٹی میں سنسکرت کے معلم ہیں یہ قابل قدر کتاب لکھی ہے [illegible] ڈراما کے متعلق مسرت [illegible] ذاتی ہونے کی توضیح کی گئی ہے۔ قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ — الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

(بقیہ صفحہ ۸۶)

ایک طرف مسلم یونٹی بورڈ ہوگا، دوسری طرف یوپی مسلم پارٹی۔ اور دونوں کی غایت یہ ہوگی کہ چند زردار یا ہوشیاروں کو کونسل کی کرسی پر بٹھا دیا جائے۔ جہاں پہونچ کر بڑی جیب والے یا زیادہ چالاک اصحاب وزارت پر فائز ہوں اور بقیہ اپنے اغراض کی تکمیل کے لیے دوسری راہیں تلاش کریں۔

جدید اصلاحات کا اور نتیجہ کچھ ہو یا نہ ہو، مگر جاہ طلب طبقہ کے لیے چند عہدے اور پیدا ہو جائیں گے۔ اسی لیے لوگوں میں قومی ہمدردی و غمخواری کا مرض روبترقی ہے۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں میں ایسے دردمند بہت کم ہیں جو محض قومی خدمت کے نقطۂ نظر سے کونسلوں میں جاتے ہوں، ورنہ مطلب پرست و خودغرض، پارٹی باز اور گروہ ساز طبقہ کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے ایک مضبوط جماعت کی تشکیل آسان ہوتی۔ روپیہ اور عیاریاں اسکے پاس ہیں مگر ووٹ غریب مسلمانوں کے ہاتھ ہیں جن کو مناسب طور پر صورت حال سے آگاہ کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان قوم فروشوں اور اقتدار پسندوں کی مقصد برآری کا آلہ بننا پسند کریں کہ اس سے خود اُنکی مشکلات روزافزوں ہیں اور زندگی وبال جان ہو رہی ہے۔

حضرت یگانہ مرزا صاحب کا ہماری شاعری کے خلاف اعلانِ جنگ اور اس سلسلہ میں لکھنؤ اور الٰہ آباد یونیورسٹیوں کے معلمین اردو کا سید مسعود حسن صاحب کے مقابلہ میں مشترکہ محاذ قائم کرنا نہایت درجہ قابل افسوس ہے۔ اگر ان اصحاب کا نقطۂ نظر خالص ادبی ہوتا تو الناظر بڑی خوشی سے اسکا استقبال کرتا، مگر تمام حالات سے باخبر ہونے کے بعد صاف نظر آتا ہے کہ جھگڑا صرف ذاتیات کا ہے۔ اور ہم مجبور ہیں کہ اس طریق کار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ یگانہ صاحب میں تحقیق و تنقید کی جو صلاحیتیں ہیں، وہ زیادہ کارآمد ثابت ہونگی اگر وہ اُن صدہا کتابوں کی اصلاح پر توجہ فرمائیں جو اصحاب تعلیم کے طور پر مدارس میں محض ناشرین کی نفع رسانی کے لیے رائج ہیں اور اردو زبان کو بگاڑنے اور مسخ کرنے میں کافی حصہ لے رہی ہیں۔ آپس کی زور آزمائی تماشائیوں کے لیے ضرور لطف و دلچسپی کا سبب ہوگی مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ فریقین کو کیساں نقصان پہونچائیگی

جمعۃ الوداع سے عید تک دو مرتبہ ان تعطیلات نے الناظر کی خدمت کا موقع نہ ملا۔ اور اس دفعہ ضخیم ۸۸ صفحے ہو گیا ہے اسلیے طباعت میں وقت زائد صرف ہوا۔ کوشش ہے کہ پرچہ جنوری کی آخری تاریخوں میں ناظرین کرام تک پہونچ جائے۔ لیکن ایسا نہ ہو تو ناظرین معذور سمجھ کر تاخیر معاف فرمائیں۔ انشاءاللہ فروری کا نمبر وقت ہی پر پہونچے گا۔ سب اصحاب اسے یاد رکھیں کہ الناظر کی اشاعت انگریزی مہینہ کی آخری تاریخوں میں ہوتی ہے۔ (۲۲ جنوری)

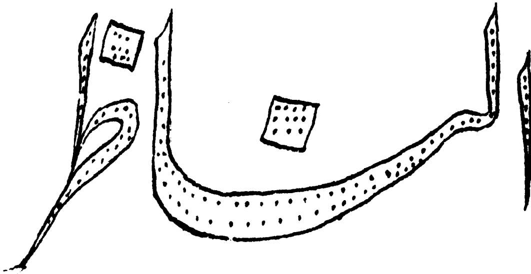
فہرست مضامین

الناظر جلد ۳۹ بابت جنوری لغایتہ جون سنہ ۱۹۳۵ء

(حصۂ نثر)

(حصۂ نظم)

بنامِ خداوندِ جہاں آفریں



نمبر ۱ جلد ۳۹ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء

اودھ کو علیحدہ صوبہ بنایا جائے

(جناب خان بہادر شیخ مقبول حسین صاحب قدوائی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ تعلقدار گدیہ)

یہ مضمون اودھ کے تعلیم یافتہ اور بیدار طبقہ کو غور و فکر اور جد و جہد کی دعوت دینے کی غرض سے شایع کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ تحریک چند سال قبل اُٹھائی جاتی تو شاید سندھ اور اُڑیسہ کی طرح اودھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تجویز بھی قرطاس ابیض اور پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ میں شامل ہوتی، مگر اُس وقت راقم مضمون سرکاری ملازمت کی وجہ سے اس قسم کی تجویز پیش کرنے یا ایسی کسی تحریک کی رہنمائی کرنے کے مجاز نہ تھے۔ اب بھی اُن کی تجویز کا بارآور ہونا ممکن ہے اگر صوبہ کے بااثر اور فعال طبقے اس بارے میں متحد الخیال ہوں اور پوری سرگرمی و یکجہتی کے ساتھ اس مقصد کے لیے جد و جہد کریں۔

برطانوی مدبرین کا قاعدہ ہے کہ اگر اُنکے منافع قومی متعلق نہ ہوں، تو وہ ہر معقول بات کو ماننے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں بشرطیکہ مناسب طریقے سے اُنکے روبرو پیش کی جائے۔ صوبہ اودھ کو علیحدہ کرنے میں نہ برطانوی حکومت کا کچھ نقصان ہے نہ حکومتِ ہند کے لیے کوئی دشواری۔ اس لیے نسبتاً آسانی سے تصفیہ ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔ پھر اس صوبہ کے ہندو مسلمانوں کا عددی توازن بھی ایسا نہیں کہ علیحدگی کی تحریک سے کوئی فرقہ وارانہ سوال پیدا ہو۔ اختلاف کچھ ہو سکتا ہے تو اُن اصحاب کو، جنھیں اندیشہ ہو کہ اس سے تعلقداروں کا اقتدار بڑھے گا اور چھوٹے زمینداروں یا کسانوں کی

اس کا اثر پڑے گا۔

بہر صورت اس مسئلہ پر سب کو غور کرنا چاہیے اور اگر اودھ کو علیحدہ کرانا ہے تو اس کے لیے ایک نمائندہ اجتماع کر کے مناسب عملی کارروائی کرنا چاہیے۔

صوبہ کے تمام اخبارات و رسائل سے امید ہے کہ اس مضمون کی اشاعت اور اس پر اپنے اوراق میں بحث کریں گے۔

ایڈیٹر

اودھ اس وقت بھی ہندوستان کا ایک مختص اور مکمل انتظامی حصہ ہے۔ صوبۂ آگرہ کے ساتھ الحاق سے اس کی امتیازی حیثیت ایک صوبے کی ضائع نہیں ہوئی ہے۔ وہ صوبۂ آگرہ میں مدغم ہو کر اسکا ایک جزو نہیں ہو گیا ہے۔ اسکا واضح ترین ثبوت ہمارے مجتمع صوبوں کا نام ہی صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ ہے جسکے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ دو مختلف صوبے یعنی صوبۂ آگرہ اور صوبۂ اودھ شامل کر کے ایک متحد حکومت بنائی گئی ہے

میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی حصہ جسکی حیثیت بلحاظ ایک جامع حصۂ حکومت کے دوسرے اقطاع ملک سے علیحدہ ہو، اودھ سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اس کی یہ حیثیت اسی وقت سے قائم ہے جب اجودھیا راجہ رام چندر جی کے آباؤ اجداد کا دارالسلطنت تھا، اور جب درحقیقت اودھ ہی مہذب ہندوستان تھا۔ تاریخ عتیق کے مختلف دوروں میں اودھ کے رقبے میں وقتاً فوقتاً کمی بیشی ہوتی رہی مگر اس کی انفرادی حیثیت ہمیشہ برقرار رہی۔ دوسرے اقطاع و اضلاع اس میں شامل ہو کر اس کا جزو بنے یا اس سے خارج ہوئے، مگر اس کا رقبہ کم ہونے پر بھی اس کے من حیث الصوبہ امتیاز و اقتدار میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ اس کا نام بعض اور اقطاع ہند کی طرح صفحۂ تاریخ سے کسی وقت غائب نہیں ہوا، نہ وہ کسی دوسرے صوبے کا تابع حکومت ہوا۔

انگریزی حکومت کی ابتدا میں اودھ گو برائے نام صرف ایک صوبہ سلطنت مغلیہ کا تھا لیکن دراصل وہ ایک با اختیار اور طاقتور سلطنت تھی اور اس کی یہ حیثیت غدر کے پہلے انگلستان کے ارباب حل و عقد نے باقاعدہ طور پر تسلیم کر لی تھی۔ پھر یہ سلطنت غدر کے بعد ایک منفرد صوبے کی حیثیت سے انگریزی حکومت ہند کے زیر انتظام آئی اور تقریباً ربع صدی تک ایک مخصوص چیف کمشنر کے زیر حکومت رہی۔ ۱۸۷۷ء میں گورنمنٹ ہند کو انتظامی ضروریات کی بنیاد پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ یہ علیحدہ عہدہ چیف کمشنر کا تخفیف میں لایا جائے، اور اس کا الحاق صوبۂ ملحق "ممالک مغربی و شمالی" کے لفٹنٹ گورنر کے ساتھ کر دیا جائے، اور دونوں صوبوں کا عاملانہ اسٹاف مشترک ہو جائے۔ باوجودیکہ اس تغیر نظام سے اودھ کی شخصی حالت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جو فرق ہوا تھا وہ صرف یہ تھا کہ اس کا

حاکم اعلیٰ جس کا لقب اب بھی چیف کمشنر رہا تھا، بجائے اسکے کہ صرف اُسی کی حکومت کا ذمہ دار ہو ملحقہ
صوبے کی حکومت کا بھی ذمہ دار تھا - اُس کی عدالتیں اور اُس کے قوانین اب بھی دوسرے صوبے کی
عدالتوں اور قوانین سے علیحدہ قائم رہے تھے - تاہم اس تغیر کے خلاف اودھ کے تعلقداروں اور سربرآوردہ
باشندوں نے شدید صدائے احتجاج بلند کی اور ایک عرصے تک تعلقداران اودھ بسربراہی راجہ
سرامیر حسن خاں صاحب مرحوم تعلقدار محمود آباد واویلا مچاتے رہے - اس موقع پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ راجہ صاحب
مرحوم کی قابلیت اور اخلاقی جسارت کی قابل رشک شہرت کا جو سکہ ملک پر بیٹھا اُس کا سب سے بڑا
ذریعہ اُن کا اس اختلاف ہی کا کارنامہ تھا - اس مخالف گروہ کے اختلاف کا لب لباب یہ تھا کہ ممالک مغربی
وشمالی کے لفٹنٹ گورنر کے زیر حکومت آنے سے اودھ کی تخصیصی حالت میں فرق آجائے گا - اور اُن کی نئی
گورنمنٹ، اُن کی ضروریات، اُنکے مدارج اور اُنکے مفاد کو اُسی حد تک ملحوظ نہ رکھیگی جتنا کہ اُن کا مخصوص
حکمراں رکھتا تھا - نیز دوسرے صوبے کے عامل افسر اسکے مختلف حالات سے ناآشنا اور اودھ کی روایات
سے ناواقفیت کی وجہ سے باشندگانِ اودھ کے حقوق و امتیازات کا کامل احترام نہ کریں گے - گورنمنٹ
کی طرف سے ان وسوسوں کے متعلق پورا اطمینان دلایا گیا اور کہا گیا کہ ممالک مغربی وشمالی کے لفٹنٹ
گورنر کا یہ فرض ہوگا کہ اودھ کے چیف کمشنر کی حیثیت سے وہ اودھ کے خاص حالات کو ہر وقت پیش نظر
رکھے اور اودھ کی روایات، قوانین اور حقوق کا اب بھی ویسا ہی لحاظ قائم رکھے جیسا پیشتر تھا - چنانچہ
حقیقت بیشتر ایسا ہی ہوا - حکمرانِ مشترک کی عام طور پر اودھ کی طرف خاص توجہ رہی - لکھنؤ الہ آباد
سے زیادہ اسکا مستقر رہا - معاملاتِ حکومت میں باشندگان اودھ کی خواہشوں اور رایوں کو خاص وقعت
دی جاتی رہی - اُنکے تخصیصی انسٹیٹیوشنوں میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی - اُنکے قانون اور عدالتیں
بدستور علیحدہ رہیں -

پچیس سال کے بعد پھر ایک تغیر ہوا - شمال و مغرب میں ایک نیا صوبہ قائم ہونے کی وجہ سے اس
لئے حکومت کے نام میں تغیر کی ضرورت لاحق ہوئی اور وہ بجائے "ممالک مغربی وشمالی اودھ" کے "صوبجاتِ
متحدہ آگرہ و اودھ" کہا جانے لگا - اور اسی کے ساتھ چیف کمشنر کا لقب منسوخ ہوکر دونوں صوبوں کے
مشترک حکمراں کا لقب صرف لفٹنٹ گورنر ہی رہا - یہ صرف نام کا تغیر تھا - حالات انتظام میں اس سے
کوئی فرق پیدا نہیں ہوا - دونوں صوبوں کا صدر حکومت اب بھی اُن کا مشترک گورنر رہا - اُسی کو لامحالہ
دونوں صوبوں کے حقوق اور ضروریات کا یکساں خیال رہا - اور اُن میں تصادم کی حالت میں دونا
دونوں کی بہبودی کو بغیر جانبداری مدنظر رکھنا رہا -

لیکن اب کیا ہوگا۔ ہندوستان کے طرز حکومت کا کلیتاً بدل جانا طے شدہ امر ہے۔ اب تک حکومت کے درجہ بدرجہ تنخواہ دار افسر تھے، جنکا طبقہ عالی سلمہ قابلیت کا آزمودہ کارگروہ تھا جو گردوپیش کے اثرات سے اس وجہ سے کلیتاً محفوظ تھا کہ یہ اثرات اُسکے افراد کے منصب میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتے تھے۔ یہ افسر امور حکومت میں جو کچھ مناسب سمجھتے تھے کرتے تھے۔ باشندگان ملک کو اُن پر کوئی اختیار نہ تھا اور اس وجہ سے باشندگان ملک کو حکومت سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ ملک ایک مدت سے اس طریق عمل کو ناپسند کرنے لگا تھا۔ وہ خود اختیاری حکومت کا مدعی تھا۔ یعنی یہ کہ اصل حکومت نمایندگان ملک کے ہاتھ میں آئے اور تنخواہ دار افسر اُنکے تابع فرمان ہوں۔ ایک عرصے کی جد و جہد کے بعد اب یہ طے پاگیا ہے کہ کم سے کم ہمارے صوبہ جات کو یہ حکومت خود اختیاری جلد سے جلد حاصل ہو جائیگی۔ مرکز حکومت ہر صوبے کی قانون ساز کاؤنسل ہوگی جس میں باشندگان صوبہ کے نمایندے داخل ہونگے اور ممبران گورنمنٹ کا انتخاب یہ نمایندے کریں گے۔ تمام اندرونی معاملات ان کاؤنسلوں کے سپرد ہونگے اور کثرت آرا سے طے پایا کرینگے۔ یہی طریق حکومت بیشتر ملکوں میں رائج ہے اور ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے ملک کی تمام اصلاحوں سے اس پولٹیکل اصلاح کو مقدم سمجھتا ہے۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ کیا اودھ کو بھی اپنی موجودہ حالت اشتراک پر قائم رہکر یہ مقبول عام اور دلخواہ طرز حکومت حاصل ہو سکتا ہے۔ اس طرز کے مقبول عام اور دلخواہ ہونے کا ثبوت اس سے بہتر کیا نہیں ہے کہ نہ صرف کل ہندوستان اُسکے حصول کے افکار میں شوریدہ اور بے چین ہے بلکہ اُسکے مختلف اقطاع نے مثلاً سندھ جو ایک مدت سے بمبئی پریسیڈنسی کا ایک جزو تھا، اڑیسہ جو تین صوبوں میں ایک مدت سے تقسیم تھا، اور نیا صوبہ مغربی و شمالی جو پنجاب کو کاٹ کے بنایا گیا ہے اُس سے بجائے خود مستفید ہونے کی غرض سے اپنی علیحدہ حیثیت قائم ہونا گورنمنٹ سے طے کر چکا ہے۔ لیکن اودھ خاموش ہے۔ کیا اُسکو حکومت خود اختیاری کی ضرورت نہیں یا خواہش نہیں، یا وہ سمجھتا ہے کہ وہ اسکو اسکی موجودہ ہی صورت میں حاصل ہو جائے گی؟ اس کی موجودہ صورت کیا ہے؟ اُس کی اور اس کے شمال صوبے کی واضع قانون کاؤنسل مشترک ہے۔ اس میں دونوں صوبوں کے ممبروں کی نسبت اُسکے مخالف تقریباً چہار اور ایک کی ہے۔ کاؤنسلوں کے معاملات کثرت رائے پر طے پاتے ہیں۔ اس لیے کسی معاملے میں دونوں صوبوں کے اختلاف پر اُسکی کامیابی کیونکر خیال میں لائی جا سکتی ہے۔ مثلاً اگر یہ سوال کسی وقت اُٹھے کہ اُس کا چیف کورٹ فضول اسراف ہے، الہ آباد کا ہائیکورٹ اُس کی ضرورت پوری کر سکتا ہے یہ کہ لکھنؤ بیجا طور پر دارالحکومت ہے، الہ آباد کا حق فائق ہے، تو کیا تمام اودھ ہم آواز ہونے پر بھی اپنا

مجلس قانون میں بازی جیت لے جانے کی عقلاً اُمید کر سکتا ہے؟ ایک چھوٹی سی مثال اسکی کہ نئے طریقے کی حکومت میں اودھ کو کیا توقع رکھنی چاہیے' اسوقت بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ حال کے کانسٹیٹیوشن کے تحت ممبران گورنمنٹ کا انتخاب اور تقرر صرف گورنر کے ہاتھ میں ہے اور گورنر ایک غیر جانبدار افسر ہے جس کا فرض اپنے ماتحت دونوں صوبوں کے حقوق کا یکساں خیال رکھنا ہے۔ تاہم گو ان صوبہ جات کی گورنمنٹ علاوہ گورنر کے چار ممبروں پر مشتمل ہے مگر ایک عرصے سے ان میں سے ایک بھی اودھ کا باشندہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ آیندہ نمایندگان اودھ کے ووٹوں کی ضرورت اُس کی نظر اندازی کو بالکل اس حد تک پہونچنے دے لیکن کیا اس میں کسی شبہہ کی گنجایش ہے کہ نئی حکومت میں یہ صوبہ عموماً بے بس ہوگا اور جبکہ صوبۂ آگرہ کی قوت بمقابلہ اُسکے کم سے کم چہ گنی زیادہ ہوگی اور آگرہ کی ضروریات گورنمنٹ کی توجہ اور اعانت کی طالب و مستحق اسی تناسب سے بیشتر ہونگی اور اودھ کے باشندوں کو ہر شعبۂ زندگی میں اسی تناسب سے دوسرے صوبے کے باشندوں سے مقابلہ کرنا ہوگا تو غریب خالص زراعت پیشہ اودھ کا کیا حشر ہوگا؟

لیکن بین الصوبہ اختلافی معاملات سے قطع نظر کرکے کیا حکومت خود اختیاری فی نفسہٖ ایسی چیز نہیں ہے کہ اُسکے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے؟ کیا باشندگانِ سندھ اور باشندگان اُڑیسہ کو جنون ہے کہ وہ اُن صوبوں سے جن میں وہ پیوست ہوگئے تھے علحدہ ہوکر اپنی ذاتی حیثیت اور اپنا ذاتی اختیار و احترام قائم کرنے اور یہ انمول حق حاصل کرنے کے لیے جان لڑائے ہوئے ہیں؟ - کیا اگر اُن کی موجودہ حیثیت قائم رہی تو اُنکے لیے اودھ سے زیادہ کوئی خطرہ متصور ہے؟ یہ قطاع اودھ کی طرح اسوقت بجائے خود ایک صوبہ نہیں ہیں۔ وہ رقبے میں اودھ سے کہیں کم ہیں۔ ان کا اور اودھ کا آمدنی میں کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ لیکن وہ اپنے حق کے واسطے' اپنے مرتبے کے واسطے' اپنی حکومت پر اختیار رکھنے کے واسطے اور دوسرے خود اختیار صوبوں سے پیچھے نہ رہنے کے واسطے زبردست لڑائی لڑ رہے ہیں - اودھ قانع اور بحس بیٹھا ہے اور وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔

اودھ کا رقبہ تقریباً آئرش فری اسٹیٹ کے برابر ہے۔ اُسکی آبادی سوا کروڑ سے زیادہ اور آمدنی پانچ کروڑ سے زیادہ ہے۔ کیا ایسا ملک حکومت خود اختیاری کے شایاں نہیں سمجھا جا سکتا؟ اُسکو درحقیقت ایسی علحدہ حکومت کی ضرورت ہے۔ وہ ہر قسم کی ترقی میں نہ صرف صوبۂ آگرہ سے بلکہ بیشتر دوسرے صوبوں سے بہت پیچھے ہے۔ اُسکے ہر طبقے کی ازدیاد فلاح و بہبود کے واسطے اُس کی گورنمنٹ کی خاص توجہ اور کوشش درکار ہوگی اور یہ توجہ اور کوشش اُس کو ایسی گورنمنٹ سے حاصل ہونا ممکن نہیں ہے جس پر اس کے ساتھ ایک دوسرے صوبے کے بھی فرایض انتظام ہوں جو ہر اعتبار سے اُس سے بہت زیادہ

بڑا ہے ۔ اس صورت کا یہ نتیجہ ناگزیر ہے کہ اس کی تمام مخصوص ضروریات پس پشت پڑتی رہیں اور اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جائے ۔

ہم نادانستہ اُن حالات سے فطرتاً اس قدر متاثر ہوتے ہیں جنکے ہم عادی رہے ہیں کہ باعث تغیر زمانہ اُن کو اپنے خیال سے دُور کرنا ہمارے لیے دشوار ہوتا ہے ۔ ہم بڑے صوبوں کو مفید سمجھنے کے عادی ہو رہے ہیں ۔ موجودہ طرز حکومت میں صوبوں کا بڑا ہونا یقیناً مفید حکومت تھا ۔ اُن میں بڑی بڑی تنخواہوں کے افسروں کی زیادہ گنجایش ہوتی تھی اور اُنکی ترقیوں کے زیادہ دروازے کھل سکتے تھے ۔ حکومت آگرہ کے ساتھ حکومت اودھ کے الحاق کی ایک بڑی ضرورت یہی تھی ۔ لیکن وہ اصول جمہوری حکومت پر حاوی نہیں ہو سکتا ۔ برعکس اسکے ایسی حکومت اُسی قدر زیادہ موثر اور مفید ہو گی جس قدر ایک مناسب حد تک زیادہ چھوٹے رقبے پر وہ قائم ہو ۔ مثلاً آگرہ اور اودھ کو ایک صوبہ قرار دے کر اس کی کانسٹی ٹونسیاں ایسی چھوٹی بنانا ناقابل عمل ہے کہ ووٹروں اور ممبروں کے درمیان معقول واقفیت، حصول اعتماد یا تبادلۂ خیالات کا کافی موقع ملے ۔ لیکن اودھ کی کاؤنسل اگر علیحدہ ہو تو یہ آسانی سے ممکن ہے ۔ اُس کی ہر تحصیل ایک کانسٹی ٹونسی ہو اور اُسکے ہر باشندے کو ووٹ کا حق دیا جائے جسکے معنی اصل جمہوریت ہوں ۔ ہر ممبر اپنے ووٹروں کا سچا نمایندہ بنے ، اُنکے حالات و ضروریات سے واقف اور اُنکے زیر اثر رہے ، اور ملکی معاملات میں ووٹروں کی دلچسپی اور آگاہی مقابلتاً جلد ترقی کر جائے ۔ ایک معلم دس طالبعلموں کو بمقابلہ سو طالبعلموں کے بہت جلد اور مکمل تعلیم دے سکتا ہے ۔

ایک صاحب نے اس مسئلہ پر بحث میں یہ عجیب بات فرمائی کہ اودھ کی آگرہ سے علیحدگی ہندوستان کی نیشنلزم کے مقصد کے خلاف ہے ۔ اس دلیل کے اس کے سوا اور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ سارے ملک کا انتظام اور اس کی تمام باشندوں کی فلاح کی دیکھ بھال صرف ایک دلی سے انجام پانا مفید و مناسب ہوگا ۔ ان صاحب نے بظاہر اس پر غور نہیں کیا کہ امریکہ ، کینیڈا ، آسٹریلیا وغیرہ سب مقامی انتظام کی ضرورت سے مختلف حصوں میں تقسیم ہیں لیکن آج تک کسی نے اُنکے باشندوں کے ایک نیشن ہونے یا ان کے احساس نیشنلزم میں شبہہ نہیں کیا ہے ۔ اور اگر ہندوستان کی شامت سے اس کی کوئی خاص حالت اسکے متعلق ہے تو ظاہر ہے کہ پہلے اُس کے تمام اور صوبوں کی حکومت کو مسترد کر دینا چاہیے تب اودھ کی علیحدگی کی خواہش یا ضرورت پر اعتراض کا موقع ہو سکتا ہے ۔

بعض حضرات یہ پوچھتے ہیں کہ اودھ اپنی علیحدہ حکومت کا صرف بھی برداشت کر سکتا ہے ؟ یہ بھی بہت عجیب سوال ہے ۔ پہلا جواب تو اسکا یہ سوالات ہیں کہ کیا حکومت خود اختیاری کسی قیمت پر بھی گراں

قرار دی جا سکتی ہے؟ کیا ہماری آنکھوں کے سامنے دوسرے ملک والے ایسی حکومت کے واسطے صرف دولت ہی نہیں بلکہ جانیں تک تصدق نہیں کرتے ہیں؟ کیا خود ہمارا ملک ایسی حکومت کے حصول کے لیے روپیہ آنہ، پائی کا حساب لگا رہا ہے؟ اور کیا ہمارا صوبہ سندھ اور اڑیسہ اور صوبۂ شمال و مغرب سے بھی زیادہ بے استطاعت یا پست ہمت ہے کہ وہ ایک نعمت پر صرف سے ڈر رہا ہے درآنحالیکہ یہ اقطاع اُس سے نہیں ڈرتے؟ یا کیا اودھ کا درحقیقت دیوالہ نکلا رہتا تھا جب وہ نہ صرف عہد شاہی میں بلکہ انگریزی دور میں بھی اپنی علٰحدہ حکومت کے مصارف کا تمام و کمال خود کفیل تھا؟ دوسرا جواب یہ ہے کہ حکومت خود اختیاری کے معنی یہ ہیں کہ اختیاراتِ حکومت اپنے ہاتھ میں آئیں۔ اس معاملہ کا پھر وہی حال ہے کہ اُن خیالات سے گریز آسان نہیں ہے جنکے ہم عادی ہو رہے ہیں۔ ہمارے موجودہ انتظامی مصارف دوسروں کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور دوسرے حالات میں پیدا ہوئے ہیں اُنکے پیمانے کا ہمیشہ برقرار رہنا ہرگز ضروری نہیں ہے۔ حالات سابقہ میں کفایت کا لحاظ کبھی ایک شمہ برابر بھی جزو حکومت نہیں رہا۔ روپیہ بہ افراط مہیا تھا اور وہ بیدریغ صرف ہوتا تھا۔ بیرونی اہلکار کم تنخواہوں پر مل نہیں سکتے تھے اور اُنکی تعداد میں کمی بیشی ہمارے اختیار کی چیز نہ تھی۔ خود اختیار اودھ کو نہ اتنی تعداد میں بڑے اہلکاروں کی ضرورت ہو سکتی ہے اور نہ اتنے بڑے بڑے درماہوں کے اہلکاروں کی۔ بلاشبہہ وہ علٰحدہ حکومت اپنے موجودہ صرف سے کم میں چلا سکتا ہے۔ آگرہ میں شامل رہ کر اُس پر اُس کی ضرورت سے زیادہ صرف کا بار پڑنا ممکن ہے۔ اس لیے کہ یہ صرف خود اُسکے اختیار سے باہر ہوگا۔ وہ آگرہ کی کثرتِ آرا کا مجبوراً تابع ہوگا۔ برخلاف اسکے علٰحدہ ہو کر اُس کو کامل اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنے مخارج اپنے مداخل کے اندر رکھے یا ایک انگریزی مثل کے الفاظ میں یوں کہیے کہ اپنا کوٹ اپنے کپڑے کے مطابق قطع کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ سب عذرات بے اصل عذرات ہیں۔ جو ایک مشکل اس معاملہ میں اودھ کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اودھ مردہ ہے یا مر رہا ہے۔ وہ قحط الرجال کے مہلک مرض میں مبتلا ہے۔ اُسکے باشندوں کے جذبات سے اُس کی خدمت کا شوق مفقود ہو گیا ہے۔ اُنکو اپنے ذاتی افکار اور ترددات سے فرصت نہیں ہے۔ اُن میں ہمت نہیں، جوش نہیں، تخیل نہیں، دوراندیشی نہیں اور ملکی معاملات میں سربراہی کی قابلیت نہیں۔ اس سے بڑھ کر اودھ کی اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ درآنحالیکہ دوسرے اقطاعِ ملک ملک کے ایسے عملی فدائیوں، خدمتگزاروں اور رہنماؤں سے مالا مال ہو رہے ہیں جن کی قابلیتوں اور خدمتوں کے ڈنکے چار دانگِ عالم میں بج رہے ہیں ہمارا یہ قدیم مردم خیز خطہ کوئی ایک مثال بھی اُنکے برابر کی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔

هر کس از دستِ غیر ناله کند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

فارسی کے دو لاثیل عُقدے

(جناب مولانا مصطفیٰ حسن علوی صاحب فرآباد ایم اے، فاضل دیوبند۔ معلم لکھنؤ یونیورسٹی)

آج اگر یہ سوال اُٹھایا جائے کہ فتح اسلام کے بعد موجودہ فارسی زبان کی قدیم ترین یا سب سے پہلی کتاب کون تھی، اُسکے مصنف کا کیا نام تھا اور وہ کس فن میں لکھی گئی تو ممکن ہے کہ قیاس و تخمین کی آمیزش سے کچھ نہ کچھ اس کا جواب دیا جا سکے اس لیے کہ اہل عرب کے ایران پر طویل و مدید تسلط و اقتدار کے بعد نہ ہمارے ہاتھ میں وسائل رہے اور نہ ہم کو وسائط پر قابو حاصل ہے کہ حتمی و یقینی طور پر ہم کسی کتاب کے متعلق اس کے قدیم ترین ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ لیکن اگر سوال کے ساتھ ایک قید احترازی بڑھا کر سوال کی شکل یوں بدل دی جائے کہ موجودہ فارسی کی قدیم ترین کتاب کون موجود ہے، تو جواب فی الجملہ آسان ہوگا کہ ایک کتاب تو طبری کی تاریخ کبیر کا ترجمہ ہے، جسکو بلعمی وزیر منصور بن نوح سامانی نے بحکم شاہ ۳۵۲ھ میں یا بالفاظِ دیگر اصل کتاب تالیف ہونے کے پچاس سال بعد فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اور دوسری کتاب اسی طبری کی تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے جو اسی مذکورۃ الصدر بادشاہ کے حکم سے ۳۵۰ھ اور ۳۶۶ھ کے درمیانی سنین میں کیا گیا۔ اسکا ایک نسخہ تو پیرس کی قومی لائبریری میں ہے اور دوسرا برٹش میوزیم کے کتبخانہ میں۔ لیکن افسوس ہے کہ دونوں ناقص ہیں۔ علامہ محمد قزوینی نے مرزبان نامہ کے مقدمہ میں اسکے دیباچہ سے کچھ اقتباس بھی نقل کیا ہے۔ تیسرا نام کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ، مولفۂ ابو منصور موفق کا لیا جاتا ہے، جو اسی سابق الذکر عہد سلطنت میں تالیف کی گئی تھی۔ اس کا ایک نسخہ علی بن احمد طوسی اسدی صاحب گرشاسپ نامہ و فرہنگ فارسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا واٹنؔا کی لائبریری میں محفوظ ہے لیکن اسکا رسم الخط یا تو کوفی ہے یا خط کوفی سے بالکل ملتا جلتا ہوا۔

ہر سہ کتب مذکورہ میں سے تاریخ طبری کے ترجمہ کے متعلق تو تعین تاریخ ممکن ہے کہ ۳۵۲ھ[1] میں کیا گیا، لیکن بقیہ ہر دو کتب کے باب میں کسی تاریخ کی تخصیص یا کسی سن کی تحدید نہ ہونے سے ان ہر سہ کتب میں بھی کسی کے متعلق سابق یا مسبوق ہونے کا حکم قطعاً نہیں لگایا جا سکتا۔ قطع نظر اسکے یہ جواب فی الجملہ مسکت و مفہم بھی نہیں۔ اس لیے کہ اگر ہم کو کسی کتاب کی موجودگی کا علم نہ ہو یا اگر کسی نسخہ تک ہماری دسترس نہ ہوئی ہو تو یہ دلیل اسکے عدم وجود کی نہیں قرار دی جا سکتی۔ ممکن ہے کوئی اور کتاب

[1] تاریخ ادبیات ایران براؤن صلـ۲۲ـ

زاویۂ خمول میں پڑی رہنے کے باعث منصۂ شہود پر نہ آسکی ہو۔ حکومتوں کا ردوبدل، سلطنتوں کا انقلاب تیموری قتل ونہب اور نادری کشت وخون نے حب آسمان کے طبق الٹ دیے، زمین کے تختے پلٹ دیے، تو کیا استعجاب اور اچنبھے کی بات ہے کہ ایران کے صحیفے اور کتابیں تتر بتر ہوگئی ہوں اور مشرق کی چیزیں مغرب میں اور عجم کی چیزیں عرب میں پہنچ گئی ہوں۔ پھر اگر ذی علم اور قدر دانوں کے ہاتھ لگیں تو جان سے زائد قیمتی سمجھ کر اُنکا تحفظ کیا گیا اور اگر نااہل اور جُہال کے قبضہ میں آپڑیں تو ممکن ہے کہ ضائع ہوگئی ہوں یا کس مپرسی میں پڑی ہوں۔ دُور کیوں جایئے، بڑی بڑی بیش قیمت اور نادر کتابیں آج ہندستان میں بھی بنیے بقالوں کے یہاں ردّی کے ساتھ تُل کر بکتی ہیں، اور عطاروں کے یہاں سے پڑیاں باندھ کر آتی ہیں۔ اور ابھی سیکڑوں نادرۂ روزگار حلبہ بے قدری اور حقیقت ناشناسی کی وجہ سے گھروں کے طاقچوں اور مچانوں پر رکھی ہونگی۔

یہی تینوں کتابیں جنکا تذکرہ کیا گیا ادبیاتِ ایران کے عام مورخین سے لیکر یورپ کے مستشرقین تک جنکی اطلاعات کثرت وسائل کے باعث زائد سمجھی جاتی ہیں سب ہی کے پیش نظر ہیں، اور وہ انھیں کو تقدم زمانی کے شرف سے مشرف کرتے ہیں۔ لیکن اسی سلسلہ میں ایک چیز اور بھی سامنے آتی ہے جس پر بتصریح علامہ قزوینی "کتاب" کے لفظ کا اطلاق ہر چند کہ زیبا نہیں تاہم اسے نثر فارسی کا ایک قابل اعتنا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

" ہر چند "کتاب" نمی تواں آنرا نامید ولے در ہر صورت قطعہ معتنی بہ از نثر فارسی است "[1]

وہ کیا چیز ہے؟ وہ شاہنامۂ فردوسی کا قدیم دیباچہ ہے جو سلطان بایسنغر نبیرہ امیر تیمور کے حکم سے لکھا گیا تھا اور بعض قدیم شاہناموں کے نسخوں کے ساتھ جو پیرس، لندن، کیمبرج اور برلن میں موجود ہیں، وہ بھی ملحق ہے۔ یہ مقدمہ چونکہ بعینہٖ وہی ہے جو اُس شاہنامۂ نثری کے ساتھ منسلک تھا جسے ابو منصور محمد بن عبد الرزاق طوسی نے ۳۴۶ھ میں تالیف کیا تھا اور جسے کہا جاتا ہے کہ فردوسی نے آکر منظم کردیا لہذا اگر اُسکو سب پر سبقت زمانی کا فخر ہو تو بیجا نہیں ہے۔ بہرکیف یہ اس وقت تک کی تحقیقات ہیں اسے آخری اور قطعی فیصلہ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ مسئلہ کتابوں کا ہے اور جس طرح یہ حتمی طور پر لانحل ہے اسی طرح اسکی عقدہ کشائی بھی ازبس دشوار ہے کہ اسلام کے بعد فارسی زبان میں سب سے پہلے کون شعر کہا گیا اور کس نے کہا۔ اس باب میں بھی مختلف محققین کی مختلف تحقیقاتیں ہیں اور مختلف مورخین کی مختلف یادداشتیں، بالاتفاق حتمی فیصلہ ہو ہی نہ سکا۔ علامہ شبلی نعمانی شعر العجم جلد ا صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں کہ

---

[1] تاریخ ادبیات ایران　[2] قزوینی۔

"مامون الرشید ایک مدت تک خراسان میں رہا اور غالباً فارسی سے حرف آشنا ہو گیا تھا۔ عباس مروزی نے ایک قصیدہ فارسی میں لکھا اور مامون الرشید نے اسکے صلہ میں ہزار دینار سالانہ مقرر کر دیے۔ ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ" اسلامی عہد میں فارسی شاعری کا یہ پہلا حرف تہجی تھا"
سب سے پہلے اس تحقیق کو پیش کرنے والا صاحب تذکرہ لباب[لہ] الالباب عوفی ہے چنانچہ علامہ شبلی نے شعر العجم جلد چہارم صفحۂ ۹۲ و ۹۳ پر جہاں اس قصہ کو لکھا ہے وہاں تصریح کر دی ہے۔ مسٹر براؤن نے بھی اس واقعہ کو Literary History of Persia کے ص ۱۳ جلد ۱۔ میں عوفی یزدی ہی کے تذکرہ کے حوالہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

مجمع الفصحا نے اپنی کتاب کی جلد اول صفحہ ۶۳ میں اسکو ۱۹۳ھ کے واقعات میں سے لکھا ہے (جسے مسامحت پر محمول کیا جائے گا اس لیے کہ ہارون الرشید نے ۱۸۳ھ میں مملکت خراسان وغیرہ کو مامون کے حوالہ کیا اور خود مامون ۱۹۳ھ میں ہارون کی وفات کے بعد مرو پہنچا ہے) لیکن عوفی نے لباب الالباب میں ۱۹۳ ہجری کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ ابو العباس مروزی نے مامون کی مدح میں جب وہ مرو گیا تو ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جسکے چند اشعار یہ ہیں

اے رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین	گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین
مر خلافت را تو شایستہ چو مردم دیدہ را	دین یزداں را تو بایستہ چو رخ را ہر دو عین
کس بریں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت	مر زبان پارسی را ہست با ایں نوع بین
لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت	گیرد از مدح و ثنائے حضرت تو زیب و زین[۲ہ]

لیکن عوفی کی اس تصریح پر روایتاً و درایتاً بہت کچھ رد و قدح کی جا سکتی ہے اور اسکے قدیم ترین شعر فارسی ہونے کے خلاف مختلف حیثیات سے استدلالات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ روایتاً تو عوفی کے قول کی قدر و قیمت یوں گھٹتی ہے کہ تذکرہ لباب الالباب ۶۱۷ھ میں تالیف ہوا ہے یعنی بالفاظ دیگر یوں کہیں کہ عہد مامون الرشید کے تقریباً ۴۰۰ سال کے بعد۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ عوفی سے قبل بھی رشید الدین وطواط نے حدائق السحر لکھی، چہار مقالہ نظامی سمرقندی نے تالیف کیا، کتاب معاییر اشعار العجم شمس قیس رازی نے ترتیب دی لیکن کسی نے بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ عوفی کی باوجود بعد زمانہ کے تفرد اور ان تمام تذکرہ نویسوں کا سکوت عوفی کی نقل پر اعتماد کو یقیناً گھٹا دیتا ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ حکایت

لہ مصنف ساتویں صدی ہجری میں تھا اسنے اپنے عہد تک کے حالات لکھے ہیں اور اب پروفیسر براؤن کے تحشیہ کے بعد طبع ہو گیا ہے۔ ۲ہ اسکے صرف چار اشعار موجود ہیں۔ شعر العجم ص ۱۱۵ جلد اول۔

صحیح ہوتی تو یہ نسبتاً قریبی عہد کے تذکرہ نویس اس کا ذکر ضرور ہی کرتے۔ علاوہ اسکے یہ ایک حقیقت ہے کہ قدیم شعرائے ایران نے جو کچھ لکھا اُس میں عروض عرب کی تقلید ہرگز نہیں کی۔ انکی اپنی بحریں تھیں اور انکا اپنا عروض ہوگا۔ خلیل ابن احمد فراہیدی نے جب عروض عرب کو مدون کیا اور اہل ایران اس سے واقف ہوے اُسوقت البتہ اُنھوں نے اشعار عربی عروض کی متابعت میں لکھنا شروع کیے۔ ابتدا میں تو آنکھیں بند کرکے جو کچھ لکھا وہ اوزان عرب ہی کے تحت میں لکھا لیکن بعد چندے اُن سے نفور پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ اور اب اُنھوں نے اس میں اپنے ذوق اور طبیعت کے مطابق تصرفات کرنا شروع کردیے اور جو بحریں اُنکے انداز طبیعت کے خلاف تھیں اُنکو قطعًا ترک کردیا۔ مثلاً عرب کی طویل و مدید بحروں میں آج فارسی کا کوئی شعر بھی نہیں ملتا۔ یہ ہے کیا؟ اس میں تصرفات اور زحافات بھی اُنکی طبیعتوں کے مناسب نہ تھے۔ رہ گئیں باقی بحریں اس میں زحافات اور تغیرات پیدا کرکے اُنکو اپنے ذوق کے موافق بنا لیا۔ لہذا اگر یہ کہا جائے کہ اصل اصول توان بحروں کی عربی ہے لیکن زحافات کے بعد وہ ایران کی مخصوص بحریں قرار دے دی گئیں حتیٰ کہ ان پر عرب شعرانے شعر نہیں لکھے تو بیجا نہیں۔ مثلاً بحور رمل و ہزج اہل عرب کے یہاں تو مسدس مستعمل ہوتی ہیں لیکن ایرانیوں نے اپنے ذوق طبع کے خاطر اس کو مثمن کرلیا۔ اب اُس ابو العباس کے قصیدہ کو پڑھیے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بحر رمل مثمن مقصور[۵۱] میں کہا گیا ہے۔ اسکے معنی ظاہر میں یہ ہیں کہ پہلے تو بحر عرب یعنی مسدس کی ایران میں اشاعت ہوئی ہو جسکے لیے عادتاً عام طور پر ایک کافی مدت کی ضرورت پڑتی ہے اسکے بعد اہل ایران نے اس میں خاطر خواہ تصرف بھی کیا ہو اسکے لیے بھی کچھ کم زمانہ درکار نہیں ہوتا۔ اب اسکے ایک اور پہلو پر نظر ڈالیے کہ واقعہ ہے کہ خلیل ابن احمد واضع عروض عرب نے ۱۷۰ھ میں[۵۲] وفات پائی اور اس قصیدہ کے لکھنے اور پیش کرنے کا واقعہ ۱۹۳ھ کا ہے لہذا یہ بات بظاہر مستبعد ہے کہ صرف ۱۸ سال کی مدت میں اتنے مرحلے طے ہوگئے ہوں کہ ایران میں عروض عرب کی اشاعت کافی ہوئی ہو اور اہل ایران نے پہلے اسکی تقلید کی اسکے بعد اس میں اپنے مطبوع خاطر تغیرات کیے اور انکی مدد سے اپنی مخصوص بحریں ایجاد کرلی ہوں۔ بظاہر تو وجدان سلیم اسکو باور کرنے سے تامل ہے کہ مرو میں بیٹھ کر جو مرکز علوم عربیہ سے دور دراز واقع ہے ایک ایرانی شاعر ایسے زور شور کا قصیدہ لکھ لے۔ علاوہ اسکے عربی کلمات اور الفاظ کی بہتات جو اس قصیدہ میں پائی جاتی ہے وہ بھی واقعہ کی اصلیت کو ضعف پہونچاتی ہے۔ چنانچہ علامۂ قزوینی لکھتے ہیں:۔

[۵۱] فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات۔

[۵۲] دائرۃ المعارف الاسلامیہ ص۸۸۷ جلد ۲

"با وجود آنکہ دراں وقتہا یعنی دو بست سال قبل از فردوسی ہنوز زبان عربی ایں قدر تاراج بر زبانِ فارسی نکردہ بود و عناصر عربی در عبارات فارسی لابد نہایت اندک بودہ است خود قرینہ دیگرے است کہ ایں قصیدۂ مصنوعۂ جدید است و مدتے طویل بعد از عصر مامون ساختہ شدہ است۔"

پروفیسر براؤن نے بھی اپنی کتاب Literary History of Persia کی جلد اول صفحہ ۱۳[۱] و ۳۴۰ و ۴۵۲ میں اس واقعہ اور انتساب کی تردید کی ہے لیکن علامہ شبلی مرحوم نے شعر العجم جلد اول صفحہ ۱۱[۲] پر اس قصیدہ میں عربی الفاظ کی کثرت کو ایک امر کی تائید میں مستدل قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں[۳]

"ایران میں ابتدا ہی سے عربی نہایت شدت سے مخلوط ہوگئی تھی عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا اُسکے جو شعر آج بھی موجود ہیں جن میں نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں"۔

یہ تو بعض کی رائے تھی لیکن کچھ لوگ اس طرف بھی گئے ہیں کہ ابو حفص حکیم سغدی نے سب سے پہلے شعر کہا جسکے متعلق علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری کا شاعر تھا۔ شعر یہ ہے

آہوے کوہے در دشت چگونہ رودا یار ندارد بے یار چگونہ رودا

لیکن صاحب مائیر اشعار العجم کی تصریح[۴] کے مطابق ابو حفص تیسری صدی کا شاعر تھا۔ اگر اسپر اعتماد کرلیا جائے تو اس قول کا بھی دھن او ضعف ظاہر ہے اس لیے کہ یہی زمانہ رودکی[۵] کا بھی تھا اور یہ امر واقعہ ہے کہ رودکی سے قبل بہت سے شعرا گزرے ہیں[۶]۔ منجملہ اُنکے ایک حنظلہ بادغیسی تھا۔ جسکے دیوان کو پڑھکر حسب تصریح عروضی سمرقندی[۷] احمد بن عبد اللہ ایک معمولی حالت سے ترقی کرکے حاکم خراسان بن بیٹھا تھا۔ یہ قصہ چونکہ دلچسپ ہے اس لیے پورا لکھنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

احمد بن عبد اللہ خجستانی سے لوگوں نے دریافت کیا کہ تو تو گدھوں والا تھا خراسان کی حکومت تجھ کو کس طرح مل گئی؟ اُس نے جواب دیا کہ خجستان کے علاقہ بادغیس میں بیٹھا ہوا میں حنظلہ بادغیسی کا دیوان پڑھ رہا تھا، جب ان دو شعروں پر پہونچا

مہتری گر بکام شیر درست شو خطر کن ز کام شیر بجوے
یا بزرگی و عز و نعمت و جاہ یا چو مردانت مرگ رویا روے

But though this assertion has been accepted as a historical fact by some scholars of repute the scepticism of others appears to the writer well-justified

[۱] شعر العجم صفحہ ۱۱ جلد اول [۲] صفحہ ۵ مجمع فی معائیر اشعار العجم صفحہ ۱۸۱ [۳] ۴ نات ۳۲۹ [۴] شعر العجم صفحہ ۳۶ جلد اول [۵] ۵ صفحہ ۲۱ شعر العجم جلد اول
[۶] ۶ چہار مقالہ عروضی سمرقندی صفحہ ۳۱ طبع لاہور۔

تو میرے دل میں اپنی موجودہ حالت پر عدم اطمینان کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ گدھوں کو بیچ کر میں نے گھوڑا خریدا اور اپنے وطن سے نکل کر علی بن لیث کی خدمت میں گیا جو یعقوب بن لیث اور عمرو بن لیث کا بڑا بھائی تھا۔ دونوں چھوٹے بھائی اسکی تعظیم و تکریم میں کمی نہ کرتے تھے۔ پھر جب پہاڑی رستوں کو طے کرتا ہوا یعقوب چھوٹا بھائی خراسان سے غزنیں پہونچا تو اس نے رباط سنگیں مقام سے مجکو اپنی خراسان کی جاگیروں کا ایجنٹ مقرر کر دیا حتی کہ اس ایجنٹی کی بدولت میرے ساتھ سو سوار رہنے لگے۔ علی بن لیث کی جاگیروں میں سے ایک کا نام کروخ ہری اور دوسری کا خواف نیشاپور تھا۔ میں نے کروخ پہونچکر فرمان پیش کیا اور اس پر جو کچھ مجھے ملا وہ میں نے فوج پر تقسیم کر دیا۔ رفتہ رفتہ میری فوج تین ہزار ہو گئی۔ پھر خواف پہونچکر میں نے ایسا ہی کیا لیکن وہاں کے اکابر نے میری کوئی تعظیم و توقیر نہ کی۔ کہنے لگے کہ ہمیں صرف دس آدمیوں والا حاکم درکار ہے۔ اب میں نے صفاریوں کی اطاعت کو تو بالائے طاق رکھ دیا اور خواف کو لوٹ لیا وہاں سے ایک دہقان کو ساتھ لیکر بیہق پہونچا۔ بیہق میں میرے گرد دو ہزار سوار جمع ہو گئے۔ اب میں نے نیشاپور کا خیال کیا اور رفتہ رفتہ میری قسمت نے ایسی یاوری کی کہ سارا خراسان میرے قبضۂ اقتدار میں آ گیا۔ یہ سب کیوں؟ انھیں دو شعروں کی بدولت۔ یہ ۲۶۸ھ سے قبل کا واقعہ ہے اس لیے کہ اسی سال احمد بن عبداللہ خراسان میں قتل کیا گیا تھا واقعہ مذکورہ میں احمد بن عبداللہ اپنا خاندان صفاریہ سے تعلق ظاہر کرتا ہے اور یہ واقعہ تاریخی ہے کہ صفاریہ خاندان میں ابوحفص سغدی سے پہلے بھی شعرا گزرے ہیں۔ پھر انکے اشعار کو تقدم زمانی کیوں نہ حاصل ہو۔ حنظلہ بادغیسی[1]، محمود وراق، فیروز مشرقی یہ سب اس سے پہلے کے شاعر ہیں۔ عروضی سمرقندی[2] کی تصریح کے مطابق حنظلہ بادغیسی صاحب دیوان بھی تھا چند اشعار یہ ہیں۔

بارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند — از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند

او را سپند و مجمرہ ناید ہمی بکار — با روی ہمچو آتش و با خال چون سپند

اگرچہ اس عقدہ کشائی میں اور تذکرہ نویسوں نے بھی موشگافیاں کی ہیں لیکن وہ اس قدر بے بنیاد اور سطحی ہیں کہ ان پر توجہ بھی نہیں کی جا سکتی اور مسئلہ لاینحل ہی رہتا ہے۔ ہاں اگر اس شرط سے اغماض کر لیا جائے کہ شاعر خواہ ایرانی ہو یا عربی تو شاید مسئلہ فی الجملہ آسان ہو جائے اور مندرجہ ذیل فقرا کو جو میں ایک طول طویل قصہ کے ضمن میں علامہ قزوینی کی وسعت نظری کی بدولت کتاب الاغانی سے نقل کرتا ہوں اس مسئلہ کا فی الجملہ حاصل سمجھا جا سکتا ہے۔

---

[1] متوفی ۲۱۹ھ شعر العجم ص۲۱ [2] چہار مقالہ ص۲۷

آبست نبیذ است

عصارات زبیب است

سمیہ روسپید است

واقعہ اگرچہ طویل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دلچسپ بھی اس لیے پورا نقل کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں[1] کہ سعید بن عثمان جب خراسان کا حاکم مقرر ہوا تو اُس نے چاہا کہ ابن مفرغ شاعر کو بھی اپنے ساتھ لیجائے۔ جتنا اُس کو ساتھ لیجانے پر اصرار تھا اُتنا ہی ابن مفرغ کو انکار۔ اس لیے کہ اس نے سعید کے بجائے عباد کی مصاحبت کو زائد پسند کیا جو سیستان کا گورنر بن کر عنقریب جانے والا تھا۔ جب باوجود اصرار بلیغ شاعر راضی نہ ہوا تو سعید نے اُسکو بُلا کر کہا کہ دیکھو میری یہ بات یاد رکھنا کہ عباد ایک کمینہ آدمی ہے زائد اُس سے میل جول نہ رکھنا اس لیے کہ وہ ذرا سی بات میں ملول ہو جاتا ہے۔ اسکی توجہ اور عنایتوں پر نازاں نہ ہونا اور جن باتوں کی مجھکو برداشت ہے وہ اُن کو برداشت بھی نہیں کر سکتا۔ یہ کہکے سعید نے کچھ روپیہ پیسہ منگایا اور ابن مفرغ کو دیدیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ اسکو اپنی ضروریاتِ سفر میں صرف کرنا، اگر عباد کی صحبت تیری طبیعت کے موافق ہو تو فبہا، ورنہ بسر و چشم میرا امکان تیرے لیے حاضر ہے۔ یہ کہکے سعید تو خراسان چلا گیا لیکن ابن مفرغ نے عباد کی معیت اختیار کرلی۔ جب عبید اللہ کو جو عباد کا چھوٹا بھائی تھا معلوم ہوا تو اُس نے اس معیت کو اچھی نظروں سے نہ دیکھا۔ جب عباد چلنے لگا تو عبید اور لوگوں کے مشایعت کے لیے گیا اور رخصت ہونے وقت عبید نے اُسکو اپنے پاس بُلا کر کہا کہ اگرچہ عباد نے تیری معیت کی درخواست کو منظور کر لیا ہے لیکن مجھے کچھ پسند نہیں ہے۔ ابنے دریافت کیا کہ آخر اس ناپسندیدگی کا کیا سبب ہے۔ عبید نے سبب بیان کیا کہ چونکہ تو شاعر آدمی ہے اور شعراء عام طور پر نازک خیال ہوتے ہی ہیں اور ذرسی فروگذاشت اور بے توجہی انکے نزدیک بڑی چیز خیال کی جاتی ہے اگر انکو کسی معاملہ میں ذرا سا وہم پیدا ہو جائے تو رفتہ رفتہ وہ وہم یقین کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

پھر اہم بات یہ ہے کہ اگر کسی تقصیر پر ہزارہا معذرتیں اس کے سامنے پیش کی جائیں تو ایک کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ میرا بھائی ایک ایسے مقام پر جارہا ہے جو فتنوں اور فسادوں سے پُر ہے۔ ظاہر ہے ایسے موقعہ پر وہ ان فتنوں فسادوں کے دبانے اور کم کرنے میں اپنی توجہ منعطف کرے گا یا تیری طرف متوجہ ہوگا۔ تو بھلا اُسے معذور کیوں سمجھنے لگا۔ پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ تو ہمارے بدنام کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے گا۔ ابن مفرغ نے جواب دیا نہیں حضور ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ مجھ پر عباد کے بڑے بڑے احسانات ہیں۔ عبید نے

---

[1] کتاب الاغانی جلد ۱۷ صفحہ ۵۷-۵۵ و طبقات الشعرا صفحہ ۲۱۱ لابن قتیبہ۔

اس کی باتوں کو اوپری اوپری سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی اور اسکی گفتگو حلق سے نیچے نہ اُتری۔ لیکن جب شاعر کا اصرار حد سے گزر گیا تو اُس نے کہا بہتر ہے جا لیکن اس شرط پر کہ اگر میرے بھائی کی طرف سے کسی معاملہ میں کوئی کوتاہی یا تاخیر ہوئی تو اس کا اثر نہ لیگا اور مجھے لکھکر مطلع کر دیگا۔ اُس نے اقرار کیا۔ عبید نے کہا۔ اچھا جا اللہ مبارک کرے۔ عباد منزلیں طے کرتا ہوا خراسان پہونچا اور اپنی مہم میں ہمہ تن مصروف ہو گیا بھلا کیا موقعہ تھا کہ اس رفیق سے پوچھ گچھ کرتا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کی پیش بینی عبید نے کی تھی حتیٰ کہ اُسنے عبید کو شرط کے مطابق اطلاع بھی نہ دی۔ موقعہ موقعہ توہین آمیز فقرے کستا اور ہجو میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ عباد کہیں جا رہا تھا یہ بھی ساتھ ہو لیا۔ عباد کی داڑھی کچھ غیر معمولی طور پر بڑی اور لمبی ہونے کی وجہ سے جب ہوا اُس میں بھرتی یا جھونکے لگتے تو تھیلے کی طرح ہلنے لگتی تھی۔ اس موقع پر ہوا تیز چل رہی تھی داڑھی جھونکے کھانے لگی۔ شاعر دیکھ کر صبر نہ کر سکا ہنس ہی دیا۔ ایک اور شخص نجمی اسکے ساتھ تھا اُس سے کہنے لگا

اگر داڑھیاں گھاس چارہ ہوتیں تو ہم مسلمانوں کے گھوڑوں کو کھلا دیتے۔	الا لیت اللحی کانت حشیشا فنعلفہا خیول المسلمینا

نجمی نے بات عباد تک پہونچا دی۔ سنتے ہی تلملا اٹھا۔ مگر حیران تھا۔ سزا دے تو حق صحبت کی وجہ سے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ یوں ہی چھوڑ دے تو دل نہیں مانتا۔ اتفاقاً اُسکو بھی پتہ چل گیا کہ ساتھی نے ایک مذاق کی بات امیر تک پہونچا دی ہے۔ دل میں کہنے لگا کہ اب تو عباد کے ہاتھوں زندگی کا خاتمہ ہونا مقدر معلوم ہوتا ہے۔ عباد کے پاس پہونچا اور عرض کیا کہ حضور آپ کو معلوم ہے کہ سعید میری کتنی عزت کرتا تھا اور میرے ساتھ کیسی آؤ بھگت سے پیش آیا کیا۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے پھر بھی میں نے اُس کو چھوڑ کر آپ کی خدمت میں رہنا پسند کیا۔ لیکن مجھے اس حضوری سے چنداں فائدہ میسر نہ ہوا۔ حضور اجازت مرحمت فرمائیں کہ میں اپنے وطن واپس جاؤں۔ امیر نے جواب دیا کہ تو نے یہ بات بھی خوب کہی۔ تو ہی نے تو مجھ سے میرے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور تو ہی نے میری رفاقت کی درخواست کی۔ میں نے بھی کچھ مضائقہ نہ سمجھا۔ مجھے اس کا وقت ہی کب ملا کہ میں تیرے ساتھ کچھ کر سکتا۔ اب تو مجھے واپسی کی اجازت مانگتا ہے۔ میں تیری نیت سے خوب واقف ہوں۔ تو اپنے قبیلہ میں مجھے رسوا اور بدنام کریگا۔ اچھا ذرا ٹھہر کہ میں تیرے حقوق تو ادا کر دوں۔

عباد کو خفیہ طور پر یہ بھی پتہ لگ گیا تھا کہ ابن مفرغ اُسکو برا بھلا کہتا پھرتا اور ماں باپ کی گالیاں بھی دیا کرتا ہے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ عباد گھوڑے پر سوار ہو کر چلا۔ جب وہ سرپٹ دوڑنے لگا اور

بقیہ سواروں سے آگے بڑھ گیا تو اُس نے ایک اور فقرہ چُست کیا

سبق عباد و صلت لحیتہ	عباد آگے نکل گیا اور اُس کی داڑھی (ہار کے) پیچھے رہ گئی۔

عباد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ پہلے تو اُس نے یہ کیا کہ ابن مفرغ کے قرضخواہوں کو بھڑکا دیا، اور جب اُن کی طرف سے یورش ہوئی اور یہ ادائے قرض سے عاجز رہا تو قید خانہ میں بند کر دیا اور درا دھاڑ کی گئی۔ یہی نہیں بلکہ اُس کی ایک پروردہ باندی اراکہ اور غلام برد نامی کو اس پاداش میں بیچ ڈالنے کی اُسکو اطلاع دی گئی اُس نے یہ سُن کر کہلا بھیجا کہ مجھے یہ دونوں جان سے زیادہ عزیز ہیں اور اولاد سے بڑھ کر محبوب، بھلا کوئی اپنی جان اور اولاد کو بیچا کرتا ہے۔ لیکن عباد نے ایک نہ سُنی اور اُنکو بیچ ہی ڈالا۔ خراسان کے ایک شخص نے خریداری کی۔ جب دونوں کو لیکر گھر پہونچا تو برد غلام نے جو بڑا چالاک اور زیرک تھا کہا تم کو کچھ خبر ہے کہ تم نے کیا خریدا ہے؟ خریدار نے جواب دیا ہاں یہی معلوم ہے کہ میں نے تجھے خریدا ہے اور اس باندی کو۔ غلام نے جواب دیا بخدا ایسی بات نہیں ہے، تونے آبرو ریزی، رسوائی اور فضیحت کا ایسا پلندہ خریدا ہے جو تیری زندگی کے ختم تک تجھ سے الگ نہیں ہو سکتا۔ یہ سُن کر خریدار گھبرا اُٹھا اور کہنے لگا یہ کیوں؟ غلام نے جواب دیا کہ ہم ابن مفرغ کی ملکیت میں تھے۔ اُس کی زبان اور فتنہ انگیزیوں کی بھگتان ہمیں بھگتنی پڑی ہے۔ اُس نے عباد امیر خراسان اور عبید عامل عراق اور اُس کے چچا کی ہجو کی تھی۔ تم نے مجھکو اور اس باندی کو نہیں خریدا، بلکہ اُس مضغۂ گوشت کو خریدا جو اُسکے پہلو میں رکھا تھا، بخدا اُس سے بڑھ کر بدبخت کوئی گھر نہ ہوگا جس میں یہ سودا خرید کر لایا جائے۔ خریدار نے کہا اچھا جاؤ تم اُسی کی ملکیت ہو اگر جانا چاہو تو اُسی کے پاس چلے جاؤ، اگرچہ اس خیال سے میرے جسم میں کپکپی پیدا ہوتی ہے کہ عباد یا عبید کو اس کی خبر ہو جائے تو میں تباہ ہو جاؤں گا، اور اگر تم چاہو تو چندے میرے پاس ہی رہو۔ غلام نے جواب دیا کہ اچھا آپ ایک خط اس مضمون کا ہمارے مالک کو لکھ دیجیے۔ خریدار نے خط لکھ دیا۔ جب ابن مفرغ کو خط ملا تو اُس نے شکریہ کے ساتھ رسید بھیجدی اور لکھ دیا کہ تم اپنے پاس ہی ان دونوں کو رہنے دو تا آنکہ میرے بھلے دن آئیں۔ ایک روز عباد نے اپنے دربان سے کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن مفرغ قید خانہ میں چنداں بےچین نہیں ہے۔ حکم دیا کہ اس کا گھوڑا، سازوسامان اور اثاث البیت نیلام پر چڑھا دیے جائیں اور جو قیمت آئے اُس کو قرضخواہوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن اس پر بھی عباد نے اُس کو قید خانہ سے رہائی نہ دی۔ ابن مفرغ نے اپنے غلام اور باندی کی یاد میں ایک غم آلود نظم لکھی جس کا پہلا شعر یہ ہے

شریت برداً ولو ملکت صفقتہ	تونے برد غلام کو خرید تو لیا لیکن اگر اسے اپنی ملکیت میں
لما تطلبت فی بیع لہ رشدا	رکھتا تو تجھے فلاح نصیب نہ ہوتی۔

ہ بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ جب ابن مفرغ کو قید خانہ میں احساس ہوا کہ اگر وہ اسی طرح عباد کی ہجو کرتا رہا اور
مت کرنا نہ چھوڑا تو خدا معلوم اور کیا کیا مصیبتیں نہ نازل ہوں، لہذا اس نے اپنا رویہ اب یوں بدل دیا کہ اگر
ئی اُس سے پوچھتا کہ تو قید خانہ میں کیوں ہے، تو یہ جواب میں کہتا کہ امیر نے میری اصلاح احوال کے لیے مجھے
ید خانہ میں رکھ دیا ہے۔ شدہ شدہ یہ خبر عباد کو پہونچی کہ اس نے اب یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے تو اُس کا غصہ
ی دھیما پڑ گیا اور سمجھا کہ اب وہ اپنی سزا کو پہونچ چکا لہذا رہائی کا فرمان جاری کر دیا۔ یہ چھوٹ کر بصرہ آیا،
ہر شام پہونچا۔ غرضکہ جہاں جہاں جاتا عباد اور اسکے باپ کی ہجو نہ چھوڑتا۔ حتی کہ بصرہ میں تو یہ نوبت پہونچگئی
ی کہ عباد کی ہجو لوگوں کے زبان زد تھی، لوگ ہجو یہ اشعار گا گا کے پڑھتے تھے۔ عباد کے بھائی عبید کو خبر پہونچی
۔ اس کی گرفتاری کی فکر میں لگ گیا، اگر چھوپ کر شام نہ چل دیتا تو وہیں پکڑ جانے میں کوئی کسر نہ تھی۔
ام کے دیہاتوں اور جنگلوں میں چھپا چھپا پھرتا، لیکن جہاں کہیں موقع ملتا آل زیاد کی اہانت سے باز نہ رہتا، آلِ
سب پر چوٹیں کرتا اور زیاد کی ماں سمیہ کو فحشیں سناتا تھا۔ آخر کار حکومت کو سراغ لگ گیا کہ وہ شام کے اطراف
ں ہے۔ کہیں گرفتار نہ ہو جائے اس لیے بھاگ کر پھر بصرہ آیا اور اشعث بن قیس سے پناہ کا طالب ہوا۔ اشعث
نے صاف انکار کر دیا کہ حکومت کے مقابلہ میں میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا، تو حکومت کا مجرم ہے، اگر تو پسند کرے
تجھے بنی سعد کے حوالہ کر دوں وہاں تو بے کھٹکے رہے گا۔ ابن مفرغ نے جواب دیا اسے حضور اگر بنی سعد یہ کہہ دیں
ہم کیوں ایسے شخص کو پناہ دیں تو کیا ہوگا۔ پھر خالد بن عبداللہ کے پاس پہونچا وہاں سے بھی صاف جواب ملا
پھر عمر بن عبید اور طلحہ کے پاس آیا، دونوں نے وعدہ تو کر لیا لیکن وعدہ پورا نہ کر سکے۔ غرضکہ ایک شخص منذر
نے اس کو پناہ دیدی۔ اتفاق دیکھیے کہ بحریہ بنت منذر، عبیداللہ کے نکاح میں تھی اور اُس کے باپ کی عبید کے
یہاں بڑی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ عبید کو خبر لگ گئی کہ ابن مفرغ بصرہ میں فلاں جگہ پناہ گزیں ہے۔ منذر کی عبید
کے یہاں سے طلبی آئی تو وہ اُدھر گیا۔ اِدھر عبید کے سپاہی منذر کے گھر پہونچ گئے اور ابن مفرغ کو گرفتار کر لیا
اسکو لیکر عبید کے پاس پہونچے۔ منذر نے دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ دست بستہ عبید سے عرض کرنے لگا کہ حضور
میں نے اس کو پناہ دی ہے، آپ اس کو ہاتھ نہ لگائیں۔ عبید نے کہا درست ہے، آپ کی اور آپ کے
باپ دادا کی شان میں تو اس نے قصیدے کہے، لیکن ہمارے اجداد کو اس نے کیا کچھ بُرا بھلا نہیں کہا ہے۔ میں
بخدا اس سے درگزر نہ کرونگا۔ اگر آپ کو یہ خیال ہے کہ آپ کی دختر میرے نکاح میں ہے تو میں اس کے مقابلہ
میں اُسکو طلاق دینے کے لیے طیار رہوں۔ منذر چپ ہو رہا۔ مجبور تھا۔ عبید ابن مفرغ کی طرف متوجہ ہوکر
کہنے لگا کمبخت تو نے عباد کی خوب رفاقت کی۔ ابن مفرغ نے جواب دیا کہ حضور نے یہ بھی خیال کیا کہ اُس کے
برتاؤ میرے ساتھ کیسے رہے۔ میں سعید کو چھوڑ کر اُسکے ساتھ ہوا اور جو کچھ میری کمائی تھی وہ سب میں نے اُس پر

قربان کردی، میرے ساتھ عباد نے کیا کچھ نہیں کیا۔ قید میں رکھا، گالیاں سنائیں، مارا پیٹا۔ میں محض اس لیے اُس کے پاس سے چلا آیا کہ کہیں اُس کا طرز عمل اُس کی رسوائی کا سبب نہ بنجائے۔ اب میں آپ کے قبضۂ اقتدار میں ہوں آپ حاکم ہیں، جو چاہیں کریں۔ عبید نے ادھر تو اُس کو قید کرنے کا حکم دیا اُدھر یزید بن معاویہؓ حاکم اعلیٰ کو اس کے قتل کردینے کی اجازت کے لیے لکھا۔ یزید نے جواب میں لکھا کہ اس کا ارادہ بھی نہ کرنا، یوں جتنی بھی سزا چاہو دیدو۔ یہ کیوں؟ یہ اسلیے کہ اسکے خاندان کے لوگ میری فوج کے سپاہی اور میرے معتمد علیہ ہیں۔ ہرگز ہرگز اسکو قتل نہ کرنا، ہرطرح پر اسکی تذلیل کرلو۔ جب عبید نے حاکم اعلیٰ کا عندیہ پایا تو قتل سے باز رہا لیکن اور سزائیں دینے میں کچھ کسر نہ رکھی۔ پہلے تو بالکرا اُسکو نبیذ، جس میں ایک گانٹھوں دار گھاس سرخ رنگ کی ملادی گئی، پلائی۔ نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ ابن مفرغ کو دستوں کا سلسلہ جاری ہوگیا، پھر حکم دیا کہ اسی حالت میں اس کو شہر میں گشت کرایا جائے۔ اسکے ساتھ یہ بھی کیا کہ ایک بلی اور سور کو بھی ساتھ ساتھ کردیا۔ ابن مفرغ چیختا چلاتا اور دستوں کی وجہ سے بیتاب تھا۔ لڑکے پیچھے سے شور و غل مچاتے اور اُس سے پوچھتے تھے این چیست؟ ابن مفرغ جواب دیتا

آبست نبیذ است

عصارات زبیب است

سمیہ روسے سپید است

غرضیکہ بصرہ کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں پھرایا گیا، تھک کے چور ہوگیا، دستوں کا سلسلہ جاری تھا ہی، ایک جگہ گر پڑا، اور ایسا گرا کہ اُٹھنے نہ پایا۔ عبید کو اطلاع دی گئی، اُس نے کہا کہ وہ کمبخت کیا مرے گا۔ بہرحال اب نہلا دُھلا دو۔ سزا کو پہونچ گیا۔ جب نہا دھو کر فارغ ہوا تو فی البدیہہ کہنے لگا

یغسل الماء انعلت وقولی | جو کچھ تو نے کیا اُسے تو پانی نے دھودیا لیکن بات
راسخ منک فی النظام البوالی | پُرانی ہڈیوں میں پیوست ہوکر رہ گئی ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ پھر قید میں ڈال دیا گیا۔ اور رہائی اُس کو اُسوقت ہوئی جب یمن کے سرداران لشکر میں اسکے خلاف جوش و خروش پیدا ہوا اور اُنھوں نے یزید سے اسکی رہائی کے متعلق تہدید آمیز درخواست کی۔

یہ قصہ عہد خلافت یزید بن معاویہؓ کا ہے، اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو ان ابیات پر قدیم ترین ہونے کا دعوے کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ یزید کی خلافت ۶۰ھ سے لیکر ۶۴ھ تک ہوئی ہے لیکن پھر بھی اشکال یہ ہے کہ ابن مفرغ جسکی زبان سے یہ فقرات ادا ہوے ہیں وہ عربی النسل تھا، اگرچہ اُسنے خراسان وغیرہ میں رہ کر معلوم ہوتا ہے کہ فارسی سیکھ لی تھی۔

[1] نام قیدہ عباد و عبید۔

اس سلسلہ میں چند فقرات اور بھی ہیں جو اسکے مقابلہ میں اگرچہ متاخر ہیں نیز اُن پر صحیح طور پر متعارف فارسی شعر کی تعریف بھی صادق نہیں آتی لیکن انکو اشعار عامیانہ یا بالفاظ دیگر "تصنیفوں" میں محسوب کر سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ۱۰۸ھ میں جب ابومنذر اسد بن عبداللہ قسری نے ختلان میں لشکرکشی کر کے خاقان ترک سے جنگ کی اور شکست کھائی تو پریشان ہو کر بلخ بھاگ گیا - اہل خراسان نے اسکی ناکامی اور ہزیمت دیکھ کر یہ شعر کہا:

از ختلان آمذی برو تباہ آمذی
بیدل فراز آمذی

یہ فقرے زبان زد خلائق ہو گئے تھے حتی کہ لڑکے گلی کوچوں میں پڑھتے پھرتے تھے۔ طبری نے تاریخ کبیر میں اس قصہ کو یوں لکھا ہے۔

ثم دخلت سنة ثمان ومائة ... وفیہا غزا اسد بن عبداللہ الختل فذکر عن علی بن محمد ان خاقان اتی اسداً ولم یکن بینہم قتال فی تلک الغزاة وذکر عن ابی عبیدة انہ قال بل ہزموا اسداً وفضحوہ فتغنی علیہ الصبیان -	جب ۱۰۸ھ ہوا تو اسد نے ختل میں لشکرکشی کی، علی بن محمد سے بیان کیا گیا ہے کہ خاقان اسد کے پاس آیا لیکن ان میں لڑائی نہیں ہوئی۔ اور ابو عبیدہ نے بیان کیا کہ لشکر خاقان نے اسد کو شکست دی اور رسوا کر کے بھگا دیا تو لڑکوں نے گا گا کے پڑھنا شروع کیا

دوسرے موقع پر اسی طبری نے یوں بھی لکھا ہے

وسار اسد بالناس حتی نزل مع الثقل وصبحوا اسلامن الغد وذلک یوم الفطر فکادوا یمنعونہم من الصلوٰة ثم انصرفوا ومضی اسد الی بلخ ... ففی ہذہ الغزاة قیل لہ بالفارسیة	اسد لشکر لیکر ثقل میں آیا دوسرے روز خاقان کا لشکر پہونچ گیا اس روز عید تھی نماز بھی نہ پڑھ سکے، جب لشکر لوٹ گیا تو اسد بلخ چلا گیا اس لڑائی میں جب شکست ہوئی تو فارسی میں اسکے متعلق یہ کہا گیا

از ختلان آمدیہ برو تباہ آمدیہ
آبار باز آمدیہ خشک نزار آمدیہ

ہر حال یہ بھی ایک فارسی شعر کے نمونے بن سکتے ہیں، اگرچہ وزن اور بحر کی موجودگی اس میں محض اتفاقیہ ہے، اسلیے کہ واضع عروض عرب یعنی خلیل ۱۷۰ھ میں پیدا ہوا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ عروض عرب ایران میں پہونچ ہی کیسے سکتے، واضع بھی نہ ہوئے تھے۔

کتاب الاغانی نیز دیگر کتب تواریخ میں اور بھی کچھ ضمنی طور پر فقرات ملتے ہیں، لیکن چنداں قابل اعتنا نہیں ہیں، اس لیے ترک کرتا ہوں۔

This class of verse ephemeral as our own topical and comic songs

لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ جلد ۲ ص ۲۲۱

اوستیا

تاریخ روما کا ایک گم شدہ ورق

(از مولانا رئیس احمد جعفری ندوی، ایڈیٹر روزنامہ خلافت بمبئی)

چند مہینے گزرے، حکومت اطالیہ (اٹلی) کی سرپرستی میں روما اور سرحد "اوستیا" کے درمیان موٹروں، لاریوں، اور باربرداری کی سواریوں کے لیے، توسیع شوارع کے سلسلہ میں جدید سڑکوں کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ یہ تاریخی سرحد، جو اپنے خصائص، اور پچھلی تاریخ کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، قیاصرہ کے پایۂ تخت سے ۲۸ کیلو میٹر دور ہے۔ اور راستوں کی تعمیر و توسیع کا یہ وہ پروگرام ہے، جو ایک عرصہ سے حکومت اطالیہ کے زیر غور ہے۔ اس پروگرام کا مقصد، ایک طرف تو تمدنی اور اقتصادی ضروریات کو پورا کرنا اور دوسری جانب، بیکاروں کے لیے کام مہیا کر کے انکے بڑھتے ہوئے خطرہ سے نجات حاصل کرنا تھا۔ کئی برس تک بعض موانع ایسے پیش آتے رہے، کہ اس سلسلہ میں کوئی اقدام نہ کیا جا سکا لیکن کچھ عرصہ ہوا، کام شروع کر دیا گیا، اور وہ اتنا نتیجہ خیز نکلا کہ اس نے گویا آثار قدیمہ کی دنیا میں، ایک ایسی نئی چیز پیش کر دی، جو علماء فن کی غور و فکر، بحث و گفتگو اور تحقیق و تفتیش کا ایک مستقل موضوع ہے۔

خیر، تو کام شروع ہوا، اور کوئی ایسی چیز رونما نہیں ہوئی، جو لوگوں کے لیے جاذب توجہ ثابت ہوتی۔ ایک روز اتفاقاً بعض انجینیروں نے کام کے دوران میں اس تاریخی سرحد کے پاس، کھدائی کے وقت کچھ قدیم وضع کی دیواریں دیکھیں، سنگ مرمر کے، خاص وضع و تراش کے متعدد ٹکڑے بکھرے ہوئے پائے، اور کچھ ایسے آثار پائے، جنھوں نے انکے سمند جستجو پر تازیانہ کا کام کیا، انھوں نے اس کی طرف خاص خاص لوگوں کی توجہ مبذول کرائی، علماء آثار کو دعوت دی، اور اس طرح دنیائے "اثریات" میں ایک قسم کی جنبش پیدا ہو گئی۔

پروفیسر جوڈو، فن حفائر (کھدائی کا کام) اور تاریخ قدیم میں غیر معمولی فضیلت و بصیرت رکھتے ہیں، انکے معلومات کی وسعت، تجربات کی فراوانی، اور ذوق جستجو کا ہر شخص کو اعتراف ہے۔ موصوف کو زحمت دی گئی کہ وہ اس نئے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور ان دیواروں اور پتھروں کی زبان خاموش سے نتائج نکال کر، دنیا کے ناواقفوں کو حقائق سے بہرہ ور کریں۔ موصوف نے یہ درخواست

قبول فرمائی اور پوری تندہی و جانفشانی سے اس کام میں مصروف ہوگئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے تاریخ قدیم کا ایک گم شدہ صفحہ دنیا کے سامنے پیش کردیا، جو اپنی قدامت اور ندرت میں مستقل دعوت عبرت ہے۔
مسٹر جو یڈو نے اپنے نظریات و خیالات، اور مشاہدات و تاثرات، اطالیہ کے ایک مشہور اخبار میں شایع کرا دیے ہیں۔ یوں تو پورا مضمون، تاریخ قدیم کے حقایق و واقعات سے پر ہے اور اپنی جاذبیت و دلچسپی کے اعتبار سے اس کا مستحق ہے کہ نذر ناظرین کیا جائے، لیکن ہم آج کی مجلس میں اس کے خاص خاص حصے، پیش کرتے ہیں۔ یہ خلاصہ، گویا مضمون کا نچوڑ ہے، کوئی قابل ذکر بات نظر انداز نہیں ہونے پائی۔ مسٹر جو یڈو کی تحقیق نے عالم اثری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ وہ علماء اثریات کے غور و فکر کا مستحق ہے۔ اس نئے باب نے روما کی گزشتہ تاریخ کے چند ایسے اوراق ہمارے پیش نظر کردیے ہیں جو مرور ایام سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اور جنکا انکشاف یقیناً ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔

کھدائی کے بعد، مسٹر جو یڈو نے، جو آثار دریافت کیے ہیں، ان میں وہ تین دستاویزات خاص اہمیت رکھتی ہیں جنھوں نے روما کی تاریخ قدیم کے بعض گوشے بے نقاب کردیے ہیں۔ شہر اوستیا، قیاصرہ کے زمانہ میں ہمیشہ مرکز تمدن اور مرکز تجارت کی حیثیت سے معروف رہا، اس کی اہمیت و عظمت سے اس زمانہ کے لوگ بہت متاثر تھے۔ مسٹر جو یڈو نے جو دستاویزیں یافت کی ہیں وہ تین الواح کا مجموعہ ہیں۔ اور ان الواح میں، ہر ہر لوح بجائے خود، مختلف قطعات سے عبارت ہے۔ پتھر کے یہ ٹکڑے دست برد زمانہ سے اپنے ان نقوش کو مدھم کرچکے ہیں، جو تاریخ کے لیے زبان گویا کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن انسان کی طبع، جستجو پسند، کسی چیز کو جب پالے، تو کچھ نہ کچھ نتیجہ نکال ہی لیتی ہے، یہی حال ان ٹکڑوں کا بھی ہوا۔ ابتداءً یہ پتھر کے ٹکڑے اس درجہ اپنے آب و رنگ سے محروم ہو چکے تھے کہ انھیں پڑھنا۔ انکی عبارت ملانا، اور اس سے کوئی نتیجہ نکالنا گویا ناممکن سا تھا۔ لیکن مسٹر جو یڈو نے اس کار دشوار کو بھی بحسن و خوبی انجام دیا۔ ان ٹکڑوں کو جمع کیا، انھیں ایک خاص ترتیب سے رکھا، اور اس طرح انکے مٹے ہوے نقوش بھی، ایک حد تک، روشن ہوگئے۔

چنانچہ مسٹر جو یڈو کی کاوش و محنت کے سبب یہ رموز، اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوگئے، اور ان سے روما کی عظمت ماضی کے بعض گوشے نمایاں ہوگئے، اور بعض ایسے واقعات معلوم ہوے جو تاریخ روما کے حلقہ گم گشتہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور انکی اہمیت علماء آثار و حفریات کے نزدیک مستقل تاریخ سے کم نہیں۔ ان الواح پر جو عبارت کندہ ہے، تاریخی حیثیت سے وہ بجائے خود ایک خاص اضافہ ہے۔ علاوہ ازیں اس سے

اُس زمانے کے تمدن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ان اثری دستاویزات سے اوستیا کی قدامت کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر جویڈو نے اس انکشاف کے بعد، جو لوح سنگی پائی تھی اور جس میں قیصر ترایانو کے عہد کے بعض واقعات منقوش تھے وہ صحیح ہیں، اس لیے کہ ان الواحِ ثلثہ سے بھی انکی تائید ہوتی ہے۔ اس لوح سے جو واقعات معلوم ہوئے ہیں وہ سنہ ۱۰۹ء اور سنہ ۱۱۳ء پر مشتمل ہیں۔ ترایانو کا عہد حکومت روما کے تمام قیاصرہ کی تاریخ میں ہر اعتبار سے برتر اور بہتر ہے۔ معلوم ہوتا ہے ترایانو ایک خاص دل و دماغ کا قیصر تھا، جسنے اپنے زمانہ میں ایسے کارنامے انجام دیے جو ابتک محفوظ ہیں، اور نام نیک کے ساتھ محفوظ ہیں۔

اب ہم پھر اپنے اصل موضوع پر آتے ہیں، مسٹر جویڈو کو جو تین الواح دستیاب ہوئی ہیں، اُن میں سے ہر لوح، ۲۲ سطروں پر مشتمل ہے۔ لاتینی زبان استعمال کی گئی ہے پہلی لوح میں سنہ ۱۱۶ء کے حوادث مندرج ہیں، دوسری لوح پر سنہ ۱۴۵ء و سنہ ۱۴۶ء کے واقعات منقوش ہیں۔ اور تیسری لوح پر سنہ ۱۵۱ء و سنہ ۱۵۲ء و سنہ ۱۵۳ء کے حالات ثبت ہیں۔ ان سے اکثر قیاصرہ کے حالات ملتے ہیں۔ لیکن درمیانی گیارہ کڑیاں ناپید ہیں، جو ان الواح کے بعد بھی، گوشۂ تاریکی میں ہیں، اور جنکے متعلق کوئی صحیح رائے اب بھی نہیں قائم کی جا سکتی۔ بہرحال جو حالات معلوم ہو سکے ہیں، اپنی اہمیت کے اعتبار سے وہ بھی ایک خاص منزلت رکھتے ہیں۔

تیسری لوح اپنی وضع و شکل کے اعتبار سے، ان الواح سے مشابہ ہے جو بلدیۂ روما میں اس وقت موجود ہیں۔ ان الواح سے پرانے زمانہ میں یہ کام لیا جاتا تھا کہ کسی امر اہم سے متعلق قیصر کو جب کوئی فرمان شائع کرنا ہوتا، یا کسی حکم کی تبلیغ و تشہیر کی ضرورت محسوس ہوتی تو، سنگی تختیوں پر، فرمان کے الفاظ کندہ کرائے جاتے، اور اُس لوح کو معابد کی دیواروں پر، یا عام گزرگاہوں پر، یا اُن بڑے بڑے میدانوں میں، جہاں کسی پبلک تفریح کے سلسلے میں عام آمد و رفت رہتی ہو، لٹکا دیا جاتا تھا۔ تاکہ ساری قوم اسکے مفہوم و مقصد سے پوری طور پر واقف ہو جائے، اور اُسکے الفاظ کے نفاذ و اجراء سے پیشتر، قوم کے تمام طبقات تک اس کا مفہوم پہونچ جائے۔ یہ دستور عام طور پر، روما میں اور اوستیا میں شایع و ذائع تھا۔ اسی طرح، خاص خاص واقعات بھی اپنی اہمیت و عظمت کے باعث، سنگی تختیوں پر کندہ کرا کے برسرعام لٹکا دیے جاتے تھے، تاکہ لوگوں کے دلوں میں انکی یاد تازہ رہے، اور وہ ہمیشہ قوم کے دلوں میں محفوظ رہیں۔ اس سے مقصد یہ تھا، کہ ایسے کارنامے پڑھ کر قوم کے افراد میں، حمایت و شجاعت کے جذبات تازہ ہوں اور اُن میں عزم و تہور کی روح بیدار ہو، نیز شجاعت و بسالت، عظمت و جبروت، قیاصرہ کا دبدبہ، اور افواج کا طنطنہ آنکھوں کے سامنے رہے۔ اور اس طرح ہر فرد قوم ایک خاص جذبے سے سرشار نظر آئے۔

ان الواح پر جو ابھی حال میں دستیاب ہوئی ہیں، ایسے حوادث مرقوم ہیں، جو قیصر کی قوت و طاقت، اُسکے فرامین و احکام، اور اُسکے اوامر و نواہی سے، اور ایسے واقعات سے جو حیات قومی میں ایک روح تازہ پیدا کردیں، برتر ہیں۔ بعض ایسے واقعات بھی ہیں جو شہنشاہ ان روما کی فتحمندیوں اور جنگ آزمائیوں کے آئینہ دار ہیں۔ بالکل اس طرح، جیسے آج کل ہمارے زمانہ میں، حکومتیں اپنے اس قسم کے واقعات گزٹ کے ذریعے اور کمیونکے کی صورت میں شایع کیا کرتی ہیں۔

ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ اکتشاف جدید کس درجہ قیمتی ہے، اور یہ معلومات جنہوں نے روما کی تاریخ قدیم میں، کئی اہم ابواب کا اضافہ کردیا، کس قدر کارآمد اور نافع ہیں؟ اب ہم ان الواح کے متعلق الگ الگ مواد پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ خلط مبحث نہ ہو۔

(۱) شہنشاہ تریانو کی فتحیابیاں

پہلی لوح میں صرف ۱۳ سطریں ایسی ہیں، جو پڑھی جا سکیں، باقی، قدامت و کہنگی کے سبب اور عرصے تک زیر زمین مدفون رہنے کے باعث، اس قدر زیادہ مٹ گئیں کہ پڑھی نہ جا سکیں۔ بعض ٹکڑے لوح شکستہ بھی ہے، اس لیے الفاظ کے پڑھنے اور نتیجہ نکالنے میں اور دقت ہوئی۔ اور افسوس یہ کہ گم شدہ ٹکڑے دستیاب بھی نہیں ہوسکے، حالانکہ پروفیسر جو یڈو نے بڑی کوشش کی۔ اس لوح پر چھ قناصل کے اسماء کندہ ہیں، جن میں سے چار تو اچھی طرح پڑھے جاتے ہیں، اور یہ وہ قناصل ہیں جنھیں ۱۱۶ء میں جب شہنشاہ تریانو عراق کی سرزمین کو اپنے قشون قاہرہ سے پامال کر رہا تھا، اُس نے عیسائیوں کے سنیٹس کے پاس ایک وفد کی صورت میں روانہ کیا تھا تاکہ انھیں شہنشاہ کی فتحمندیوں اور ظفریابیوں کے واقعات بتائے اور سند خوشنودی حاصل کرے۔ ذیل میں ہم اس لاطینی عبارت کا متن درج کرتے ہیں، جو اس لوح پر کندہ ہے، اور جس میں، حوادث کی تفصیل بیان کی گئی ہے:-

"Decimo Kal. Mart. Laureate misse ad senatum ad Imperatore Traino Augusto ob (quam causam Parthicus appelatus est et pro Salute eius Senatus facto et supplicationes (inominia delubra) et ludi facti acto.. etc......

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ تریانو نے، عیسائیوں کی مجلس الشیوخ (سنیٹس) کے پاس ایک وفد روانہ کیا، جو اسکے قناصل پر مشتمل تھا، ۱۱۶ء کے ماہ مارچ میں، ۲۳ تاریخ کو یہ وفد روانہ ہوا۔ وفد کے جانے کا مقصد یہ تھا کہ شیوخ کے سامنے سرکاری طور پر اُن فتحمندیوں کی تفصیل پیش کرے، جو شہنشاہ تریانو

نے، دریائے دجلہ کے کنارے اور حکومتِ نابتیہ پر للبار ر حملہ کے بعد حاصل کی تھیں۔ شہنشاہ نے مجلس شیوخ اور کاہنوں کی جماعت کو حکم دیا تھا کہ وہ اس نمایاں اور غیر معمولی کامیابی کی خوشی میں صلوٰۃ شکر ادا کریں اور عید مہرجان منائیں، اور اس فتح کی مسرت بے پایاں کا مظاہرہ قلبی اس طرح کریں کہ مسلسل آٹھ روز تک جشن انبساط برپا رہے، اس لیے کہ شہنشاہ کے نزدیک یہ نمایاں اور یادگار فتح ایسے ہی جوش مسرت کی طالب ہے اور اس کا اظہار شیوخ اور کاہنوں کی طرف سے ضرور ہونا چاہیے۔

لوح کی آخری سطروں کے الفاظ اتنے مٹے ہوئے ہیں کہ انکا پڑھنا ناممکن ہے، الکین مسٹر جوٹیڈ دینے اپنی مہارتِ فن کی بدولت انھیں بھی پڑھنے کی کوشش کی، اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ مسٹر جوبیڈو کی تحقیق کے مطابق، ان آخری سطروں میں، اظہار مسرت کے طور پر عید مہرجان منانے کا حکم دیا ہے، اور اس عید کے لیے شرط رکھی ہے کہ رات کو منائی جائے، تاکہ سب لوگ اس سے محفوظ ہوسکیں، اور شہنشاہ تریانو کی عظمت وہیبت کے قائل ہوں، اور اسکے لیے یہ مظاہرہ لیبا ضروری ہے!

(۲) حاکم اسپین کا قضیہ

اُس زمانہ میں، اسپین، مملکت روما کا ایک محکوم حصہ تھا، اسکے والی کا نام کونیلیو برنشیانو تھا۔ اس نے مرکز سے سرکشی کی، اور ایسے افعال کا ارتکاب کیا جو اس کی باغیانہ سرشت کو ظاہر کرتے تھے، چنانچہ اس کا معاملہ، مجلس الشیوخ کے سامنے پیش کیا گیا، اس قضیہ کی تفصیل دوسری لوح پر ثبت ہے۔
اس دوسری لوح میں سولہ سطریں پڑھی جاتی ہیں، اس میں بہت سے فناصل کے اسماء درج ہیں جو اس زمانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ نیز اس عہد کے دوسرے حوادث تاریخی بھی کندہ ہیں۔ ان حوادث وواقعات کی فہرست میں ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، اور وہ یہ کہ سنہ ۱۵۴ء کے اوائل میں ملکہ انیا فوستیا (Annia Faustia) کی اور لیو (Marco Aurelio) ولیعہد مملکت سے شادی کا اعلان ہوا اور تقریب کے سلسلے میں ان ہدایا اور تحائف کی تقسیم کا حال مندرج ہے، جو انطینوبیو، کاہنوں کی جمعیۃ کے رئیس نے تقسیم کیے تھے، نیز ان جشنوں کا تذکرہ ہے جو اس تقریب سعید کے موقع پر منائے گئے تھے اور جن میں سب نے بقدر توفیق ومقدرت حصہ لیکر اپنی مسرت وشادمانی کا اظہار کیا تھا۔

اس لوح کے بعض شکستہ ٹکڑوں پر جو عبارت منقوش ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی سنہ کے ماہ جون میں، مہرجانات "السرک" منائی گئیں، یہ مہرجانات کھیل اور تفریح کے پبلک میدانوں میں منائی گئیں، جو اپنی وسعت وکشادگی کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ان مہرجانات میں، رومی جمہور نے جس جوش وخروش سے حصہ لیا، اُسی طرح، اسپینی عوام نے بھی دل کھول کر شرکت کی، اور کسی قسم کی

تفریق کا مظاہرہ نہیں کیا۔

• ان واقعات کے علاوہ ایک اور حادثہ مرقوم ہے کہ اکتوبر میں مجلس شیوخ نے ایک جلسۂ عام منعقد کیا، تاکہ ان اتہامات پر غور کرکے فیصلہ کیا جائے، جو کورنیلیو پرشیانو Cornelio Priscuano پر لگائے گئے تھے۔ یہ شخص، مملکت روما کی طرف سے اسپین کا گورنر تھا۔ اس لوح سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجلس الشیوخ نے ان الزامات کی تحقیق کی اور ایسی شہادتیں فراہم کیں جن سے نفس واقعہ کی صداقت یا عدم صداقت آشکارا ہو۔ لوح کے الفاظ اس معاملہ کے متعلق یہ ہیں:

De cornelio phiocsano in Senatum quad Prevenciam Hispaniamhostiliter

لیکن اسکے بعد کیا ہوا؟ مجلس الشیوخ نے کیا فیصلہ کیا؟ وہ کس طرح نافذ ہوا؟ ان واقعات کی تفصیل اس لوح سے نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اس کا بھی آخری حصہ شکستہ ہے، اور بعض ٹکڑے ناپید ہیں، لہذا کوئی صحیح علم اس باب کے متعلق نہیں ہو سکا، اور نہ اُس وقت تک شاید معلوم ہو سکے، جب تک یہ گم شدہ کڑیاں نہ مل جائیں۔

(۳) شیستیو کی حفاظت کا مسئلہ

تیسری لوح پر، ۱۵۱ء کے حوادث و واقعات مرقوم ہیں۔ اس کے بعض حروف کافی نمایاں اور روشن ہیں۔ اس سے تین باتیں خاص طور پر معلوم ہوتی ہیں، اول تو، مارکو اوریلیو ولیعہد کے بیٹے کی وفات، دوسرے اسکے دوسرے بیٹے کی وفات حسرت آیات، اور تیسرے، شیستیو کی حفاظت کا مسئلہ۔ اس لوح میں بھی بعض سطریں ایسی خراب حالت میں ہیں کہ اُنکا پڑھنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اور اسکی وجہ سے اس لوح کے بعض واقعات بھی پردۂ خفا میں مستور رہ گئے۔ مسٹر جویڈو نے اس حصہ کے پڑھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہے۔ مبہم اور ناقابل فہم حروف سے بھی ایک حد تک کام چل سکتا ہے لیکن جب لوح کے بعض حصے ہی غائب ہوں، تو محض قیاس کی بنا پر، تصنیف و تالیف کیونکر ممکن ہے؟

رومی اسے کوبری کے نام سے یاد کرتے تھے، جس طرح آج بھی اطالوی، اس نام کو استعمال کرتے ہیں۔ اس کی تعمیر و تشکیل ۵۰۰ھ اور ۲۶۰ ق م میں عمل میں آئی۔ بعد کو شہنشاہ فالینتی فالینتیانو نے اس کے پہلو میں ایک شہر لوشیو شیستیو کی تعمیر کی، کچھ ہی عرصہ کے بعد جسکی حیثیت ایک اچھے خاصے آباد شہر کی سی ہو گئی۔ شہنشاہ فالینتی کا زمانہ ۳۶۵ - ۳۷۰ء ہے۔

یہ ہے خلاصہ مسٹر جو یڈو کے پُر مغز مقالۂ تحقیقی کا، جسکی اہم الاہم حصص ہم نے عربی میں (اور ہم نے اُردو میں بھی) نقل کیے ہیں۔ کوئی اہم اور قابل ذکر بات اس مقالہ میں ترک نہیں کی گئی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ اہم حصہ، شہنشاہ ترایانوس کی اُن فتوحات کا تھا جو اُسنے مشرق کو جاپ میں حاصل کی تھیں۔ انھیں بغیر کسی کمی بیشی کے پیش کر دیا۔

اس شہنشاہ کے عہد میں، پلانیس، بیتینیا کا حاکم تھا۔ یہ شخص بڑے دبدبہ و طنطنہ سے حکومت کرتا تھا۔ اسکا معمول تھا کہ ہر روز ایک مجلس عدالت منعقد کرتا تھا، تاکہ ان لوگوں کے متعلق آخری فیصلہ صادر کرے جن پر دین مسیحی کے قبول کرنے کا الزام لگایا جاتا تھا۔ اسکے محاکمہ کا طریقہ یہ تھا کہ ملزموں کے بیانات لیتا تھا، پھر اُن پر جرح کرکے انھیں ایسا ایسا گھیرتا تھا کہ ان میں تاب مقاومت باقی نہیں رہتی تھی، اُس وقت مجبوراً بعض لوگ الزام کی صحت کا اعتراف کر لیتے تھے۔ بس فوراً پھانسی کا حکم دے کر اُن کا خاتمہ کرادیتا تھا۔ اُس زمانہ میں، اُن لوگوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا جو دین مسیحی کو قبول کر رہے تھے۔ انھیں اپنے مذہب پر اتنا پختہ اعتقاد تھا کہ وہ بعض اوقات بغیر کسی تامل کے اعتراف کر لیتے تھے، لیکن اس اعتراف و الزام نے جب ہزاروں آدمیوں کو عروس مرگ سے ہمکنار کر دیا تو اسے ذرا ہوش آیا اور خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں شہنشاہ کو میری اس ظلم آرائی کا حال نہ معلوم ہو جائے، تو پیش بندی کے طور پر اُس نے خود، شہنشاہ کو حالات سے باخبر کر دیا، اور اس باب میں شاہی ہدایت کا طالب ہوا، تاکہ آیندہ اس سلسلے میں جو کچھ کرے، اس کی سند جواز پاس رہے، اور بوقت ضرورت اس سے استناد کرکے وہ خود بری الذمہ ہو سکے۔

لیکن شہنشاہ نے جو جواب دیا، وہ ذرا خلافِ توقع تھا، شہنشاہ نے اپنے اس جفاکار گورنر کو حکم دیا تھا کہ وہ مرحمت و شفقت سے کام لے اور اجراء حدود میں سختی سے کام نہ لے، بلکہ مسیحیوں سے کوئی تعرض ہی نہ کرے، جو لوگ اس دین کو قبول کرنا چاہتے ہیں انھیں قبول کرنے دے اور ان سے کسی قسم کی بازپرس نہ کرے، اور نہ الزامات لگا لگا کر لوگوں کو حسب منشا سزا دے، ہاں وہ صرف اُن لوگوں کا فیصلہ کر سکتا ہے، جو خود فریادی ہو کر اُسکے پاس آئیں اور انصاف کے طالب ہوں۔

شہنشاہ کے اس حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین مسیحی کے حلقہ بگوشوں کی تعداد ساعت بساعت بڑھنے لگی، چنانچہ شہنشاہ کو اطلاع دی گئی کہ مسیحیت اس کی حکومت میں اس سرعت سے پھیل رہی ہے، جس طرح آن کی آن میں، سوکھی لکڑیوں کو آگ پکڑ لیتی ہے، اور دفعۃً سارے نواح میں چھا جاتی ہے۔ لیکن ان اطلاعات اور "سنسنی خیز" اطلاعات کے بعد بھی، شہنشاہ کے طرز عمل میں، کوئی فرق نہیں آیا، اُس نے

رواداری کا جو اصول قائم کردیا تھا اُس پر خود بھی قائم رہا اور دوسروں کو بھی اُس سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحیت بغیر کسی مانع کے خوب پھلی پھولی۔ اور سرعت سے مدارج ارتقا طے کرتی رہی۔

شہنشاہ کی اس روش سے بعض جماعتیں بہت ناخوش تھیں، چنانچہ انھوں نے نظام حکومت بدلنے اور شہنشاہ کو معزول کرنے کا تہیہ کرلیا۔ یہ جماعت رات کی تاریکی میں بغاوت کے جراثیم پھیلاتی تھی۔ اس نے تقریباً پورے طور سے یہ طے کرلیا تھا کہ حکومت کا نظام ضرور بدلا جائے، تاکہ عیسائیوں کی یہ آزادانہ روش باقی نہ رہے، اور وہ پھر اُسی طرح سلاسل جفا میں گرفتار ہو جائیں، جیسے پہلے تھے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ادھر یہ ترکیبیں ہو رہی تھیں، نظام حکومت بدلنے کی تدبیریں کی جا رہی تھیں، اُدھر یہ ہوا کہ ایک ایسا حادثہ عظیم پیش آیا جسنے بہت سے لوگوں کو ختم کردیا۔ اس قدرتی حادثہ میں اتفاقاً اسی جماعت کا نقصان بجان زیادہ ہوا۔ اس سے یہ لوگ سمجھے کہ یہ شہنشاہ کے باطنی تصرف اور اُس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے گناہوں سے تائب ہوئے، اور اتنا متاثر ہوئے کہ مسیحیوں کے کسی قسم کا تعرض کرتے ہوئے گھبرانے لگے۔ انکے اس اضطراب کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی اب حقیقی طور سے آزاد ہو گئے اُن پر سے اخلاقی اور جماعتی پابندیاں اُٹھ گئیں اور وہ قوانین کے اُس شکنجے سے بھی آزاد ہو گئے جو اناتیوس اسقف الطاکیہ نے انکے لیے تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس ردّ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ ترایانوس کے حکم کے مطابق، فوج کے ایک دستے نے ان حضرت کو اسیر کیا، اور شیر کی جھاڑی میں ڈال دیا، جسنے تھوڑی ہی دیر میں، چیر پھاڑ کر، ان بیچارے کا خاتمہ کردیا، کہ اصلی داعی بغاوت اور بانی فساد یہی شخص تھا۔ شہنشاہ ترایانوس کی اس "دین پناہی" نے اُسے مسیحیوں میں بہت ہردلعزیز کردیا، اور قوم میں بھی اسکی منزلت بڑھ گئی۔ روما کی تاریخ شہنشاہیت میں آج بھی اُسکا نام روشن حروف میں نظر آرہا ہے۔

اسی شہنشاہ ترایانوس کے عہد کا وہ واقعہ بھی ہے، جس کی جزئی تفصیل اوپر کہیں گزر چکی ہے۔ بات یہ ہوئی کہ یہودی اپنی فطرت بد کی وجہ سے خارج البلد کردیے گئے اور عام طور پر شاہی علم سے انکی جلا وطنی عمل میں آئی۔ فن سازش و بغاوت کے ماہرین خصوصی میں ہمیشہ اس قوم کا شمار رہا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی یہ لوگ خارج البلد ہوکر شرق میں پھیل گئے، اور جہاں پہونچے وہاں سازش اور بغاوت کی آبیاری شروع کردی۔ اسکندریہ، الطاکیہ، بارتیا، آرمینیا، عرب نائیہ، غرض کوئی حصہ، کوئی قطر، کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا، جہاں یہ پہونچے ہوں اور انھوں نے روما کا تخت حکومت اُلٹنے کی کوششیں شروع نہ کردی ہوں۔ یہ روما کی شہنشاہیت کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اس لیے پوری قوت کے ساتھ اسکا استیصال کرکے دم لینا

چاہتے تھے۔ شہنشاہ ترایانو کو جب اُن کے اس عزم نامسعود کی اطلاع ہوئی تو وہ مردانہ وار اس خفیہ بغاوت کا قلع قمع کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا، خود ہی فوج کی قیادت کی، اور نہر دجلہ تک بڑھتا ہوا ایلغار کرتا ہوا پہونچ گیا۔ یہی وہ فتح تھی جسکی خوشی میں شہنشاہ ترایانو نے مجلس الشیوخ کے پاس اپنے چیدہ قاصد کا ایک وفد روانہ کیا تھا، جس نے شہنشاہ کا یہ حکم سُنایا تھا کہ وہ اس تاریخی فتح کی مسرت میں عید مہرجان منائیں اور صلوٰۃ شکر بجا لائیں۔

افسوس کہ شہنشاہ ترایانو کی یہ فیروزمندیاں ابھی جاری تھیں کہ موت کا پنجۂ آہنی اُسکی گردن میں پیوست ہوگیا، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ اسکے بعد شہنشاہ ہبت ریانؔ دریان کا قبضہ ہوا، اسے اپنے پیشرو سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ اس نے مسیحیت کو تہ و بالا کردینے کی کوشش کی۔ اپنی شہنشاہی کا اعتراف کرانے کے لیے خود مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں شمالی برطانیہ بھی گیا، وہاں سے فارغ ہوکر یونان پہونچا، اثینا میں قیام کیا، پھر روما آیا، یہاں سے اُٹھا، تو الفاکیہ پہونچا وہاں سے بڑھا تو اسکندریہ پہونچ گیا، تاکہ پھر روما واپس جائے، وہاں سے ایک فوج لے کر یہودیوں کے استیصال کے لیے فلسطین اس ساز و سامان کے ساتھ پہونچا کہ سارے شہر کو زیر و زبر کرکے رکھدیا اور خود، بیت المقدس میں قیام کیا۔

اوپر مارکوس اوریلیوس؛ ولیعہد، کی شادی کا ذکر ہو چکا ہے، اسکی مزید تشریح یہ ہے کہ شاہزادہ نے شاہزادی آنیا فوستنیا سے شادی کرلی، لیکن شاہزادی نہایت بداطوار اور ناشایستہ تھی، ولیعہد کا اس سے شادی کرنا عام طور سے معیوب سمجھا گیا، اُسکی بداطواری کا یہ عالم تھا کہ خود ولیعہد کو بھی خوش نہ رکھ سکی، اور اُس سے بھی ایسا ناشایستہ برتاؤ رکھا، جس نے اُسے بددل کردیا، لیکن ولیعہد چونکہ شریفانہ اطوار و خصائل، رکھتا تھا، اس بُرے طرز عمل کو بھی وہ انگیز کرتا رہا، اور اپنی روش میں اُس نے کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آنے دیا، لیکن آدمی خوش قسمت تھا، کچھ ہی عرصہ کے بعد شہزادی کسی مرض میں مبتلا ہوئی، اور دفعتہً اُس کا انتقال ہوگیا۔ اس گلوخلاصی سے شہزادہ بہت خوش ہوا اور خدا کا شکر بجا لایا ۱۶۱ء میں اس خوش اطوار شاہزادہ نے رحلت کی، صرف ۱۲ برس تک بحیثیت شاہنشاہ روما کے یہ زندہ رہا اور اسکے بعد اُسکا انتقال ہوگیا، جسکا عام سوگ منایا گیا۔

تاریخ قدیم کے یہ مباحث، جو دلچسپ بھی تھے اور سبق آموز بھی، گزر گئے۔ آئیے اس مجلس کو تھوڑی

دیرا اور قائم رکھیں۔ تکمیل بحث کی خاطر یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کریں کہ اودستیا کی حقیقت کیا ہے؟

۔ سنہ ق م میں، جو روما کے تیسرے شاہنشاہ، تولوس ہوسٹلیوس کا زمانہ تھا، روما اور بالونجا کے باشندوں میں سخت جنگ ہوئی۔ اس بادشاہ کی دوراندیشی نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ خود جنگ سے کنارہ کش رہے، اس کی یہ صورت سوچی کہ فریقین میں سے تین تین پہلوان میدان میں اتریں اور وہ فریق غالب مانا جائے، جو تینوں پر غالب آ جائے۔ روما کی طرف سے تین پہلوان جو آل ہوراشیو سے تعلق رکھتے تھے، میدان میں اترے، اور بالونجا کی طرف سے تین پہلوان جو آل کوریاتو سے متعلق تھے، آگے بڑھے۔ معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ روما کے گروہ سے دو آدمی گر گئے، تیسرے آدمی کو بھی آل کوریاتو نے زخمی کر دیا۔ اس طرح گویا ہوریاتو نے تیسرے آدمی کو بھی پچھاڑ دیا۔ لیکن ہوریاتو کے خاندان کی ایک لڑکی، اس تیسرے آدمی سے محبت کرتی تھی۔ جب اس نے اس شکست کا یہ منظر دیکھا تو واویلا شروع کر دی۔ لوگ اسے شہنشاہ کے پاس لے گئے کہ وہ اس فریاد و فغاں کا فیصلہ کرے۔ لیکن بادشاہ نے فیصلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر یہ مسئلہ اس محکمۂ قضا کے سامنے پیش کیا گیا جو صرف عورتوں کے عدالتی فیصلے کے لیے قائم تھا۔ ہوراشیو نے اب خطرہ محسوس کیا اور معافی طلب کی، چنانچہ اسے معافی دیدی گئی۔

بالونجا کا شہنشاہ مولوس فوفیتوس، اس حرکت کو بنظر تعمق دیکھ رہا تھا، اسے یہ بھی احساس تھا کہ شکست سے آخر میں وہی دوچار ہوگا، چنانچہ اس نے ایک دوسری صورت اختیار کی، اور وہ یہ کہ شہنشاہ روما کو اطلاع دی کہ بعض اندرونی بغاوتیں، اس کی حکومت کو متزلزل کیے ہوئے ہیں، لہذا شہنشاہ روما اس نازک موقع پر اگر اسکی مدد کرے اور اسے ان آفات سے محفوظ کردے تو وہ عمر بھر اس کا شکرگزار رہے گا۔ شہنشاہ روما نے غایت درجہ انسانیت و شرافت سے اس کی یہ فریاد سنی اور امداد پر آمادہ ہو گیا، لیکن فوراً ہی اسے اطلاع مل گئی کہ اسکے ساتھ دغا کی گئی ہے، چنانچہ اس نے دعا کی کہ اگر مجھے کامیابی اور ظفرمندی نصیب ہوئی، تو ایک بہت بڑے شہر کی تعمیر کروں گا، جو اپنی عظمت و رفعت کے لحاظ سے ساری دنیا کے لیے نمونہ ہوگا، اور اسکا نام اودستیا رکھونگا ——— اودستیا رومیوں کی ایک دیوی کا نام ہے، جسکا وہ بہت ادب و احترام کرتے ہیں۔ حسن اتفاق کہ کامیابی رومیوں کے حصے میں آئی، اور شہنشاہ روما نے اپنے دشمنوں کا اچھی طرح خاتمہ کر کے رکھ دیا، ایسا کہ پھر کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔

بادشاہ روما نے، بالونجا کے خائن اور غدار بادشاہ کو گرفتار کیا اور اسے نہایت حیرت انگیز طریقہ پر سزائے موت دی، تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور وہ اسکے اس فعل بد سے سبق حاصل کریں۔

اس فتح کے بعد، شاہنشاہ نے اپنی نذر پوری کرنی چاہی۔ چنانچہ وہ جنگ کے دیوتا کے مندر پر گیا اور وہاں قربانی کی رسم ادا کی۔ ان مراسم سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے اپنی نذر پوری کی اور ایک عالیشان شہر اوستیا نامی کی بنا ڈالی، جو حقیقتہً اسلوب و وضع کے لحاظ سے ایسا اعلیٰ درجے کا تھا کہ واقعی دنیا کے لیے نمونہ ثابت ہوا۔

یہ ہے شہر اوستیا کی کہانی، اور اُس دیوی (اوستیا) کی کہانی، جسکے نام پر اس کی تعمیر ہوئی۔ یہی وہ شہر ہے جو اب ایک کھنڈر کی صورت میں، مسٹر جویڈ کی محنت و کوشش کے بعد دریافت ہوا ہے۔ اس کے آثار اب بھی اس کی عظمت ماضی کے آئینہ دار ہیں، اور ان سے بہت سے سبق حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

(ترجمہ از عربی)

فغانِ آرزو

(جناب منشی انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

کل قہقہہ مینا کا تھا اب چشم تر ساغر ہوں میں
بدلی ہے طرز زندگی افسانۂ دیگر ہوں میں

تم شکوے سن سکتے نہیں اور لٹ کے کیونکر چپ رہیں
فیصل ہے یہ جھگڑا ابھی کہ کہ غارتگر ہوں میں

جاں اک امانت جس کی تھی پھر آج اُسی کو سونپ دی
قاتل سے اپنے سرخرو خونِ لب خنجر ہوں میں

اِک چُپ کے معنی سیکڑوں اک غم پہ لاکھوں تہمتیں
اُتنا ہی رسوا ہے جہاں جتنا حیا پرور ہوں میں

مشقِ ستم سے پوچھ لے ترکِ ستم سے پوچھ لے
پتھر سے بڑھکر سخت ہوں شیشے سے نازکتر ہوں میں

جب سوزِ غم افزوں ہوا شعلہ سا لہرانے لگا
چُپ رہ کے بھی سب کہ گیا کتنا زباں آور ہوں میں

ہے بیقراری زندگی اور موت دم بھر کا سکوں
اس وحشتِ پُر آشوب میں اک ہو حِہ صرصر ہوں میں

سیلابِ بحرِ شوق کی ہر موج ہے موج آفریں
ٹھنا مرا دشوار ہے یک روح صد پیکر ہوں میں

کم کرکے گرمی شوق کی پلٹا نہ منزل کی طرف
گھلا ہوا ادا ہے دل پانی نہیں پتھر ہوں میں

جب آرزو کچھ پڑھ دیا محفل کو وجد آنے لگا
اس دورِ بے کیفی میں بھی اک گردشِ ساغر ہوں میں

اصطلاحات فلسفہ پر تنقید

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الناظر بابت اکتوبر ۳۴ء)

منطق

تنقید بر اصطلاحات منطق مترجمۂ جناب مولانا عبدالماجد صاحب بی اے

(نوٹ - جن الفاظ پر * یہ نشان ہے وہ اب تک عربی منطق میں رائج ہیں - نئے ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اصطلاح انگریزی	اصل ترجمہ	ترجمۂ جدید	تبصرہ و تشریح
Agreement	موافقت	اتصال*	
Dis-agreement	مخالفت	انفصال*	
Analogy	تمثیل	تشبیہ	
Invariable	دائمہ	ثابت - قدیم*	ثابت یا قدیم وہ شے ہے جس میں تغیر و تبدل نہ ہو سکے - دائمہ غلط ترجمہ ہے - اس لیے کہ دائمہ وہ قضیہ موجبہ ہے جس میں موضوع کا ثبوت یا سلب محمول کے لیے ہمیشہ رہے -
Argument	بُرہان	دلیل*	برہان دلیل قطعی کو کہتے ہیں -
Attributes	اعراض	صفات	Accident عرض کا ترجمہ ہے
Axioms	براہین اولیۂ - علوم متعارفہ - اولیات	اولیات	
Beliefs	یقینیات	عقائد	Certainty یقین کی انگریزی ہے
Fundamental beliefs	اولیات - یقینیات اولیہ	عقائد اساسی	
Universal beliefs	اولیات عامہ یقینیات عامہ	عالمگیر عقائد	General عامہ کا ترجمہ ہے

Cause, direct	علت مستقیم	علت بینہ *	
Cause, final	علت غائی	علت تامہ *	علتِ غائی وہ مقصد ہے جس کے لیے کوئی فعل کیا جائے۔ مثلاً تخت بنانے کی غرض اُس پر بیٹھنا ہے۔
Characteristic	خاصہ	خصوصیت	فاضل مترجم نے Property کا بھی ترجمہ خاصہ کیا ہے۔
Circumstances	عوارض۔ حالات	حالات	
Cognition	تعقل	ادراک*	
Classification	اصطفات	تقسیم۔ ترتیب	
Data	معطیات	مفروضات*	
Definition Redundant	تعریف فائض	رسم *	
" Provisional	تعریف عارضی	تعریف فرضی	
Difference	تفریق	فرق	
Division Incomplete	تقسیم غیر کامل	تقسیم ناقص	
" Over Complete	تقسیم اکمل	تقسیم زائد۔ تقسیم فضول	
Extensive	وسعت	وسیع	
Fallacy of Accident	مغالطۂ اتفاق	مغالطۂ اتفاقیہ	اتفاق اور اتفاقیہ میں فرق ظاہر ہے۔
" " appeal to passion	مغالطہ مرافعہ تشافقی	مغالطہ استرحام مغالطہ	
Fallacy Popular	مغالطۂ دلیل مرافعہ الی تشافق العوام	مغالطۂ عوام	شیخ کی ایک کتاب بھی اسی نام سے موسوم ہے جسے "مغالیط عامہ" کہتے ہیں۔
Fallacy Verecundian	مغالطۂ استناد ای تعظیم المستندین العظام۔	مغالطۂ استناد	
Inference	انتاج تنتاج	نتیجہ	انتاج نتیجہ دینے کو کہتے ہیں۔

Inference immediate	استنتاج بدیہی	نتیجۂ فوری	
" mediate	" نظری	" بالواسطہ	
Logic of Certainty	منطق یقینی	منطق یقین	
" Probability	" احتمالی	منطق امکان	
Percepts	مدرکات	تصورات	
Proposition hypothetical	قضیہ افتراضیہ	قضیہ مفروضہ*	
Proposition indefinite	قضیۂ مہملہ	قضیۂ غیر معین	
" Symbolic	قضیۂ الوزجی	قضیۂ علامتی	
Mind	نفس	نفس . ذہن	
Science	حکمت	سائنس . علم	حکمت کا ترجمہ ہے Philosophy
Dilemma	قیاس محتمل ضدین	توریہ*	
Synthetic Method	اسلوب تحلیل	طریقہ ترکیبی	تحلیل کا ترجمہ ہے Analytical
Term Abstract	حد مجردہ	حد معاتی	
" Concrete	حد مقرون	حد ذاتی	
Verification	امتحان	تصدیق*	

نفسیات

تنقید بر اصطلاحات اصول نفسیات ترجمۂ جناب پروفیسر مسعود ولی الرحمن صاحب ایم اے - (عثمانیہ یونیورسٹی)

اصطلاح انگریزی	اصل ترجمہ	ترجمۂ جدید	تبصرہ و تشریح
Accomodation	توفیق	تطبیق	توفیق کے معنی ہیں کامیابی - مالدار ہونا
Acranial Amphioxus	بے سر دودھارا	بے سری دودھاری مچھلی	

Altruistic Emotions	اخوانی جذبات	جذبات ایثار	
Amphibian	خشک آبی	دو جنسے	ایسے جانور جو دو قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں Amphi = دو bios = زندگی
Analysis Intellectual	تحلیل عقلی	تحلیل ذہنی	
Anatomy	علم تشریح الاجسام	تشریح	
" Comparative	تطبیقی " "	تشریح متقابل	
Aphasia	فقدان تکلم	نقصان تکلم / زوال گویائی	دماغ کے کسی حصہ کی خرابی کی وجہ سے اظہار خیالات پر قادر نہ ہونا۔
Appetite	اشتہا	خواہش	
Association	تلازم	تصاحب	
" by Contiguity	تلازم بالمقارنت	تصاحب بالاتصال	
" Successiv	تلازم متعاقب	تصاحب تدریجی	
Attention	توجہ خود رو	توجہ اختیاری	
Spontaneous		توجہ فطری	
" Non-voluntary	توجہ عدیم الارادہ	توجہ غیر ارادی	
" Involuntary	توجہ غیر ارادی	توجہ خلاف ارادی	وہ توجہ جو ارادہ کے خلاف کسی چیز کی طرف ہو۔
Cell	خلیہ	خانہ	(خانہ دار Cellular)
Blood Vessels	اوعیہ دموی	رگہائے خون	
Bulb	بصل	گرہ	
Buccal	بوقی	رخساری - حنکی	بوق ایک طرح جبڑا اور بوقی اسی سے منسوب معلوم ہوتا ہے۔
Capsule	درج	کیسہ، خول، محفظہ	
Chiasma	صلیبیہ	تقاطع	دو خطوں کا ایک دوسرے کو قطع کرنا مثلاً ×
Cochlea	قوقعیہ	کانکا پردہ - حلزون الاذن	

Dura Mater	ام جافیہ	سخت دماغی جھلی	اسکے لغوی معنی ام جافیہ (سخت ماں) ہیں۔
Pia mater	———	نرم دماغی جھلی	(لغوی۔ نیک ماں)
Concord	ہمواری	ہم آہنگی سُر ملنا سما (بندھنا)	ہمواری زمین وغیرہ کے برابر ہونے کو کہتے ہیں۔
Comparative Psychology	نفسیات تطبیقی	نفسیات تقابلی	Comparision کا ترجمہ خود فاضل مترجم نے مقابلہ کیا ہے۔
Complex Tone	مرکب سُر	لہجۂ مضاعف	
Conation	طلب	قوتِ ارادی	
Conductivity	موصلیت	رسا۔ رسائی	
Constrictor	عاصرہ	سکیڑنے والا پٹھا	عربی میں "عضلہ عاصرہ" کہتے ہیں
Co-ordination	تطابق	تسویہ۔ برابری	
Cornea	قرنیہ	پتلی	قرنیہ بھی صحیح ہے
Consciousness	شعور	آگہی۔ ہوش	آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے (غالب) ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی (غالب)
Corpora quadrigemina	اجسام رباعیہ	چو جڑواں جسم یا۔ چار جسیمہ	اس کی عربی اجسام توأمیہ اربعہ ہے۔
Corpuscle	جسیمہ	جسیم۔ ورنہ	جسیمہ غلط ہے۔
Delusions	غوایات	دھوکا۔ فریب	
Discord	ناہمواری	اختلاف نغمہ۔ بےسُرا پن	
Dissonance	"	"	
Drum	طبلہ	ڈھول گوش صماخ	عربی ہے طبلۃ الاذن۔ صرف طبلہ غلط ہے
Ego	ایغو	خود۔ انا	
Egotistic Emotion	جذبۂ ایغوئی	جذبۂ خودی یا انانیت	
Emulation	مبارزت	مقابلہ	
Eustachean tube	اوستاکی نالی	کان کی حلقی نالی	اُستاکیوس ایک اطالوی طبیب تھا اسکے

			یہ نالی ہے جو اندرونی کان اور منہ کے پچھلے حصہ کو ملاتی ہے۔
Extensity	امتدادیت	وسعت	
Familiarity	مانوسیت	اُنس۔ بےتکلفی	
Feeling	حسیت	احساس۔ حاسہ	
Freedom of the will	آزادیٔ ارادہ	اختیار	
Fusion	امتزاج	آمیزش۔ ملاوٹ	
Ganglion	عقدہ	گرہ	
General Idea	عام مثال	عام تخیل	
Generic " "	جنسی مثال	جنسی تخیل	
Hippo Campal	ہیپوکمپی	متعلق بہ ہپوکمپ یا متعلق بہ اسپ آبی	
Hydroid	آبانس	کرم آبی۔ جل کیڑا	
Hypnosis	حالت تنویم	خواب مصنوعی۔ نقلی نیند	
Idea	مثال	خیال	
Ideation	تمثل	تخیل	
Ideational	تمثلی	تخیلی	
Illusion	التباس	فریب نظر۔ دھوکا	
Imagination	تخیل	تمثل۔ تصور	
Imitation	تقلید	نقل	
Instinct	جبلت	میلان فطری۔ طبیعت یا رجحان	
Intellectual	عقلی	ذہنی	
Interjection	ندائیہ	کلمۂ استعجاب	
Introspection	مطالعۂ باطنی	باطن بینی۔ مراقبۂ نفس	

Joint	مفصل	جوڑ - بند	
Lapsed intelligence	عقل سقوط	کند ذہنی	
Lens	عدسہ	لنز	عدسہ بھی صحیح ہے مگر اردو میں لنز ہی ٹھیک ہے
Lobe	نفص	لَو	
Mind	ذہن	نفس - من	خیال - ارادہ + احساس + حافظہ + عقل کا نام نفس ہے۔
Octave	سرگم	آٹھواں پردہ آٹھواں سُر	سرگم پورے ساتوں سُروں کا مخفف ہے۔
Onomatopoetic	صوتی	صوت نما نقل صوت	
Optimistic	رجائی	خوش خیال - زندہ دل	
Perception	ادراک	تصور	
Pitch	امتداد آواز	رفعت صوت بلندی آواز	
Productive Imagination	تکوینی تخیل	تصور تکوینی	
Relaxation	رخاوت	ڈھیل تخفیف	
Reproduction	محاکات	استحضار	دوبارہ یاد کرنا۔
Retention	خازنیت	رکاوٹ - روک	خزن کے معنی ہیں جمع کرنا یا چھپانا
Retina	شبکیہ	جالدار جھلی	
Sameness	ہویت	یکسانیت	
Satisfaction	تشفی	اطمینان	اردو میں تشفی کے معنی ہیں تسلی کے (یعنی دلاسا)
Secretiveness	اخفائیت	رازداری - رکھ رکھاؤ ریشش	
Sentiment	وجدان	تاثر - کیف	
" Concrete	وجدان عینی	تاثر عینی	

Strain	جہد	کوشش بلیغ خیال آرائی - نغمہ	
Sub-Consciousness	تحت شعور	زیر آگہی - کم آگہی	
Suggestion	تاثر - تاثر آفرینی	اشارہ - ایما	
Sympathetic System	نظام اشتراکی	نظام مواسات نظام ہمدردی	اشتراک سیاسی اصطلاح ہے - جو ملکیت کے مشترک ہونے کے متعلق ہے
Temporal	زمانی	دنیوی - فانی	روحانی اور دائمی کی ضد
Timbre	کیفیت (آواز)	اختلاف صدا و آہنگ	دو باجوں کے ایک ہی سُر کا اختلاف صوتی
Tone	سرتی	لحن - سُر	
" Combination	سرتی تضاعف	آمیزش سر	
Tympanum	طبلہ	پردہ گوش - دف گوش	عربی ہے طبلۃ الاذن
Telepathy	دوراثری	دوراحساسی	Pathos کے معنی ہیں احساس
Unconsciousness	غیر شعوری	بیہوشی - عدم آگہی	
Ventricle	تجویف	جوف بدنی	تجویف مصدر ہے
Vibration	ارتعاش	لرزش - کم تھرتھراہٹ	
Vocal Cord	حبل صوتی	رشتہ آواز	

مابعد الطبیعیات

تنقید بر اصطلاحات مابعد الطبیعیات مترجمہ جناب مولوی عبد الحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو

اصطلاح انگریزی	اصل ترجمہ	ترجمہ جدید	تبصرہ
Academy	اقدمیہ	اکاڈمی	
Aposteriori	غیر اولی	تجربی	
Apriori	اولی	پیدائشی - خلقی	بالکل لفظی ترجمہ مفہوم پہ حاوی نہیں ہے
Contemplation	غوص	مراقبہ - تفکر	غوص کے معنی ہیں غوطہ لگانا۔

Dynamism	قوتیت	حرکیت	
Eternity	سرمدیت	ازل - ابد	
Full	ملا	بھرا ہوا - پُر	(عربی ملآن ہے)
Geocentric	زمی مرکزی	ارض مرکزی - زمین مرکزی	
Hylozoism	ہیولی	مادی حیاتیت	
Indifferent	خالی	بے پروا	
Mechanism	مکانیت	مکانکیت مشینیت	مکانیت مکان سے مشتق ہے۔ اس لیے غلط ترجمہ ہے۔
Monad	خود	واحدہ - ذرہ	ایسا ذرہ جو قوی ہو۔ (لیبنز)
Monadology	خودیات	واحدیات - ذریات	
Mythology	خرافات یا صنمیات	میتھیا	یہ سنسکرت کا لفظ بالکل انگریزی کا ہم معنی ہے۔
Neo platonism	اشراق	نوفلاطونیت افلاطونیۃ الحدیثہ نو اشراقیت	اشراق صبح کے وقت روشن ہونے کو کہتے ہیں۔ افلاطون و بقراط اسی نسبت سے اشراقی کہلاتے تھے لیکن اشراقیت اور نو اشراقیت کے عقائد میں فرق ہے۔
Nihilism	فنائیت - نفیت	عدمیت	
Optimism	رجائیت	زندہ دلی - خوش فالی	
Paganism	پیگانیت	کفر - الحاد	
Pagan	پیگان	کافر - ملحد	
Pantheism	وجودیت	مذہب ہمہ اوست	وجودیت سے مفہوم ادا نہیں ہوتا
Positivism	واقعیت - ایجابیت	مذہب وضعی وضعیت	یعنی فلسفہ کا مسئلہ جو واقعات پر مبنی ہے۔ اور علتوں کے امکان سے قطعی انکار کرتا ہے۔

Sensualism / Sensism / Sensationalism	شہوانیت	حسیت۔ مذہب الحسی	شہوانیت برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
Stoicism	رواقیت	رواقیت۔ یوگ	
Personification	تمثیل	التباس۔ بہروپ	
Pessimism	قنوطیت	مردہ دلی۔ بدفالی	عربی تشاؤم ہے
Place	آین	مکان	
Time	متی	زمان	
Zeus	زیون	زیوس	یونانیوں کا ایک دیوتا۔ اسم علم ہے اصطلاح نہیں ہے۔

شہاب ثاقب

(جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی)

شکر ہے بوے وفا شامل ہے بوے دوست میں
اُڑ رہی ہے خاک دل مدت سے کوے دوست میں

واے قسمت کب دیا گوشِ سماعت نے جواب
کچھ مزا ملنے لگا جب گفتگوے دوست میں

نازشِ دیر و کلیسا بد حواسی میں بڑھی
کوے دشمن تک گیا میں جستجوے دوست میں

گوہرِ یکدانۂ دل گھلتے گھلتے بہ گیا
غرق تھا مدت سے فکرِ آبروے دوست میں

زندگی سے دشمنی ہے کیا کروں مجبور ہوں
موت ہی مجھ کو نظر آتی ہے بوے دوست میں

دل کو دیکھا ذکر میں مشغول جب تک دم رہا
زندگی ثاقب بسر کی گفتگوے دوست میں

لکھنوی اور دہلوی مدارس شاعری پر ایک تحقیقی اور تنقیدی نظر

(جناب منشی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی اے ایل ایل بی وکیل)

(۱)

ادب کا مفہوم عامۃ الناس کے ذہن میں کچھ بھی ہو لیکن یہ ماننا پڑیگا کہ ادب اور ادب کو ادب بنانے والوں کی ہستیاں کچھ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ توام ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تذکرہ "جسدِ بے جاں" سے زیادہ حقیقت و وقعت نہیں رکھتا، بہ الفاظ دیگر ہر ادبی شاہکار ہمارے ذہنی احساسات کو اُس شخصیت کی جانب منتقل کر دیتا ہے جسکے علم و فضل، قابلیت و کمال کا وہ ثمرہ ہے جسکے خیالات و جذبات کا وہ آئینہ ہے - لامحالہ ہر ادب میں اُن ہستیوں کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے جنھوں نے اُسکے سنوارنے میں مہتم بالشان حصہ لیا ہے، جن کی جگر کاوی اور دیدہ ریزی سے اُس ادب کو ادب کا مرتبۂ اعلیٰ حاصل ہوا ہے' اور گو یہ عذر حق بجانب ہے کہ اُنکی پرائیوٹ زندگی پر تفصیلی بحث کرنے سے "تضیعِ اوقات" اور "دورازموضوع" ہو جانے کا اندیشہ ہے لیکن اس امر سے بھی کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب کے "بحرِ ناپیداکنار" کے ہر ہر گہر آبدار کی "چمک دمک" "وضع و بناوٹ" "حسن و قبح" سب پر خصوصیت کے ساتھ عمیق اور مفصل تبصرہ کیے بغیر ذوقِ ادب' کے 'تشنہ کام' رہ جانے کا کھٹکا ہے -

ادب کسی قوم اور کسی زبان کا ہو' اُس کا ارتقا کے مختلف ادوار سے گزرنا لازمی ہے - وہ صدی سے صدی' اور قرن سے قرن' میں بدلتا اور تغیر پاتا رہتا ہے - ہر نیا ستارہ جو ادب کے درخشاں اُفق پر طلوع ہوتا ہے اور ہر پُرانا ستارہ جو اُس ادبی اُفق پر کے تجلی زار پر چمک کر غروب ہوتا ہے' ستارۂ ماقبل و مابعد سے اسی طرح متعلق ہوتا ہے جس طرح شب و روز سے صبح صادق' یا آسمان و زمین سے اُفق'— ستارے طلوع اور غروب ہوتے رہتے ہیں اور اُفق کی حیثیت اور رنگت دونوں کو متاثر کرتے رہتے ہیں لیکن ایک زمانہ آتا ہے جب ایک خورشید عالمتاب نمودار ہوتا ہے اور اپنی ضیاؤں اور تجلیوں سے دوسرے تمام ستاروں کی روشنی کو ماند کر دیتا ہے — یہ غیر معمولی شخصیت کا مالک باکمال اپنے بعد بھی اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے اور اگر اُسکے بعد کے آنے والے "رہ پیمایانِ جادۂ ادب" کے افکار کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ

چلے گا کہ اُن میں سے تقریباً سب "دانستہ یا نادانستہ" اُسکے افکار سے متأثر اور اُسکے کمال کے مرہونِ منت ہیں، اور اُنکے کلام اور طرزِ کلام میں اُسی کے اثرات کی جھلک نمایاں رہے۔ یعنی جب کوئی باکمال شہرت اور ہردلعزیزی حاصل کرکے بقائے دوام کا مرتبہ حاصل کرلیتا ہے تو اُس کے پیرو اور اُس کی نقل کرنے والے عرصۂ تک وجود میں آتے رہتے ہیں، اس طریقے سے مختلف اسکولوں کی بناء پڑتی ہے اور متعدد تحریکیں رُونما ہوتی ہیں۔ یہ تحریکیں ایک مدت تک باقی رہتی ہیں لیکن جوں جوں "نظریۂ ذوق" تغیر ہوتا ہے یہ بھی محو ہوتی جاتی ہیں اور انکے ساتھ ساتھ اُنپر قائم شدہ اسکول بھی مٹتے رہتے ہیں۔ انکے اختتام کے بعد ان کی جگہ دوسرے اسکول اور دوسری تحریکیں لے لیتی ہیں ——— ہم ناسخ کے اسکول کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مقصد اُن تمام شعراء سے ہوتا ہے جنھوں نے اُس کا تتبع کیا، جنھوں نے اُسی "طرزِ ادا" اور اُسی "طرزِ تخیل" کی پیروی کی جسے ناسخ نے معراجِ کمال تک پہونچا دیا تھا ——— آج سے پچھتر برس پہلے نثر نویسی کا جو طریقہ رائج تھا اُسکی بناء کرنے والے لکھنؤ کے مرزا رجب علی بیگ سرور تھے۔ اُنکی روشِ تحریر نے عرصے تک مُلک کے نثار طبقے کو متاثر رکھا، اور اس لحاظ سے ہم اُس عہد کے طرزِ تحریر کو "سُرور اسکول" کی نثر کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں۔

اس نوعیت کی تحریکیں اور اس قسم کے اسکول ادب کے ارتقائی نشوونما میں بہت اہم حصہ لیتے ہیں، ہر اسکول کا سرگروہ ایک نہ ایک باکمال ہوتا ہے۔ کمال کے معانی مختلف اصحاب کے ذہن میں جدا جدا ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ کمال نام ہے "شخصیت کے اقتدار" کا۔ کوئی کہتا ہے کہ کمال عبارت ہے "جدت طرازی کی صلاحیت" سے۔ بہرطور کمال کا مفہوم خواہ کچھ ہی ہو، یہ امر مسلم ہے کہ ہر حقیقی باکمال دُنیا میں ایک کلیۃً جدید اور نرالی شے کے وجود میں لانے کا باعث ہوتا ہے ——— خود اپنی ذات ——— اور چونکہ وہ اپنے کمال کے تمام حقائق و معارف کو اپنی ہر تصنیف میں حل کردیتا ہے اس لیے اُس کا ہر "کار" دُنیا کے تمام "تصانیف" سے تمائز کیا جاسکتا ہے اور ہر طبعی باکمال کی اِن امتیازی خصوصیات کو ملحوظ رکھنا تمام "نقادانِ ادب" کا پہلا فریضہ ہے، اس موقع پر ہم کو یہ امر نہ فراموش کردینا چاہیے کہ مصنفین جن کے متعلق عام طور پر یہ تخیل ہے کہ وہ کلیۃً جدت طراز تھے اور یہ کہ اُنکے ادبی کوائف کسی دوسری ہستی کے کارناموں یا خیالات کے منت کش نہیں ہیں، اُن میں سے بھی اکثر ایک حد تک دوسروں کے "جامِ تخیل" کے بادہ خوار اور اوروں کے "گلشنِ فکر" کے خوشہ چیں ہوتے ہیں ——— نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی مرحوم کے متعلق عام طور پر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ اُن کا "رنگِ فکر" اُنھیں کے لیے مخصوص تھا، کہ اُنھوں نے ہی اسکی بنیاد ڈالی اور اُنھیں پر یہ ختم ہوگیا، لیکن نفس الامر میں حقیقت یہ ہے کہ جس مخصوص طرزِ تخیل کو اُنھوں نے اپنی ذہانت اور حسنِ ادا سے چرخِ ہفتم پر پہونچا دیا تھا وہ اُن سے برسوں قبل جرأت کے ہاتھوں آغاز کی عزت حاصل کرچکا تھا اور جس

پودے کو اُنھوں نے "خونِ فکرِ رنگین" سے پروان چڑھایا اُس کی نشو و نما اور آبیاری مدتوں جرأت کے لائق ہاتھوں سے ہوتی رہی تھی۔

[illegible] دہلوی

(۱) چمپئی رنگ اُسکا اور جوبن وہ گدرایا ہوا — سا قیا اب تک نشہ آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

(۲) ہمارے سر پہ چھائی ہیں بلائیں شامِ ہجراں کی — وہ اپنے شغل میں ہیں بال ادھر کھولے اُدھر باندھے

(۳) ادا جان لیتی ہے جانی تمھاری — ستم ڈھا رہی ہے جوانی تمھاری

داغ دہلوی

(۱) اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی — اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

(۲) قیامت ہیں بانکی ادائیں تمھاری — ادھر آ کہ لے لوں بلائیں تمھاری

(۳) یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اُڑا رہی ہے ہوا — چھپاتے ہیں جو وہ سینہ کمر نہیں چھپتی

میر انیس مرحوم جس صنعت شاعری کے دلدادہ ہوئے اُس کی تعلیم اُنھوں نے عرصے تک مرثیہ گو حضرات کے کلام سے حاصل کی تھی، میر کے متعلق عام طور پر یہ تصور ہے کہ وہ اپنے مخصوص رنگ میں سب سے علیحدہ تھے، کہ اپنے امتیازی طرز میں وہ صرف آپ اپنا جواب تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ گو میر کا سا اندازِ بیاں نہ کسی کو اُن سے پہلے نصیب ہوا تھا، نہ اُنکے بعد کسی کے حصہ میں آیا مگر اُنھوں نے قدم محض اُسی راستے پر اُٹھایا جس کی بنیادیں اُن سے پیشتر دکنی شعرا نے قائم کر دی تھیں، اسمٰعیل میرٹھی، آزاد، اور حالی، جو ہندوستان میں قدرتی اور نیچرل شاعری کے علمبردار متصور ہوتے ہیں، بڑی حد تک مغربی زبانوں کے اساتذہ کے مرہونِ منت ہیں۔

جیسا کہ میں نے اس سے پہلے لکھا ہے، ادب تغیر پذیر ہے، اور صدی سے صدی، قرن سے قرن میں بدلتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر زمانے میں ذہنیتِ عامہ کا ایک خاص رجحان ہوتا ہے عوام النّاس کی دلچسپیاں اور جذبات ایک مخصوص اور امتیازی رنگ کے ہوتے ہیں اُسی طرح ہر دَور کا ذخیرۂ ادب بھی چند خاص اور ساعتی نظریہ جات سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ نظریئے ایک محدود دورانِ وقت تک باقی رہتے ہیں پھر فنا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے نظریئے لے لیتے ہیں۔ ایک دَور کے نظریوں سے دوسرے دَور کے نظریوں میں ضرور کچھ نہ کچھ اختلاف ہوتا ہے۔ موجودہ دَور سرسید، حالی، آزاد، شبلی اور نذیر احمد کے دَور سے کچھ زیادہ دُور نہیں۔ مگر باوجود اسکے موجودہ دَور اور اُس دَور کے مذاقِ عام اور ادبی نظریوں میں کس قدر تفاوت ہے، بہت سی چیزیں اُس میں ایسی ہیں جو ہم کو بہت انوکھی اور عجیب معلوم ہوتی ہیں، اور بہت سے تخیلات ایسے ہیں جو اُس دَور میں کلیۃً معدوم تھے۔ مگر آج کے ادبی کارناموں میں بخوبی نمایاں ہیں، ——— میر حسن کے زمانے میں سحر البیان کی ستائش کا

کیا ٹھکانا ہوگا، جانِ عالم پیا کے اختر نگر میں ناسخ اور وزیر کے اشعار پر چھتیں اڑ جاتی ہوں گی جھلملاتی ہوئی شمع کے سے لکھنؤ میں گلزار نسیم کی بیتوں پر سامعین بسمل ہو جاتے ہونگے، لیکن آج کیا حال ہے، سحر البیان اور گلزار نسیم کو ادبی کارنامے سمجھ کر ان کی قدر و منزلت کرلی جاتی ہے مگر ان میں ظاہر شدہ خیالات پر سامعین کی بھویں تن جاتی ہیں۔ ناسخ اور وزیر کے افکار کو اساتذہ کے زورِ تخیل کا حاصل سمجھ کر ان سے بے ادبی نہیں کیجاتی مگر کراہت کے اظہار سے سننے والے باز نہیں رہتے —— اس سب کا مقصد یہ ہے کہ ہم کو ادب کے مطالعے میں مصنفین کے انفرادی تاثرات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کیونکہ کامل ترین باکمال بھی اپنے دور کے خیالات و جذبات، تہذیب و تمدن، احساسات و ادراکات سے محفوظ نہیں رہتا، بلکہ اس سے متاثر ہوتا اور اس ماحول کے تاثرات کو قبول کرتا ہے۔ سلطنتِ عباسیہ کی تاتاریوں کے ہاتھوں بربادی نہ ہوتی تو سعدیؒ کا دل ہلا دینے والا مرثیہ وجود میں نہ آتا، فرانس کی تمدنی، معاشرتی زندگی اٹھارویں صدی میں ناگفتہ بہ نہ ہوتی تو والٹیر کے کارنامے آج موجود نہ ہوتے، لکھنؤ واجد علی شاہی میں عیش و سرمستی کا گھر نہ ہوتا تو ناسخ، امانت وغیرہ کے افکار صفحۂ ہستی پر نہ آسکتے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے دور کی ذہنیت کو بھی اپنے وجود سے متاثر کرتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہی وہ شے ہے جس میں مسلم الثبوت اور ہر دلعزیز اہلِ کمال کی کامیابی کا راز مضمر ہے یعنی یہ کہ پبلک نے اُنکے کلام کی داد کس طرح دی، اُنکے افکار کا استقبال کس طرح کیا — اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم پر فرض ہے کہ ہر باکمال کو خواہ وہ شاعر ہو یا ناظم، ناثر ہو یا مؤلف اُس کے دورِ حیات کا افشردہ تصور کرنا چاہیے اور اُس پر تنقید و تبصرہ کرنے کی ساعتوں میں اس صداقت کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے، یعنی اُس کے حسن و قبح کو تولتے وقت ہمیں اُن اثرات کا جن سے اُسکی تخییل متاثر ہوئی، اُن جذبات کا جن سے اُس کا مذاق بنا، اُن احساسات کا جن سے اُسکے کلام کو امتیازی حیثیت حاصل ہوئی، لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اس قسم کے اثرات کبھی محض ادبی ہوتے ہیں یعنی اُن کا انحصار کتابوں پر اور اُن کی انتہا ان کتابوں کے لکھنے والوں تک ہوتی ہے۔ اس نوع کے اثرات کے عمیق مطالعہ سے ہمیں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح نئے مذاق پیدا ہوتے اور پرانے مردہ ہوتے ہیں، لیکن بیشتر یہ اثرات ادبی حیثیت سے بڑھ کر سیاسی، سماجی اور تمدنی ہو جاتے ہیں۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی ملک کی کشمکش حیات کے ایک خاص دور میں ملک کے باشندوں کے خیالات و جذبات، تمدن و تہذیب، اخلاق و معاشرت میں تغیر ہوتا ہے اور ملک کا ادب ان سب سے الگ تھلگ ان شورشوں سے علیحدہ رہے اور اثر نہ لے۔ ہم کسی ادبی کارنامے کے متعلق یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے ماحول سے جدا ہو کر وجود میں آیا، ہم اس پر مجبور ہیں کہ اس کی بابت تصورات ذہن میں

لاتے وقت یہ ملحوظ رکھیں کہ اس کا مصنف فلاں عہد میں پیدا ہو کر فلاں زمانے میں برسرعروج تھا۔ اس کی شخصیت اس قسم کی تھی، اس کے ماحول میں یہ اجزا شامل تھے، اس کے زمانے میں یہ شورشیں اور یہ تحریکیں برپا تھیں۔ قدیم یونان کے ڈراما نگاروں کے حالات زندگی اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں۔ موجودہ دور کے اسلامی شعراء اس صداقت کے زندہ ثبوت ہیں۔ غرض ہم اس پر مجبور ہیں کہ کسی ادب کے کسی دور کے مطالعہ کے وقت نہ صرف اُس دور کے باکمال اشخاص کے زمانۂ حیات کا بغور مطالعہ کریں، بلکہ اُس دور کے عام اقتصادی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی حالات پر بھی نظر رکھیں، کہ اس کے بغیر ادب کے مطالعہ کے ناکمل اور تشنہ رہ جانے کا امکان ہے۔

(۲)

الفاظ دہلوی اور لکھنوی استعمال کیے جاتے ہیں اُردو شاعری کے دو اہم ادوار کو متمائز کرنے کے لیے، دو مختلف مدارس تخئیل میں امتیاز کرنے کے لیے —— ان دونوں کے مابین تفاوت جو آج کا نہیں کم سے کم ایک صدی پیشتر کا ہے حقیقت میں بڑی حد تک سہولت پر مبنی ہے تاکہ مطالعہ کی خاطر ایک وسیع اور بڑی چیز کو دو تنگ تر اور نسبتًا چھوٹے حصص میں جدا کیا جا سکے۔ اور گو اس میں شک نہیں کہ اس امتیاز کی گنجائش بھی ہے اور ضرورت بھی۔ نیز اگر اس کی صحیح تعبیر کی جائے اور اسے حدود معینہ کے اندر رہنے دیا جائے تو یہ حق بجانب بھی ہے مگر یہ فرق نہ تو اس قدر نمایاں ہے کہ دونوں مدارس شاعری کے مابین ایک واضح خط تقسیم قائم رکھا جا سکے اور نہ اسقدر درست کہ اسے بنیاد سمجھ کر، اس پہ تنقید و تبصرہ کی کوئی عمارت قائم کی جائے۔ کیونکہ اس کی تعیین میں نہ تو اُن ادبی رجحانات کو ملحوظ رکھا ہے جن کے ذریعہ ادب ہر دور میں تبدل اور تغیر ہوتا ہے نہ اُن نازک و لطیف حقیقتوں کا لحاظ کیا گیا ہے جن کے زیر اثر عام تخیلات اور جذبات ارتقا کے منازل طے کرتے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں شاید کوئی ایک ذات بھی ایسی نہ ملے گی جسے ہم بے دھڑک اس تفریق و تفاوت کا کلیتہً ذمہ دار ٹھہرا دیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آج تک کوئی ایک ہستی ایسی نہیں گزری جس نے صاف و صریح لفظوں میں یہ کہا ہو کہ اُردو شاعری کے ہمیشہ سے دو اسکول ہیں ——

دہلی اور لکھنؤ ——— مگر باوجود اس کے ایک طویل مدت سے ہر نقاد اور ہر مبصر کا قلم "ذوقِ شعری" کے سلسلے میں اس امتیاز کی طرف اشارہ کرتا رہا ہے، اور ان میں سے تقریباً ہر ایک نے اس امر کو فرض کر لیا ہے کہ اس امتیاز کی حدیں نمایاں اور اس فرق کی بنیادیں واضح اور مستحکم ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اُن میں سے اکثر نے یہ غلطی بھی کی کہ نقد و نظر کی دُھن میں اور تبصرہ نگاری کے جوش میں یہ تصور کر لیا کہ لکھنؤ کے زمانۂ عروج شاہی میں ماحول وہی تھا جو آج پایا جاتا ہے، کہ جذبات و خیالات کا رجحان اُس دَور میں بھی بجنسہ و بعینہ ویسا ہی تھا جیسا کہ دورِ حاضر میں ہے، کہ اُس عہد کا شعر گو علوم مغربی سے اُسی قدر بہرہ ور، اور تہذیبِ جدید سے اُسی طرح باخبر تھا، جس قدر اور جس طرح عہدِ موجودہ کا سخن سنج ہے، کہ اُس کی نظر میں بھی وہی امعان، اور اُس کے دماغ میں بھی وہی تدبُّر تھا جو ہماری نظروں اور ہمارے دماغوں میں ہے۔ انسان بہر حال و بہر رنگ انسان ہے، بنا برآں فطرتِ انسانی غیر متغیر ہے، لیکن ماحول کا اثر فطرت کے فروعات میں بہت سی تبدیلیاں کرتا رہتا ہے، اگر آج یہ ممکن ہوتا کہ ہم میر و مومن کو دوبارہ عالمِ اجسام میں لا کر اُنکے سامنے دَورِ حاضرہ کی شاعری کے نمونے پیش کر سکتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اُس پر اُسی قدر تحیر و تعجب کا اظہار کرتے جسقدر ناسخ و آمانت در انحالیکہ میر و مومن کے رنگ کو ناسخ و آمانت کے رنگ سے دُور کا بھی نسبت نہیں۔

قبل اس کے کہ اس امتیاز کی خصوصیات پر تبصرہ اور اسکی حیثیت سے بحث کی جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تاریخی اہمیت کی مختصر اً مع وجوہ وضاحت کر دی جائے۔

جہاں تک صنفِ اشعار اور صنفِ جذبات کا تعلق ہے اگر غالب کو نظر انداز کر دیا جائے تو دلی کی شاعری میر کے وقت سے داغ کے وقت تک قریب قریب ایک ہی ڈھچر پر چلی، ماحول سے جذبات پر اثر پڑتا ہے اس لیے جوں جوں دلی کا رنگ بدلتا گیا جذبات و خیالات کے نہج میں تبدیلی ہوتی گئی مگر نظامِ شاعری غیر متغیر رہا، حتیٰ کہ جس نہج پر برسوں پیشتر میر نے شعر کہے تھے، برسوں بعد داغ نے اُسی نہج کی پیروی کی اور گو دونوں کے اندازِ بیان اور حسنِ تخیل میں قطبین کا تفاوت ہے لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظامِ شاعری وہی رہا، اور اس لحاظ سے دونوں میں کوئی ایسا فرق نہیں کہ دلی کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے کی ضرورت پیش آئے — غالب البتہ بجائے خود ایک علیحدہ مدرسۂ شاعری ہے اور اُس کی

شاعری ایک مستقل باب، اور گو اپنے اثرات ابعد کے لحاظ سے وہ دلی کے بقیہ تمام شاعروں سے مجموعۃً زیادہ اہم ہے مگر دلی کے رنگِ شاعری پر بحث و تمحیص کرنے کی غرض سے اُسے فی الحال نظرانداز کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔

دلی کی شاعری کا پہلا مستقل باب گو حاتم، آرزو، ناجی، مضمون اور آبرو وغیرہ سے شروع ہوتا ہے مگر نفس الامر میں میر و سودا کو سرآمدِ شاعرانِ دہلی تسلیم کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ حاتم، آرزو وغیرہ کا دور تاریخی حیثیت سے اُردو کی تدریجی ترقیوں کی منزل کا ایک نمایاں نشان ہے لیکن اُردو شاعری کے دہلوی مدرسہ کی سب سے بڑی ترقی کے زمانہ کی ابتداء میر و سودا اور اُنکے معاصرین ہی کے عہد سے ہوتی ہے، جس میں "محبوبۂ شاعری مع اپنی تمام کرشمہ سازیوں کے الفاظ و خیالات سے آراستہ و پیراستہ ہو کر دنیا کے سامنے نمودار ہوئی"۔ اس دور میں گو زبان صاف ہوئی بہت سے خوبصورت اور مناسب الفاظ اور محاورے، فارسی سے بجنسہٖ اُردو میں داخل کر لیے گئے، حسن و عشق کے معاملات حُسن و اثر کے ساتھ نظم ہونے لگے، نقائص و معائب سے کلام پاک ہونے لگا، غزلیں کانوں کو بھلی معلوم ہونے والی بحروں میں کہی جانے لگیں نئے نئے اصنافِ شعر رائج ہوئے، زبان میں وسعت اور لوچ پیدا ہوا، حسنِ وجوہ پیدا ہوئے، بایں ہمہ یہ دور وہ دور تھا جس میں زبان نہ پوری طرح سلجھی ہوئی تھی نہ شستہ، متروک اور غیر مستعمل الفاظ بے دھڑک استعمال کیے جاتے تھے، کسو، کبھو، تم، سوں، آئیاں، بلا تکلف اشعار میں نظم ہوتے تھے، پست خیالات کے ساتھ بلند خیالات ملے جلے ہوتے تھے، غزلوں میں شترگربہ اور ناہمواری، دونوں عیوب بدرجۂ اتم نظر آتے تھے [گو سودا کا کلام ایک حد تک اس قسم سے بری ہے] مبتذل اور فحش الفاظ کا استعمال بے غل و غش جاری تھا، تذکیر و تانیث میں اختلاف اور ہٹ دھرمی نمایاں تھی؛ چونکہ اندوہ و حرماں، یاس و غم، کے جذبات دلوں پر مسلط تھے اس لیے اشعار میں دلگدازی اور سوز زیادہ واضح ہوتے تھے، فلسفہ، حکمت، سائنس، مابعد الطبیعیات، کسی سے گویا کوئی تعلق نہ تھا گو نفسیات کے نمونے جابجا، اور صحیح فطرت انسانی کے جیتے جاگتے مرقعے جگہ جگہ نظر پڑتے ہیں، فارسی ترکیبیں نسبتاً کم استعمال ہوتی تھیں اور اغلاق و غلو معیوب سمجھے جاتے تھے، تا ایں کہ یہ اثرات غالب اور مومن کے زمانہ تک باقی رہے، اور یہی بڑا سبب تھا کہ ان دونوں باکمالوں کی خاطر خواہ منزلت نہیں ہوئی۔ اجمالاً ہم ذیل کے چند اشعار کو اس دور کی شاعری کا صنعتی نمونہ تصور کر سکتے ہیں

میر (۱) خون ہر اک حرفِ شوق سے ٹپکے تھا لیے   وہ نہ سمجھا کہ مرے نامے کا مضموں کیا ہے
" (۲) سرہانے میر کے آہستہ بولو   ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میر (۳) پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

" (۴) کہتا تھا کسی سے کچھ تکتا تھا کسی کا منہ — تھا میر کھڑا یاں پر سچ ہے کہ دوانا تھا

" (۵) افسوس ہم کہ منتظر اک عمر تک رہے — پھر مر گئے ترسے تئیں اک بار دیکھ کر

درد (۶) شیخ کعبے ہو کے پہونچا ہم کنشتِ دل میں ہو — درد منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا

یقین (۷) جب دیکھتا ہوں تجھ کو تنہا سجن چمن میں — کس کس طرح کی باتیں آتی ہیں میرے من میں

سودا (۸) کہے تھا ریختہ کہنے کو عیب نادان بھی — سو یوں کہا کہ میں دانا لگا ہنر کہنے

" (۹) بہنا ہماری چشم کا دستور ہو گیا — دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا

" (۱۰) کل حضرت سودا کو سنا بولتے یاراں — اللہ رے اللہ رے کیا زورِ بیاں ہے

میر و سودا اور انکے معاصرین کا زمانہ ختم ہو کر دلی کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں مصحفی، جرأت، انشا، اثر، میر حسن، راسخ، بقا، حسرت، رنگین وغیرہ شامل ہیں۔ اس عہد میں بھی عہد ماقبل کے عیوب و محاسن برابر پائے جاتے ہیں۔ البتہ ایک ترقی یہ ہوئی کہ میر و سودا کے زمانہ کے پرانے متروکات کو نکال کر انکے بجائے جدید الفاظ اور نئی اور اچھوتی ترکیبیں زبان میں داخل کر دی گئیں، ہندی اور فارسی محاورے آپس میں ملا دیے گئے، طرزِ عبارت اور مضامین میں کوئی خاص جدت نہیں پیدا ہوئی مگر ابتذال ترقی کر گیا۔ اس دور کی شاعری اُس زمانہ کی دہلوی سوسائٹی کا صحیح نمونہ ہے، معشوق کے حسنِ ظاہری کی تعریف، بند بند الفاظ میں نہیں بلکہ کھلم کھلا، ریختی گوئی وغیرہ وغیرہ کا وجود اسی عہد سے پڑتا ہے اور اگر ہم بغور دیکھیں تو ہم کو اسی عہد سے آئندہ کے ایک عہد کی خبر ملتی ہے جو داغ دہلوی کے دور میں جا کر معراجِ کمال کو پہونچا، اُس عہد کے جراثیم اسی مصحفی اور جرأت کے دور میں وجود میں آچکے تھے، اور یہی جراثیم تھے جنھوں نے کامل نشوونما پا کر دلی کے آخری دور میں داغ سے ایسے شعر کہلوائے

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک — مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں (داغ)

مصحفی وغیرہ کا دور دیکھ کر کسی شخص کے وہم و گمان میں نہیں گزرتا ہوگا کہ اس دور کے بعد ایک ایسا دور عالمِ وجود میں آنے والا ہے جس میں اس دور کا خاکہ بھی نہیں نظر آئے گا۔ یہ دور دلی کی شاعری کا تیسرا دور تھا جس کی ابتدا غالب، مومن، ذوق، نصیر، حقیر، عیش اور ظفر سے ہوتی ہے، جیسا کہ میں اس سے قبل لکھ چکا ہوں، باستثنائے غالب کے اس عہد میں بھی نظام شاعری میں کوئی فرق نہیں ہوا، اور گو شاعریت کو اور بھی ترقی ہوئی اور ہندی کے رہے سہے الفاظ بھی نکل گئے مگر اس دور کے شعرا کے نظریوں میں بھی کوئی بیّن

تفاوت صنفِ جذبات کی حد تک نہیں ہوئے ——— اس دور کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت اسکے تین عظیم ترین اساتذہ ——— غالب، مومن، ذوق ——— کی "سہ رنگی" ہے، تینوں نے اپنے اپنے لیے شعر گوئی کی نئی راہیں تلاش کرلیں، جس نے انھیں قدما اور متاخرین دونوں سے ممیز کردیا، لیکن غالب کے سوا کسی اور کا "نظریۂ شاعری" نہیں تبدیل ہوا ——— مومن نے جدا رنگ اختیار کیا، ذوق نے الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائی، نصیر نے علیحدہ طرز نکالا، مگر مومن، ذوق اور نصیر تینوں کی شاعری شعر کے ارتقاء کا باعث نہیں ہوئی اور اس کا سبب یہی تھا کہ تینوں کے کلام میں باوصف اوروں سے ظاہری فرق کے اصول اور نظامِ شاعری وہی رہے جو دوسرے اساتذہ کے تھے

مومن (۱) بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے	اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں
" (۲) کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے	کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
ذوق (۳) یوں لائے واں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈھ کر	دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا
" (۴) کیا جانے کیا شک ہے اُسے میری طرف سے	جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا
نصیر (۵) ہنسے ہے کوٹھے پہ میرا یوسف میں زیرِ دیوار رو رہا ہوں	عجب تماشا ہے دیکھو لوگو فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

اس وقت لکھنؤ کا ناسخی رنگ شعر گوئی اپنی داغ بیل ڈال چکا تھا، اس رنگ کے اثرات عالمگیر اور متعدی تھے یہی سبب تھا کہ ذوق، نصیر، مومن، حتیٰ کہ غالب بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان سب کے کلام میں بھی کہیں کہیں اُس رنگ کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے

مومن (۱) غیر کے لکھنے کو تم نے کیا تراشی ہے قلم	ورنہ میرے استخواں کیوں ہوگئے قفلگیر سے
" (۲) زہر نوشِ غمِ شیریں نے کہا خسرو سے	تلخیِ مرگ میں شکر کا مزا ہوتا ہے
" (۳) اس شکر سے گر آنکھ لڑی ہے کہ حباب	کیسے کچے گھڑے پانی پہ جو بھرتے ہیں
غالب (۴) مرنے کے بعد بھی نہ گئی بانکپن کی شان	تختے پہ بہرِ غسل لٹایا اکڑ گئے
ذوق (۵) کھینچے دلِ انساں کو نہ وہ زلفِ سیہ فام	اژدر اگر انساں کو نگل جائے تو اچھا
" (۶) بتوں کی سرد مہری نے کھلادی زعفراں لیکن	کرے کیا گر مجوشی ہو گیا کشمیر دل میرا
داغ (۷) آنسو بہا رہا ہوں خطِ شوق پڑھ کے میں	یوں ڈالتا ہوں دانہ کبوتر کے روبرو
" (۸) تلخیِ موت کو فرہاد کی وہ کیا جانے	منہ سے شیریں کے ابھی دودھ کی بو آتی ہے

ذوق: زبان پر قدرت اور محاورات اور امثال کی بندش و استعمال کی حد تک کیا دلی اور کیا لکھنؤ سب جگہ آپ اپنی نظیر ہیں اور اُن کی شاعری کا اخلاقی پہلو یقیناً اس لایق ہے کہ اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔
اس دَور کی اہم ترین خصوصیت فارسیت کا مکمل غلبہ ہے، اس کا بڑا سبب اس عہد کے اساتذہ کی مکمل زباں دانی تھی، مومن اور غالب فارسی کے جید عالم اور شاعر تھے۔ نازک خیالی، بلند پروازی، صحیح جذبات کی صحیح لیکن غیر معمولی ترکیبوں سے نگارش، جدتِ تخیل، جدتِ تشبیہات و استعارات، یہ چیزیں اس دور میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ معمولی سے معمولی واقعات کو، پامال سے پامال خیالات کو ایسے اسلوب سے بیان کرنا کہ وہ بہت غیر معمولی اور مرتفع ہو جائے، اس عہد کے سخنوروں کا شعار تھا، خصوصاً غالب جن کی طبیعت کا ایک جزو مشکل پسندی، معنی آفرینی، اور عام طرز نگارش سے علیحدگی تھی، وہ دلی جذبات کے ادا کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور فلسفہ اور حقیقت طرازی ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ غالب سے کم۔ لیکن پھر بھی غیر معمولی حد تک، یہ اوصاف مومن، ذوق وغیرہ میں بھی موجود تھے۔ القصہ دلی کی شاعری کا یہ دَور تمام ادوار ما قبل و ما بعد سے بالکل جدا اور نرالا تھا اور یقیناً سب سے زیادہ زریں اور درخشاں۔
دلی کی شاعری کا آخری دور داغ، مجروح، ظہیر اور انور وغیرہ کا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں شاعری کی بالکل کایا پلٹ ہوگئی۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوا۔ اس غلط فہمی کے دو وجوہ تھے، پہلی وجہ داغ کا امتیازی طرز شعر گوئی جس نے عام طور سے لوگوں کو اس دھوکے میں مبتلا کردیا کہ اس دَور میں اردو شاعری کا دلی اسکول ایک اور ڈھنگ پر گامزن ہے۔ دوسری وجہ اُس زمانے میں لکھنؤ کی انتہائی پستی اور سوقیت تھی، جس کے مقابلہ میں عوام کا یہ باور کرلینا کہ دلی کے رنگ میں ایک غیر معمولی تغیر ہوا ہے، کچھ زیادہ بعید از امکان نہیں معلوم ہوتا۔ اس دَور کی سب سے اہم امتیازی خصوصیت طرز ادا کی چستی، تخیل میں راز و نیاز، معاملہ بندی، بانکپن، اور انداز بیان میں بیساختہ پن کی فراوانی ہے۔ اس قبیل کے نمونے داغ اور انور کے یہاں بہت ملیں گے اور واقعہ یہ ہے کہ صرف انھیں دو اشخاص کو اس عہد کی شاعری کا علمبردار سمجھنا چاہیے، ظہیر، مجروح وغیرہ نہ اس قدر سر برآوردہ ہیں نہ اس درجہ قابل تحسین اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان دونوں میں نہ داغ کا سا حسن بیان ہے نہ انور کا سا علوے تخیل۔

داغ
(۱) دے پی تو سہی تو بہ بھی ہو جائیگی ناصح — کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی
(۲) خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا — جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
(۳) ڈر گئے نام شفا سُنکے نہ تھے خواہش مرگ — مُنہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا

انور
(۴) نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے — پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

انور (۵) یہ از خود رفتگی صرف اس لیے ہے کہ تم مجھ سے کبھی پوچھو کہاں ہو

اس دور میں دلی کی شاعری سے بھی حقیقی شعریت اور الہامی آتش گویا کہ مفقود ہو چکی تھیں، اور شعرگوئی محض ایک مشغلہ اور بہیمی جذبات کے اظہار کا ذریعہ رہ گئی تھی، عریاں جذبات کی نگارش، مخرب اخلاق انداز بیان، اس عہد کی عظیم ترین خامیاں ہیں لیکن ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اس دور کی شاعری نے ملک کے عام جذبات کی بیداری میں جو حصہ لیا وہ دلی کے کسی اور دور شاعری سے نہیں منسوب کیا جا سکتا۔

یہ مسئلہ تو آج تک طے نہیں ہو سکا کہ اردو کی خدمت کرنے کا سب سے زیادہ فخر کس خطۂ ہندوستان کو حاصل ہے دلی والوں کو اصرار ہے کہ اردو کی داغ بیل یہیں پڑی، یہیں اس کی پرورش و پرداخت شروع ہوئی، اس لیے دلی کو اردو کے سب سے بڑے خدمتگزار کہلانے کا حق حاصل ہے۔ دکن کا یہ ادعا ہے کہ اردو ادب کی ابتدائی نشوونما کا غیر فانی فخر اسکو حاصل ہے اس لیے وہ اردو کے سب سے اہم خدمتگزار کہلانے کا مدعی ہے۔ اودھ مدعی ہے کہ جتنا اس نے اس زبان کو سنوارا اُتنا سنوارنا کسی اور حصہ کی قسمت میں نہیں آیا، اس وجہ سے اُسے اس کا حق حاصل ہے کہ اپنے آپ کو اردو کا عظیم ترین خدمتگزار کہلوائے۔ پنجاب اپنی جگہ پر اسی قسم کے دعاوی پیش کر کے اپنا حق جتاتا ہے۔ بہرحال جھگڑا یہاں دلی اور لکھنؤ میں ہے اس بنا پر پنجاب اور دکن کو دائرۂ بحث سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ اب رہ گئے لکھنؤ اور دلی، ظاہر ہے کہ دلی کو اردو کا پودا لگانے اور اور اس کی ابتدائی آبیاری کرنے کا فخر ملتا ہے۔ اس جگہ یہ امر فراموش نہ کرنا چاہیے کہ جس دلی کے سر اردو کی واقعی خدمت کرنے کا سہرا ہے وہ دلی اکبر، اورنگ زیب، اور محمد شاہ رنگیلے کی دلی نہیں تھی بلکہ وہ دلی تھی جہاں نام نہاد بادشاہ، بے تخت و تاج فرماں روا، سر پر آرائے حکومت تھے، دولت و ثروت مٹ چکی تھی، حکومت و سلطنت، خواب ہو چکی تھی، عروج کے افسانے اور کمال کی داستانیں محض خیال رہ گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ عوام الناس کے دل درد و غم سے لبریز تھے، بیباک کے دماغ حزن و ملال کے ہنگاموں سے پُر تھے، آنکھیں اقتدار و جلال کے نظارے دیکھنے کی ہوس میں نم تھیں، اس حالت میں دلی نے طفل اردو کو گود میں لیا اور اس کی تربیت اور پرورش شروع کی۔ حاتم و آرزو، میر و سودا، درد و سوز، تاباں اور یقین، ان سب نے جب اس بچے کی نگہداشت و پرداخت پر کمر باندھی تو دلی کی تباہی اور بربادی عبرت کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ ماحول کا اثر مسلّم ہے، گرد و پیش کے تاثرات یقینی ہیں، جو جذبات دل میں آتے وہ درد و غم کے مرقعے، جو خیالات دماغ میں پیدا ہوئے وہ حزن و الم کے مجسمے، جو احساسات قلب میں رونما ہوئے وہ سوز و ساز کی جیتی جاگتی تصویریں، نہ کھانے کا ٹھکانا تھا نہ پینے کا سہارا، ایک وقت کے بعد دوسرے وقت کی روٹی کی امید مشکل سے بندھتی تھی۔

مصحفی و حسرت، جرأت و انشا، راسخ و رنگین، انھوں نے جب اس بار کے اُٹھانے کی حامی بھری تو حالت اور بھی بد سے بدتر تھی، غالب و مومن، ذوق و نصیر کا عہد آیا تو غدر نے رہی سہی آبرو بھی کھو دی، سامانِ خورد نوش تک کی دقت ہونے لگی - اس سب پر طرہ "دلی کی گلیاں" اس قدر عزیز تھیں کہ "دکن کی قدرِ سخن" انکے سامنے گوارا نہیں ہوئی - عیش و عشرت سے دُور، رنگ رلیوں سے جدا، حزن و ملال کی تصویر، درد و الم کے نام لیوا، فکر و تردد کے بندے، خوشی و مسرت کے گمان سے معرّا، خود غرض دنیا نے مجبور کر کے کہا "میرا مطالعہ بغور کرو" ایسی صورت میں بھلا عیش و عشرت کے نغمے کیا کانوں میں آتے، رنگینیوں اور سرمستیوں کے ترانے کیا گوشزد ہوتے - لامحالہ سوز و گداز کا دور دورہ ہوا، خیالات ستھرے، سچے، پاکیزہ، اور صلیت و واقعیت سے لبریز ہونے لگے، صدمات و آلام جس قدر جلد انسان کو مجاز سے نکال کر حقیقت تک پہونچا دیتے ہیں مسرت و آرام نہیں کر سکتے، دلی والوں کے شعر خنجر و نشتر بن کر چلے اور تیر و تفنگ بن کر دلوں میں اُتر گئے، کہنے والے اور سننے والے، دونوں ایوانِ حقیقت کی خبریں لانے لگے، معرفت کا ذوق و شوق عام و خاص سب کے رگ و پے میں سرایت کر گیا، اور اہلِ دہلی کے ترانوں کو قبولِ عام و بقائے دوام کا خلعت عطا ہو گیا -

اس حالت میں لکھنؤ کی عروسِ خوابیدہ نے انگڑائی لے کر آنکھ کھولی، طفلِ اردو دہلی میں فقدانِ سامانِ پرورش سے ناتواں اور مریض تھا، ہمک کر نازنینِ لکھنؤ کی جانب ہاتھ پھیلا دیے، زیورِ عیش سے آراستہ، سامانِ تعیش سے پیراستہ، امارت سے سجی، دولت و ثروت سے سنوری ہوئی دُلھن مسکرائی اور طفلِ اردو کو گود میں لے کر سینے سے لگا لیا ——— لکھنؤ کے عروج کا زمانہ، سامانِ تعیش کی ارزانی، گلی گلی کوچہ کوچہ رشکِ ایوانِ سلیمانی، راحت و آرام کا دَور دَورہ، دولت و مسرت کا ہر سمت شہرہ، روح فکرِ دو عالم سے آزاد، دل قیودِ دنیوی سے چھوٹ کر شاد ——— کنگھی چوٹی کے تذکرے، زلف و خال کا ذکر، چوک کی طوائفوں سے صحبت، دربار کے خواجہ سراؤں سے رسم و راہ، خیالات سیاہ کاری کا مجسمہ، جذبات عیاشی کی تصویر، احساسات تصنع اور تعلقات بیہودگی کی نمایش، کھانے کی اشیاء کی افراط، پینے پلانے کی چیزوں کی بہتات، تن کی آرایش و زیبایش کے سامان وافر، استغنا، بے فکری، بیکاری کی بدمستیاں دن عید رات شب برات

چاندنی ہے سایۂ دیوارِ قیصر باغ میں

دلوں میں درد و گداز کا نام نہیں، دماغوں میں سوز و ساز کا شائبہ نہیں، اس لکھنؤ میں میر و سودا، مصحفی و انشا، جرأت و رنگین، پریشاں حال، خستہ نوال، دہلی سے آئے، طبیعتیں بدستور، شخصیتیں برقرار، لامحالہ جذبات و احساسات کا بھی اگلا ہی سا رنگ رہا، کلام اور اشعار میں کوئی نمایاں تغیر و تبدل نہیں رونما ہوا۔

لیکن آثار جبھی سے بدل گئے، رُخ اُسی وقت سے پھر گیا، یہ تبدیلی غیر متوقع نہیں تھی، دلّی کے سرمایۂ ادب میں اسکے آثار ملنے لگے تھے اور یہ واضح تھا کہ وہ کون سا رخ ہے جدھر یہ کشتی بہ رہی ہے، حتیٰ کہ میر و سودا اور ان کے معاصرین کے آخری عمر کے کلام میں اس کے نمونے ملتے ہیں

میر (۱)	نازکی اُن لبوں کی کیا کہیے	پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
"	میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں	ساری مستی شراب کی سی ہے
سودا (۲)	غنچے سے مسکرا کے اُسے زار کر چلے	نرگس کو آنکھ مار کے بیمار کر چلے
" (۳)	کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوداؔ	ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
ضیا (۴)	صاف تھا جبتک تو ہمکو بھی جواب صاف تھا	اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آئیگا

لکھنؤ میں آکر جب ان شاعروں نے آزادی سے میدان شاعری میں قدم رکھا تو اُس وقت رنگ محفل، یہ پایا کہ کوئی دل اور کوئی داغ، سوز و گداز سے آشنا نہیں، خود تو دل حسرت و یاس کے مرقعے دیکھتے دیکھتے، اندوہ و حرماں کے ترانے سنتے سنتے تنگ آ ہی چکا تھا، جادو ٹوٹا، اور بندھے دریا کا سیلاب، سب کچھ بہاتا ہوا لیگیا۔ اور وہی دلی کے مصحفی و انشا لکھنؤ میں آکر ایسے عیش و عشرت کے بندے ہوئے کہ اُنکے ڈھونگ کے افسانے آج تک زبانوں پر باقی ہیں۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی، مذاق، دلچسپی، غرض کون سی ایسی چیز تھی جو اِن لوگوں میں نہیں پیدا ہوئی، گر با اینہمہ جبلّی مذاق کلّیۃً مفقود نہیں ہوا تھا، اور جب مصائب نے پھر اپنی آماجگاہ بنایا تو انھیں اصحاب کے قلم سے یہ شعر بھی نکلے

انشا (۱)	نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی	تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
" (۲)	کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے ہمیں انشاؔ	غنیمت ہے کہ ہمصورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں
مصحفی (۳)	حسرت پہ اُس مسافرِ بیکس کی رو یئے	جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
" (۴)	شاہد رہیو اے شبِ ہجر	جھپکی نہیں آنکھ مصحفیؔ کی

اُردو کے تقریبًا تمام نقادوں اور تبصرہ نگاروں سے یہی چُوک ہوئی کہ اُنھوں نے اس "ہجرت شاعری" کی تحقیق کو "تنقید" کی دُھن اور "تبصرہ نگاری" کے انہماک میں نظر انداز کر دیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دلی اور لکھنؤ کے ارتباط سے جو جراثیم پیدا ہو چلے تھے، وہ اُنکی نظروں سے مستور رہے۔

یہ دَور لکھنؤ کی شاعری کا پہلا دَور تھا جس میں لکھنؤ کی شاعری بھی دلی سے کچھ ایسی علٰحدہ نہیں تھی۔

اس لکھنؤ میں ناسخ نے آنکھ کھولی، اس ماحول میں آتش نے ہوش سنبھالا، اور انھیں اثرات کے تحت اُنکے دوسرے ہم عصر شعرا کی پرورش ہوئی اور اُنکے مذاق سلیم کی تجنگی عمل میں آئی۔ یہ دَور لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا دَور تھا، جو دلی کے دَورِ دوئم سے اس لیے زیادہ اہم ہے کہ یہاں سے لکھنؤ کا نظام شاعری بدل کر ایک مختلف اسکول کی بنا پڑی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہیں سے دلی اور لکھنؤ کے علٰحدہ علٰحدہ مدارس شعرگوئی کی بنیاد پڑتی اور یہیں سے دونوں میں فرق کا آغاز ہوتا ہے۔ ناسخ پہلے شخص تھے جنھوں نے اس کا ادراک کیا کہ اساتذۂ دہلی نے جوہر تخئیل اور علاوہ جذبات کی خاطر، زبان کی ندرتوں اور قواعد کی لطافتوں کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے، اُنھیں اس کا احساس ہوا کہ اب "شاطگانِ اُردو" کا فرض زبان کی صفائی، محاورات کی تصحیح، الفاظ کی تزئین، اور متروکات کی ناسخیت ہونا چاہیے، ہر قوم اور ہر ملک کے سرمایۂ ادب میں کم سے کم ایک جزو ضرور ایسا ہونا چاہیے جو قواعد کا ساتھ دے سکے، جس کی پشت پناہی پر صرف و نحو کی تدوین کی جا سکے۔ جیسے ادبی اصولوں کی ترتیب کی تائید میں استعمال کیا جا سکے۔ اور ناسخ کو یہ فخر حاصل ہوا کہ تکمیل زبان کے آخری مدارج اُنھیں کے مبارک ہاتھوں سے پورے ہوے، اُنھوں نے شعرگوئی کے مسلّم اصولوں سے انحراف کرکے شائستگی زبان و الفاظ کے لیے تخئیل کی قربانی گوارا کی، فضول مبالغے، جذبات واقعی کی، تکلف و تصنع کے طعنے سنے مگر جس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا اُس سے قدم نہ ہٹایا، اور اسی جگہ اُن کی بے خوفی اُنکی عظمت اور ذہانت کی ضامن ہے، اسی نوع کی بے جگری اور ذمہ داری کامیابی کا پہلا زینہ ہوتی ہے۔ ناسخ نے زبان کی آرائش کو اپنا مطمح نظر قرار دے کر بغیر کسی ڈر اور جھجک کے اُسکی زیبائش کی ابتدا کی اور لکھنؤ جس کو ناسخ کے ذریعہ اُردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار جگہ حاصل ہوئی تھی زبان کی درستگی کی سعی میں اُن کا ہم نوا ہوگیا۔ لکھنؤ اس طرح وہ خطہ بنا جہاں سے اُس تہیج (Impulse) کا پہلا ریلا آیا جس نے بعد کی نسلوں کو اس کا احساس کرادیا کہ شعرگوئی کے ذریعہ ادب کی خدمت اور پہلوؤں پر بھی ہو سکتی ہے، لکھنؤ کے اس دورِ دوئم نے ادب کے خدمت گزاروں کی آنکھیں کھولیں اور ایک نئی اور جدید راہ بتائی جس پر اُس وقت کے دوسرے باکمال بڑے ذوق شوق سے گامزن ہونے لگے۔ اس دور کے بھی ابتدائی اشعار میں دہلوی رنگ کی آمیزش ہے اور ابھی تک وہ سوقیت یا پستی نہیں پیدا ہوئی تھی جس نے آگے چل کر موجودہ نقطۂ نگاہ سے لکھنؤ کو قعرِ مذلت میں پھینکدیا، اس عہد کے مذاق کے بہترین نمونے جنھیں اس زمانے کا خاص رنگ تصور کرنا چاہیے ذیل کے اشعار ہو سکتے ہیں

اسیر (۱) خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دُنیا — ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

〃 (۲) دل کو نالوں کی دمِ نزع ہوس باقی ہے — منزل آخر ہوئی فریادِ جرس باقی ہے

ناسخ (۳) ابر رحمت سے تو محروم رہی کشت مری　　کوئی بجلی ہی فلک تو نے گرائی ہوتی
آتش (۴) یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا　　رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا
" (۵) یہ کیفیت اُسے ملتی ہے جو جس کے مقدر میں　　مے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں

بہت ممکن ہے کہ اس "اعتدال" کا بڑا سبب آتش کا وجود ہو، آتش کی شخصیت بے شبہ لکھنؤ کی صف شعرا میں سب سے زیادہ باعظمت اور وقعت سمجھی جانی چاہیے، حقیقت میں آتش "اجتماع الضدین" کا ایک بہت عمدہ نمونہ تھے، بذات خود اُن کے جذبات کا رُخ دلی کے رنگ شاعری کی جانب [illegible] تھا، اور اس میں ذرا سا بھی شک نہیں کہ وہ قدرت کی جانب سے غیر معمولی شاعرانہ دل و دماغ لائے تھے، خدا نے انکو "گداز دل" اور "بلند خیال دماغ" ودیعت کیے تھے اور اُنکے کلام کے متعلق امیر مینائی مرحوم کی یہ تنقید کہ اُنکے اشعار میں "بسی ہوئی بجلیاں" ملی ہوتی ہیں، بالکل صحیح ہے، مگر کچھ تو اُنکی خلقت میں تھا کہ زبان کی صفائی اور چستی کی طرف بھی توجہ کریں، اور کچھ اپنے ماحول کے اثر سے بھی وہ خاص طور پر مرعوب ہوے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنکی شخصیت اور اُنکی ذات میں شعریت کا ایک ایسا مکمل نمونہ نظر آتا ہے جس کی نظیر لکھنؤ میں کہیں اور نہیں ملتی، کبھی اُن کا دماغ اور تخیل اُن نازک حقیقتوں کی جانب رہنمائی کرتا ہے جو دلی کے بہترین سخنوروں کے ثمرۂ تخیل سے بھی ارفع و اعلیٰ ہیں اور کہیں خالص ناسخیت غالب دکھائی دیتی ہے، میرے خیال میں اس "تنوع" کا بڑا سبب یہ ہے کہ آتش کو مصحفی سے تلمذ حاصل تھا

آتش (۱) آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوے　　میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
" (۲) کوچۂ یار میں سائے کی طرح رہتا ہوں　　در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس
" (۳) نقش پاے رفتگاں سے یہ صدا ہے آرہی　　دو قدم میں راہ طے ہے شوق منزل چاہیے
آتش بزنگ ناسخ (۵) صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی　　سا کھو جلا ہے کیا کیا پھولا جو ڈھاک بن میں
(۵) سجدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو　　شمع نے آگ رکھی سر پہ قسم کھانے کو

لیکن آتش کا سب سے زیادہ امتیازی اور قابل افتخار کلام وہ ہے جس میں علو ے تخیل اور رفعت جذبات کے ساتھ ساتھ زبان کی چستی، بندش کی صفائی، طرز ادا کا اچھوتا پن، اور انداز بیان کی پذیرائی بھی بدرجۂ اتم نمایاں ہے

آتش (۱) چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ　　ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

۳۶۹ھ

" (۲) بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
" (۳) پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا — زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

لکھنؤ کی شاعری کا دَورِ سوم جو آتش و ناسخ کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا، اُنکے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کا زمانہ ہے، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کسی مخصوص طرزِ ادا یا کسی خاص راہِ سخن کے موجد کے پیرَو اور متابعین اُس موجد کے رنگ کو کمال تک پہونچانے کی دُھن میں اُس رنگ کی اصلی روح کو نظر انداز کرکے اُسے انتہا (Extreme) تک پہونچا دیتے ہیں اور اس سعی و کاوش میں اُس مخصوص رنگ میں تصنع اور تکذیب پیدا ہو جانا کچھ بعید از قیاس امر نہیں۔ وزیر، رند، صبا، برق، رشک، قلق، حکیم، نسیم، امانت، ان سب نے یہی غلطی کی کہ بغیر سوچے سمجھے نہ صرف ناسخ کی تقلید کی کوشش کی بلکہ ناسخ اور آتش کے رنگوں کی آمیزش کرنا چاہی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس دَور کی شاعری نہ محض دلّی سے بالکل علٰحدہ ہو گئی بلکہ ناسخ اور آتش کی شاعری سے بھی مختلف رہی، حتیٰ کہ خود ناسخ بھی ایک حد تک اُس سے متاثر ہوئے اور اُنکے آخری زمانے کے کلام کو اُنکے مقلدین کے کلام سے ممتاز نہیں کیا جا سکتا، اس وقت شاعری محض الفاظ کا گھروندا، صرف صنایع و بدایع کا طلسم، ہو کر رہ گئی، اور اُس میں سے روحِ جذبات، چاشنیِ تخیل، اسی طرح مفقود ہو گئے جس طرح امیر خسرو یا ذکی کے کلام سے زبان کی صحت و سلاست، یہ دَورِ لکھنؤ کی شاعری کا سب سے پست اور سب سے ردی دَور تھا اور اس عہد کے اشعار خشک، بے مزہ، اور لفظوں کا گھروندا ہیں

امانت (۱) آنسو رواں ہیں زلفِ سیہ کے خیال میں — موتی پرو رہا ہوں ترے بال بال میں
" (۲) فی سبیل اللہ پانی انکو دوا سے آبلو — کانٹے اب دیکھے نہیں جاتے زبانِ خار کے
وزیر (۳) نہانے میں جو لہراتی ہے زلفِ یار دریا میں — تڑپنے لگتی ہیں پانی پہ موجیں مچھلیاں ہو کر
بحر (۴) کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلبروں نے کی — پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح
ناسخ (۵) بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر — دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰ مار پر

رند، وزیر، امانت وغیرہ کے عروج کا زمانہ پھیکا پڑا اور ان کی جگہ انکے شاگردوں نے لے لی، وہ بھی اسی ماحول کے تربیت یافتہ، اور اسی ذہنیت کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ ناسخ کے عروج اور ہر دلعزیزی کے افسانے کانوں میں گونجتے ہوئے، اس پر طرہ انیس و دبیر کی معرکہ آرائیوں کی صحبتیں آنکھوں سے دیکھی ہوئی،

زبان کی سلاست اور صفائی کا جنون اب تک دماغوں پر مسلط تھا، اور یقین کیجیے کہ لکھنؤ کی شاعری اسی مقام پر رہتی اگر زمانہ پلٹا نہ کھاتا، مگر دفعتًا انقلابِ عظیم ہوا اور لکھنؤ کی سلطنت ختم ہو گئی۔ اس دھچکے سے ابھی "اختر نگر" نہیں سنبھلا تھا کہ غدر نے اور رچر کا دیا، جس چیز نے دلّی کے دل کو "گداختہ" بنا دیا تھا وہی لکھنؤ میں بھی آئی، رامپور بسا اور پھر ایک بار دلّی اور لکھنؤ کے سخنور یک جا ہوے، اُن سے خلا ملا ہوئی، کچھ تو دل دُکھے ہوئے تھے ہی، سونے پر سہاگا دلّی والوں کا دلکش اور دلپذیر کلام دیکھا، غیر ارادی طور پر مذاق اور طبیعت میں تغیر پیدا ہوا، یہ دور آمیر، جلال، بحر، تسیر، وغیرہ کا ہے ——— لیکن دل ابھی تک دلّی والوں کے سے نہیں ہوے تھے، پھر ناسخ اور اُنکے مقلدین کو بھی کچھ ایسا عرصہ نہیں گزرا تھا، غلبہ پُرانے رنگ ہی کو رہا۔ اس دَور میں جو لکھنؤ کی شاعری کا چوتھا دَور تھا، امیر مینائی مرحوم کی ہستی سب سے زیادہ ممتاز تھی، اور شاید اُنکے دادا اُستاد مصحفی کا فیض تھا کہ اُنکا کلام اُس وقت بھی اور شعرا کی بہ نسبت دلی والوں سے زیادہ ملتا تھا، امیر مرحوم، علم و فضل، جوہرِ کمال، قادر الکلامی اور ریختہ گوئی کے ساتھ ساتھ ازل سے دلِ درد آشنا لائے تھے، صحبتیں صحیح نہ ملنے کے باوجود اُن کا کلام ابتدا ہی سے اپنے میں سوز و گداز کے نشتر پوشیدہ رکھتا تھا اور اس کا علم بہت لوگوں کو ہے کہ اُن کا غدر سے پہلے کا کلام جو تلف ہو گیا، اہلِ دہلی کے کلام سے اس درجہ مشابہ ہے کہ بادی النظر میں تمیز کرنا وقت طلب ہوگا۔

(۱) جتنا جی چاہے ستا لے ستم ایجاد مجھے　　مرغِ تصویر ہوں آتی نہیں فریاد مجھے
(۲) مدت سے آمیر اُسکے ملنے کی تمنا تھی　　آج اُس نے بُلایا ہے ملنے کو قضا آئی

رامپور بھی بگڑ گیا اور گلستانِ سخن کے عنادل کو از سرِ نو فکرِ نشیمن ہوئی، کچھ بلبلوں نے "باغِ دکن" میں "دامنِ دولتِ نظام" میں پناہ پائی اور دائرہ مکمل ہو گیا

تھی ابتدا جہاں سے وہیں انتہا ہوئی

داغ یہاں آئے اور خوب چمکے، امیر مینائی بھی یہاں پہونچے اور پیوندِ خاک ہو گئے

دل کی دل ہی میں رہی حسرتِ پرواز چمن　　ابھی کلیاں بھی نہ پھوٹی تھیں کہ صیاد آیا

انگریزوں کا ہند پر تسلط مکمل ہو گیا، مغربی خیالات دلوں میں گھر کرنے لگے، لکھنؤ میں عامۃ الناس کے جذبات کا حال بالکل وہی تھا جو میر، سودا وغیرہ کے دَور میں دلی والوں کا تھا۔ لیکن اب تک ناسخ کے شاگردوں کے چڑھائے ہوے ملمع کا پردہ نہیں ہٹا تھا، فطرت کوشش کرتی تھی کہ ان زنجیروں سے آزاد ہو مگر ماحول کا اثر کہاں جاتا، دلی والوں کا سا سوز و گداز، کلام میں چمکنے لگا مگر "بطرز دگر"

مصحفی (۱) پھری ہیں یار تیاپاں شب غم کہ شام ہی سے سحر ہوئی ہے
تمھیں نہ آنا تھا تم نہ آئے ادھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے

آرزو (۲) دھواں سا اُٹھا لحد سے میری نکلی جب گھٹا برس کے
ہے آتش شوق اب بھی باقی کہ مرگیا ہوں ترس ترس کے

عزیز (۳) اے ناشناس اہل وفا ہیں ترے نثار
کیا دیکھتا ہے خون بھری تلوار دیکھ کر

مگر استداد زمانہ کے ساتھ فطرت نے غلبہ پالیا اور ناسخ کے شاگردوں کے مخرب اثرات محو ہو گئے گو ناسخ کا پڑھایا ہوا سبق، زبان کی آراستگی، اب بھی یاد رہا، اور الحمد للہ کہ موجودہ لکھنؤ بڑی حد تک صحیح مذاق شاعری کا حامل ہے۔ یہ دور لکھنؤ کی شاعری کا پانچواں اور آخری دور ہے، اور اس سے امید ہوتی ہے کہ مستقبل شاندار اور درخشاں ہوگا۔ ابھی تک تو ؎

وہ جو رکھتے ہیں ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

جذبات اثر

(جناب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی اے۔ ڈپٹی کلکٹر)

جو گرد سر یوں ہیں پھرتا رہا یہ دیوانہ
تو شمع آپ کرے گی طواف پروانہ

یہ کیا ہے رنگ تلون خیال جانانہ
کہ آشنا ہے ابھی اور ابھی ہے بیگانہ

کسی کی چشم فسوں ساز کا ہوں دیوانہ
نظر کے ساتھ لیے پھرتا ہوں پری خانہ

یہ سوز عشق کی تکمیل کا ہے افسانہ
کہ خاک ہو کے ہے آوارہ خاک پروانہ

جنوں کے جوش میں گزرا ہے کون دیوانہ
کہ خار رستے ہیں وحشت زدہ ہے ویرانہ

چمن کی یاد بس اتنی ہے اب اسیروں کو
سنا ہو خواب کے عالم میں جیسے افسانہ

اُجاڑ کر دل حسرت پرست کی بستی
یہ دشمن ہے کیجیے تا کہ نظام ویرانہ

گلوں سے کہتے ہی کہتے نسیم مستانہ ہوئی
ترے خرام کی رنگینیوں کا افسانہ

تمام عشق ہوا ہے تمام رعنائی
گلاب کی ہے کوئی پنکھڑی کہ پروانہ

ترے نثار وہی اک تبسم مبہم
کلی کلی کی زباں پر ہے جسکا افسانہ

وہ سوز و ساز محبت کا آخری منظر
کنار شمع فسردہ مزار پروانہ

تمام عمر اثر جس کی راہ دیکھی تھی
ادھر سے آج وہ گزرا تو مثل بیگانہ

ریاض مرحوم

(جناب "ا-ز" لکھنوی)

ریاض احمد مرحوم و مغفور کی شاعری کی نسبت مبالغہ آمیز تعریف کی کچھ ضرورت نہیں وہ اپنے کمالِ فن کی داد زندگی ہی میں اطرافِ مُلک سے حاصل کر چکے۔ اُنکی شہرت کسی بڑے سے بڑے شاعر سے کم نہیں۔ یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ فیصدی نوے اُنکی شوخ طبعی اور فصیح البیانی کے معترف ہیں۔ اُنکا رنگِ تغزل بہت بے تکلف تھا، بلکہ غزل سرائی میں وہ خاص درجہ رکھتے تھے۔ ریاض کی شاعری میں اُردو زبان کی دلآویز شان موجود ہے۔ اشعار میں نہ پیچیدگی ہے اور نہ اضافتوں کی بھرمار سے فارسیت ٹپکتی ہے۔ امیر کے شاگردوں میں بعد امیر مینائی کے اُنکی شاعری مقبولِ عام تھی۔

ریاض کو فطرتاً ویسا ہی دماغ ملا تھا جو فنِ شاعری کے مناسب ہو۔ اس لیے کہ کوئی شاعر بغیر جبلی مناسبتِ شعری کے عام شہرتِ تام نہیں حاصل کر سکتا۔ شعرائے گزشتہ و حال میں ایسے شاعر کم نکلیں گے جو فاضلانہ شان رکھتے ہوں۔ میرا یہ خیال زیادہ وضاحت کا محتاج نہیں اہلِ سخن واقف ہیں۔ ریاض کی زندگی ہی میں مشہور ادبی ماہوار رسالوں میں اُنکے کلام پر تنقید و تبصرہ ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی اُنکے کلام کی تنقیص و حرف گیری کسی نے کی ہو۔ اس کہنے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ ریاض کا کلام ضعفِ تالیف سے خالی ہے اور اُنکی غزلوں میں بھرتی کے اشعار نہیں ہیں اور کوئی ناقدِ فن نکتہ چینی نہیں کر سکتا۔ بڑے بڑے اُستادانِ فن کے کلام پر حرف گیری ہو چکی ہے۔

کوئی شاعر ہو جب اُس کے کلام میں سادگی اور بیساختہ پن زیادہ ہوتا ہے تو بعض سُست اشعار پر چنداں خیال نہیں کیا جاتا۔ ریاض کی ساری عمر ادبی کاموں میں گزری۔ وہ محض غزل گو نہ تھے بلکہ نثر میں بھی انشا پردازانہ دستگاہ رکھتے تھے۔ اُنکے خطوط اگر یکجا کیے جائیں تو وہ انشا کا بہترین نمونہ ہیں۔ اخبار نویسی میں بھی اُنکو اچھا ملکہ تھا۔ ریاض الاخبار جب تک گورکھپور سے نکلتا رہا اپنے فرائض منصبی کو پورا کرتے رہے۔ سیاسی معاملات میں جو مختصر نوٹ وہ لکھا کرتے تھے، وہ معانی خیز اور دلچسپ ہوا کرتے تھے، اُن سے صائب الرائی ٹپکتی تھی۔ اودھ پنچ اور مشیر قیصر سے معاصرانہ نوک جھوک ہوا کرتی تھی۔ جن لوگوں نے اُس زمانہ کے ریاض الاخبار اور اودھ پنچ کو دیکھا ہے اُنکو یہ حالات معلوم ہیں۔ فتنہ اور عطر فتنہ میں ریاض کی طباعی اور شوخ نگاری کے نمونے مل سکتے ہیں۔

اخبار نویسی کے انہاک تامہ کے بعد بھی ریاض نے اپنی غزل گوئی کی شان کو قائم رکھا۔ نظم و نثر دونوں میں انکو مہارت تام تھی۔

شاعر کے لیے آزادانہ مزاجی ضروری ہے۔ ریاض کے بعض احباب بھی اسی قسم کے تھے جو باوجود قابلیت فنی کے آزاد مزاج تھے۔ مولانا شرر مرحوم ریاض کے خاص دوستوں میں تھے۔ نثار حسین مرحوم (مدیر پیام یار) بھی اُنکے بے تکلف دوست اور جلیس تھے اور بعض مقامات میں ہمسفر بھی رہ چکے ہیں۔

سفر و حضر میں ریاض کی شوخ طبعی کی بعض حکایات عجیب و غریب سُنی ہیں جنکو بخیال طوالت نظرانداز کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں سے سُنا ہے کہ ریاض نوجوانی میں اپنی ٹوپی میں ریاض کا نام لکھوا کر نکلتے تھے۔ دو ایک بار دوستوں کی خوشی سے بھیس بدل کر سائلانہ حیثیت سے کچھ وصول کرکے تنقل و تفکہ میں صرف کیا۔ مگر یہ بیانات اور اسی قسم کے دوسرے حالات روایتی ہیں۔

ریاض کو اگر ملازمت کی طرف توجہ ہوتی تو وہ اپنے والد سید طفیل احمد کے ذریعہ سے پولیس میں ملازم ہو سکتے تھے۔ کیونکہ وہ کوتوال تھے۔ مگر ریاض کو پولیس کی ملازمت کیوں پسند آتی۔ وہ گاہ گاہ پولیس کے سوءِ نظم پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے اس باعث پولیس اُن سے ناراض تھی۔ پولیس کی ملازمت کے سوا اگر وہ کسی رئیس سخن دوست سے تعلق پیدا کرنا چاہتے تو آسانی سے ممکن تھا بلکہ بخوشی اُنکو ملازم رکھ لیا جاتا۔

غالب مرحوم ریاض کو بادشاہِ سخن کہا کرتے تھے اور اُنکے رنگ شاعری کے مداح و معترف تھے۔ رامپور اور حیدرآباد میں اُن کے بعض دوست احباب موجود تھے اور خود رئیس اُنکی شاعری کو پسند کرنے والے تھے۔

ریاض الاخبار بند ہونے کے بعد گویا ریاض کے جوش و وجدانیت میں کمی پیدا ہوئی اور جوانی کی تاب و تواں میں انحطاط آ گیا۔ کچھ دنوں لکھنؤ میں بھی طباعت کا ناکام سلسلہ رہا آخر کار ترک کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ مہاراجہ صاحب بہادر محمود آباد (مرحوم) کے دامن لطف سے وابستگی ہوئی اور مہاراجہ صاحب مغفور ہی کے مقرر کردہ وظیفہ پر بسر اوقات رہی۔ مہاراجہ صاحب کی خدمت میں ریاض نے کئی قصائد پیش کیے۔ غالباً مہاراجہ صاحب سے اسکا صلہ بھی ملا ہو۔ مہاراجہ صاحب ریاض پر رئیسانہ اور مربیانہ توجہ فرماتے تھے اور شاید مشورۂ سخن بھی کرتے تھے۔ غالباً پسماندگان ریاض سے وہ رعایت ملحوظ رہے کیونکہ وہ غیر مطمئن ہیں۔

ریاض کی مالی حالت کبھی قابل اطمینان نہیں رہی۔ اور یہ گویا میراث اہل فن و کمال کی ہے۔ انکے دیوان کا زندگی میں طبع نہ ہونا دلیل بے مائگی ہے۔ وہ فراہمی سرمایہ کی فکر اور لیت و لعل ہی میں رہے کہ

کس رحلت بکوفت بدستِ اجل

مرحوم اس آرزو کو اپنے ساتھ لیگئے۔ ریاض کی کئی لڑکیاں اور لڑکے ہیں مگر کوئی "میراث پدر خواہی علم پدر آموز"

کا مصداق نہیں۔ امید ہے کہ ریاض کے بعض ذی اثر اور معتقد احباب ریاض کی اس مردہ آرزو کو زندہ کرکے اُنکی روح کو خوش اور سخن دوست اصحاب کے لیے ایک دلکش تحفہ پیش کریں گے۔ ادبی دنیا میں ریاض کا دیوان قابل قدر چیز ہوگا چونکہ اُن کا دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس لیے ان کے کلام پر نقد و تبصرہ کافی نہیں ہوسکتا، مگر اُن کے متفرق مطبوعہ کلام سے کچھ انتخاب کرکے مرحوم کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔

حسب معمول شعرا ریاض نے بھی علاوہ رنگ تغزل کے استخفاف مذہب کو جائز رکھا ہے۔ شراب کے مضامین باوجود مینوش نہ ہونے کے ایسے لکھے ہیں کہ میخوار بھی نہ لکھے گا۔ ریاض نے شراب کو ہاتھ سے بھی نہ چھوا ہوگا، وہ پابند صوم و صلوٰۃ بھی تھے۔ مگر شاید ہی کوئی غزل اُنکی ایسی ہو جس میں شراب کی میخوارانہ تصویر نہ کھینچی ہو۔ میں نے ایک روز کہا کہ اس بڑھاپے میں تو آپ رندانہ اشعار سے کنارہ کشی کیجیے۔ جواب دیا کہ یہ تو شراب محبت ہے۔

ایک غزل میں لکھتے ہیں

یہ دوش ابر پہ جاتے ہیں خم کے خم کہاں ساقی　　　بتا دے آج شور قلقل مینا کہاں ہوگا

برسات میں بادلوں کا اِدھر سے اُدھر جانا اور کبھی تصادم سے گرجنا گویا صدائے قلقل مینا ہے۔ پھر ساقی سے پوچھتے ہیں کہ یہ شور قلقل مینا کہاں ہوگا؟ قلقل مینا سے بادلوں کی گرج کو تشبیہ دینا غالبًا نئی مثال ہے۔

اسی زمین میں شور خندۂ گل کو شور اذاں کس رنگ سے ثابت کیا ہے، یہ شعر نازک خیالی کی بہترین مثال ہے۔ شور خندۂ گل کو اذان سمجھ کر یاد خدا کے لیے اُٹھنا سکیشوں کے لیے عجیب بات ہے۔

نہیں صبح چمن میں کیف خواب صبح پیما نہ　　　کہ شور خندۂ گل کان میں شور اذاں ہوگا

معشوقانہ انداز تبسم:۔

تبسم اور شوخی اُسپہ انداز تبسم کی　　　ترے لب پر جو یوں آیا کوئی راز نہاں ہوگا

ذیل کے شعر میں قاتل کی ہمدردی ملاحظہ ہو

لہو روئیں گے میرے زخم دامن رکھ کے آنکھوں پر　　　تمہارا داغ دامن حشر میں جب گلفشاں ہوگا

اس مختصر انتخاب میں کلام کا انتخاب ردیف وار نہیں ہے۔ جو شعر یاد آئے یا بعض پرچوں سے ملے درج کردیے گئے۔ ذیل کی غزل میں مطلع کے سوا باقی اشعار میں رنگ تصوف کی جھلک نظر آتی ہے مگر رنگ تغزل کو قائم رکھا ہے۔ وہو ہذا

او کوسنے والے اب دعا دے　　　کہدے کہ تجھے خدا شفا دے

درماں کی طرح تڑپ مزا دے　　　یارب مجھے درد لا دوا دے

وہ ایک شعر میں ایسی شراب کے خواہاں ہیں جو دنیا کے میکدہ میں نہیں مل سکتی یعنی بادۂ توحید و معرفت کی تمنا کرتے ہیں

یہ میکدے سب ہیں اس سے خالی — دل کو مرے بیخودی خدا دے

اسی مضمون کو دوسرے طرز سے لکھتے ہیں جس کا روئے سخن مرشد یا حسنِ ازل سے ہے۔ دنیا کے ساتھ حسنِ عاقبت کی آرزو کرتے ہیں بہت ہی پاکیزہ متصوفانہ خیال ہے

جنت میں بھی حشر میں بھی کام آئے — تو ہاتھ سے جام اک پلا دے

دو شعر اور ملاحظہ ہوں

میری شبِ غم کی صبح ہو جائے — وہ رُخ سے ذرا نقاب اٹھا دے

وہ تارِ نفس کہاں سے لاؤں — ٹوٹے ہوئے دل کی جو صدا دے

ذیل کے اشعار میں شوخ طبعی اور رندانہ مذاق کی تصویر اُتاری ہے۔ اس زمین میں مغفور امیر مینائی کا یہ مطلع بہت مشہور اور پسندیدہ ہے

ستارے مرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں — یہ سب گیند میرے اُچھالے ہوئے ہیں

اور نکالے کا قافیہ بھی شوخی میں خوب کہا ہے

شکایت جو کی میں نے جوبن یہ بولا — ارے یار ہم بھی نکالے ہوئے ہیں

اب ریاض کے نکالے اور اُچھالے کے قافیوں کو ملاحظہ کیجیے اور دادِ طبّاعی دیجیے

یہ سیدھے جواب زلفوں والے ہوئے ہیں — ہمارے ہی سب بل نکالے ہوئے ہیں

چھپا کر بہت پی ہے مسجد میں واعظ — یہ ظرفِ وضو سب کھنگالے ہوئے ہیں

الگ ہے خدائی سے سب ساخت انکی — یہ بت اور سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں

جنوں فصلِ لا[1] لایا ہے کچھ فصلِ گُل میں — یہ لالہ نہیں زخم آلے ہوئے ہیں

یہ اے شیخ گنبد نہیں مسجدوں کے — خُم ہے ہمارے اُچھالے ہوئے ہیں

سُنا ہے ریاض اپنی داڑھی بڑھا کر
بڑھاپے میں اللہ والے ہوئے ہیں

ریاض نے شراب کے مضامین میں بعض شعر ایسے بھی نکالے ہیں جو حافظ اور عمر خیام کے رنگ سے ملے ہوئے ہیں اور اردو گو شاعر کے لیے یہ کمال مشق کی انتہا ہے یعنی یہ اشعار بظاہر رندانہ ہیں مگر ان میں رنگ تصوف مضمر ہے۔ مثلاً

---

[1] غالباً رنگ کی جگہ فصل چھپ گیا ہے۔

پی پی کے اُسنے سجدے کیے ہیں تمام رات　　　اللہ رے شغلِ زاہدِ شب زندہ دار کا

ظاہر ہے کہ زاہد شب زندہ دار کی شراب مئے عشق ہے، ورنہ رات بھر خدا کی عبادت کون کرسکتا ہے۔ دنیاوی شراب تو بدحواس اور مدہوش کرنے والی ہے۔ رند کو اپنے سر و پا کی خبر نہیں رہتی تو یادِ خدا کیسی۔ اسی مذاق سے ملتا ہوا یہ شعر بھی ہے

حرم و دیر میں ہوتی ہے پرستش اُس کی　　　میکشو یہ بھی کوئی نام ہیں میخانوں کے

ایضاً

کبھی کی پی ہوئی کام آئی آج حشر کے دن　　　خدا کے سامنے میخوار سرخرو آئے

انتہائی شوخی

وہ آرہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ　　　بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ ملے

مستِ مئے عشق کے وقار و عظمت کو کس پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ شعر بالکل نیا ہے جہانگیر کے کسی درباری شاعر کا شعر ہوتا تو وہ سیم و زر میں تولا جاتا

فرشتے عرصہ گاہِ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں　　　ہمیں بھی آج لطفِ لغزشِ مستانہ آتا ہے

اسی قافیہ کو آتش مرحوم نے بھی خوب کہا ہے مگر دونوں میں جو فرق مابہ الامتیاز ہے وہ محتاجِ بیان نہیں خیال جداگانہ ہے

اُلٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے　　　گر اُسکو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے

اس شعر میں دریا کو بیاباں کس خوبی سے ثابت کیا ہے نازک خیالی کی بہترین مثال ہے۔ یعنے

مجھ کو آنکھوں نے دکھایا ہے پلک جھپکاتے　　　خشک ہو کر کسی دریا کا بیاباں ہونا

کسی شاعر کا یہ شعر مشہور ہے

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو　　　خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

اسی مضمون کو ریاض نے دوسرے ردیف و قافیہ میں عجب انداز الفاظ میں نظم کیا ہے جس کی داد اہل سخن دے سکتے ہیں

روز راتوں کو سنا کرتا ہوں یہ آوازِ قیس　　　پھاڑے کھاتا ہے مجھے خالی بیاباں آجکل

شمع کو گریاں اکثر شعرا نے کہا ہے مگر ریاض کی جدت آفرین طبیعت نے اُسکو خنداں بنا دیا۔ اور وجہ خندہ کس پیرایہ میں بیان کی ہے۔ یہ شعر بھی ریاض کا حصہ ہے وہو ہذا

تھا حسن اتفاق کہ پیہم شرر اُٹھے　　　وہ خوش ہوے کہ شمع کو ہم نے ہنسا دیا

افسردگی اور بے دلی کا اظہار

دل سے نکالڈالے سب ارمان ملال کے
اب پھینک آئیں پینے کیا دل نکال کے

رندانہ آزاد مزاجی

سال پلٹے لیکے خم بھیری کو نکلے ہیں ریاض
میکدے کچھ وقف ہیں ان شیخ جی کے واسطے

ایک دوسری زمین میں رندانہ شوخی کی حد کر دی ہے ملاحظہ ہو

ہلتی ملتی ایک شے تھی آب زمزم سے بہت
ہم چرا کر لیگئے اہل حرم کے واسطے

اسی زمین میں یہ شعر بھی خوب کہا ہے دنیاوی تعلقات کے کم کرنے کو کس پیرایہ میں ادا کیا ہے

اے حباب اتنے بکھیڑے ایک دم کے واسطے
یہ ہوائے نا مداری یہ ہوائے خودسری

ولہ

ریاض اک میلا سلسلہ دل ہو ہم ہوں
حسینوں کی بھری محفل ہو ہم ہوں

یہ شعر جذبات حسن و عشق کی دلکش تصویر ہے۔ غالباً یہ مطلع ریاض نے نوجوانی میں کہا ہوگا۔ بندش کس قدر صاف ہے۔ دونوں مصرعے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔

چلے آتے ہیں خوش خوش اپنے گھر سے
وہ غنچے کھیلتے بادِ سحر سے

اس شعر میں معشوق کی شوخ مزاجی میں بھولے پن کی ادا دکھائی ہے۔ بادِ سحر جو ایک غیر مرئی شے ہے، اُس سے کھیلنا خلافِ قیاس ہے، مگر لطف بیان نے شعر میں دلآویزی پیدا کر دی۔ مجھ سے ایک صاحب نے بیان کیا تھا کہ سابق نواب صاحب رامپور نے اس شعر پر اظہار پسندگی فرمایا تھا۔

غالب نے ایک شعر میں غریب واعظ پر میخواری کا الزام بطور تجاہل عارفانہ لگایا ہے۔ شعر اپنے رنگ میں لاجواب ہے یعنی

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ریاض نے اپنے ایک شعر میں قریباً یہی شوخی پیدا کی ہے۔ وہ علانیہ اقرار میکشی کرتے ہیں، مگر کس ٹھاٹھ سے گویا اچھے خاصے واعظ اور مولوی ہیں مگر در پردہ رند

ہم نے دیکھا طرفِ میکدہ جاتے تھے ریاض
اک عبا پہنے عصا تھامے عمامہ باندھے

ولہ

دن کو دھوپ رکتی ہے نہ شب کو اوس رکتی ہے
مرے گھر کا وہ عالم بیکسی کی جیسے تربت ہو

اس شعر میں غربت اور بیکسی کی جو حالت دکھائی ہے وہ ایک واقعی امر ہے۔ اس لیے یہ واقعہ ہے نہ مبالغہ۔

شعر کو پڑھ کر دل متاثر ہوتا ہے۔

ہاتھ سے گلچیں کے جھٹکے کون کھائے　　　شاخِ گل پر آشیانہ کچھ نہیں

ان دونوں مصرعوں میں خودداری کو ظاہر کیا ہے جو خصائل انسانی میں بہترین خصلت ہے۔ شاخ گل کو اس واسطے چھوڑا جاتا ہے کہ گلچیں کی تعدی اور کج خلقی سے نجات ملے۔

ہے ریاض اک جوانِ مست خرام　　　نہ پیے اور جھومتا جائے

یہ شعر بھی عنفوانِ شباب کی حالت کا نقشہ اُتار رہا ہے۔ جوشِ شباب کی مستی کیفِ شراب سے جداگانہ ہے بعض نوجوانوں کی رفتار مستانہ بھی ہوتی ہے۔

ولہٗ

هم وہاں ہیں کہ جہاں دونوں برابر ہیں ہمیں　　　یہ شبِ وصل ہے کیا یہ شبِ فرقت کیا ہے

آ کے دو آنسو گرائے کوئی امید نہیں　　　اب مری قبر سے لپٹی ہوئی حسرت کیا ہے

اے ریاض آؤ بھی جاتے ہو کہاں زنداں سے　　　نہ کھِلے گل، نہ بہار آئی، یہ وحشت کیا ہے

پہلے شعر میں عاشقانہ محویت کی حالت بیان کی ہے۔ جب انتہائی استغراق و محویت خیال یار میں ہوتی ہے تو وصل و فراق میں امتیاز نہیں رہتا۔ عاشق صرف خیالی تصویر دوست میں مستغرق ہو کر لذائذ وصل سے محظوظ ہوتا ہے۔ دوسرے شعر میں فقدان غمگسار سے محزون ہو کر حسرت سے کہا گیا ہے کہ میری قبر سے لپٹنا چھوڑ دے۔ حسرت و یاس کی اچھی مصوری کی ہے۔ تیسرے شعر میں زنداں سے رہا ہو کر پھر زنداں ہی میں لوٹ جانے کی وجہ خوب بیان کی ہے۔ جب موسم گل ہی نہیں تو وحشیان عشق کے لیے زنداں ہی کیا بُرا ہے۔

کیا کیا مزے دیے ہیں لحد کے فشار نے　　　اپنا بنا لیا مجھے ظالم کے پیار نے

لحد کے فشار کا مزا کیا؟ یہی نا، کہ گوشت و پوست اور استخواں کو پیس ڈالا۔ دوسرے مصرعہ نے مصرعہ اولیٰ میں جان ڈال دی ہے۔ یعنی مجھے اس ظالم (لحد) کے پیار نے اپنا بنا لیا۔ خاک میں خاک مل گئی۔ مفہوم شعر کتنا اچھا رہا۔

سینے تک آئے سونے میں کب میرے دستِ شوق　　　دھوکا دیا تجھے ترے پھولوں کے ہار نے

رنگِ تغزل میں یہ شعر ڈوبا ہوا ہے۔ اپنے دستِ شوق کا الزام پھولوں کے ہار کو دیکر معشوق سے اپنی بے قصوری ثابت کی ہے۔

یہ سُن کے، دُور جاتی ہے آواز رات کی　　　بیٹھا ہے قیس نجد میں مجھ کو پکار نے

نجد میں جب قیس تنہائی سے گھبرایا تو اُس نے رات کو آواز دی کہ ریاض میرے پاس آئیں تو میرا دل بہلے۔

خوب شعر کہا ہے۔

مٹی کے ساغروں میں بھی ہے تازگی گل — ہر شے میں جان ڈال دی فصل بہار نے

یوں تو فصل بہار سب ہی کے لیے خوش آیند ہے مگر رندوں کے لیے مٹی کے ساغروں میں بوئے گل پیدا ہوجانا بہت ہی سرور افزا اور طرب انگیز ہے۔

اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں ایک آہ کی — بے آس ہوکے اس دل امیدوار نے

عاشقانہ مایوسی کو موثر انداز سے نظم کیا ہے۔ بے آس اور مایوس ایک ہی بات ہے

ولہ

دن میں جو چپے خلد کے شب میں مئے کوثر کے خواب — ہم حرم میں آرہے میخانہ ویراں دیکھ کر

اس شعر میں ریاض نے ترک رندی کو جدید طرز سے بیان کیا ہے میخانوں کو جب ویران اور خراب دیکھا تو حرم میں آ گئے اس لیے کہ دن کو خلد کا چرچا رہتا ہے اور رات کو مئے کوثر کے خواب دیکھتے ہیں۔ میخانوں میں جب شراب ہی نہیں تو رند اپنے دل کو کیونکر تسکین دے۔ مگر مفہوم شعر سے کنایتاً یہ ثابت ہے کہ حرم کا رہنا مجبوراً ہے۔ دراصل یہ شعر بھی رندانہ ہے مگر بادی النظر میں پارسایانہ جھلک دکھاتا ہے۔

صبح پیری آنکھ جب اپنی کھلی تو یوں کھلی — جیسے کوئی چونک اٹھے خواب پریشاں دیکھ کر

چشم عبرت دیدۂ حسرت تھے ذرے خاک کے — رو دیے ہم عالم گور غریباں دیکھ کر

شوخی اور رندی کے ساتھ نیچرل رنگ ذیل کے شعر میں ملاحظہ ہو

چھپی اودی گھٹاؤں میں وہ پریاں جنھیں ساقی — اتر کر رقص کرتے دامن کہسار میں دیکھا

کون سورج کی نکلی جام مے سے — یہ کیسی دھوپ نکلی چاندنی میں

ولہ

دل بیتاب بھی کیا اشک کے طوفاں میں گیا — پرشکن موج سے ہے دامن دریا کیسا

اشک کے طوفان میں دل کے بہ جانے سے دریا کا پرشکن یعنی رنجیدہ ہونا اس لیے کہا کہ دل کی بیقراری سے دریا کے سکون میں فرق آ گیا، جوش و بیقراری پیدا ہو گئی۔ کثرت گریہ سے طوفان اشک کا دریا میں مل جانا داخل مبالغہ ہے۔ یہ شعر فارسی اشعار کی معنی خیزی ظاہر کرتا ہے۔

دیکھنا چٹکی میں انگلی کوئی تاڑ کے تو نہیں — منہ کو دوڑ کے یہ آتا ہے کلیجا کیسا

کلیجے سے مراد دل ہے اس نے تیر کی جھلک یار کی چٹکی میں دیکھ لی ہے اس لیے فرط شوق میں سینہ سے

خود نکلا آتا ہے کہ ناوکِ یار مجھ کو ہدف بنائے - خوب شعر ہے - شوق قدوائی نے بھی ایک شعر اسی مذاق سے ملتا ہوا کہا ہے اور خوب کہا ہے

چھوٹنے تک یہ دل بیتاب کے مضطر رہا   تیر چٹکی میں لہو کے گھونٹ پی پی کر رہا

دیگر

کس کا غبار ہے یہ ہمارا غبار ہے   جسکا ہر ایک ذرہ دلِ بے قرار ہے

لے لو دم اور گھنی چھاؤں سے اُٹھنے والو   ہم بھی چلتے ہیں ذرا خشک پسینا ہو جائے

یہ شعر بالکل واقعہ ہے - مسافرانِ دشتِ محبت سے کہتے ہیں ذرا درختوں کے سایہ میں اور دم لے لو میں بھی تمہاری طرح تھکا ہوا ہوں، ذرا پسینہ خشک ہو لے تو ہم تم ساتھ ہی صحرائے عشق کو طے کرینگے کیونکہ ہمراہی میں دل بہلتا رہے گا -

کسے بتائے کوئی رنگِ آرزو کیا ہے   اُنھیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ بو کیا ہے

ریاض کا یہ شعر رنگِ تغزل کی عمدہ مثال ہے - معشوق کا خونِ آرزو دیکھنے کے لیے ضد کرنا اور عاشق کا خونِ آرزو دکھلانے سے پس و پیش اس خیال سے کرنا کہ وہ اسکی کیا قدر کرے گا بہت ہی والاویز مذاق ہے - غالب نے بھی اپنے ایک شعر میں معشوق کی ضد کو اسی رنگ میں لکھا ہے - صرف ایک مصرعہ یاد ہے[1]

اس پہ رو بیٹھے ہیں کہ ہم درد جگر دیکھیں گے

اس مختصر انتخاب سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ ریاض نے ہر رنگ میں پسندیدہ اشعار کہے ہیں - غالباً بعض ناظرین کو خیال ہو گا کہ صرف منتخب اشعار درج کیے گئے اور سُست اشعار پر نکتہ چینی نہیں کی گئی - اسکی نسبت اتنا کہدینا کافی ہے کہ خود ریاض کی زندگی میں کسی غیر نے نہیں بلکہ اُن کے خاص احباب نے بعض اشعار پر نکتہ چینی کی اور بعض اشعار بدلنا چاہے مگر ریاض چونکہ منکسر اور متحمل تھے خاموش رہے - لہذا میں نے بھی خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل کیا -

بہرحال ریاض مرحوم کاملِ فن اور اُستادِ سخن تھے اور دَورِ آخر کے شعرا میں اُنکی ذات بہت غنیمت تھی وہ داغ اور امیر کے معاصرین میں تھے - خدا اُنکو غریقِ رحمت فرمائے -

---

[1] اس مصرعہ میں شاید کوئی لفظ میری یاد سے بدل گیا ہو -

جوہرِ آئینہ پر ایک سرسری نظر

(مسٹر سید وصی رضا بی - اے آنرز)

۱ - قدرت کے قوانین اٹل ہیں - مشاہدہ اور تجربہ اسکے دو شاہد عادل ہیں - ہر عمل کے ساتھ ردِّ عمل (Reaction) وابستہ ہے - فرقۂ نصیری کی ضد پر فرقۂ ناصبی کا ظہور ہوا - ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم (غالب پرست) کے مقابلہ کو ڈاکٹر عبداللطیف (غالب بیزار) نکلے -

"جب یہ کتاب (ہماری شاعری) پہلے پہل شایع ہوئی ...... تو اخباروں میں تعریفوں کا غلغلہ رہا - رسالوں میں تعریفوں کا ہنگامہ رہا"

حامی ادب اُردو مسٹر منوہر لال زتشی نے اپنے انگریزی مجموعۂ مضامین (Gleanings) میں ایک مضمون اس کی تعریف میں لکھا - ڈاکٹر بیلی نے تاریخ ادب اُردو (بہ زبان انگریزی) کے آخر میں اُردو کی ہزارہا کتابوں میں سے گنتی کی چند کتابوں کے نام لکھے ہیں اُس میں سے ایک ہماری شاعری بھی ہے - جوہر آئینہ مصنفۂ جناب تجو موہانی بطور ردِّ عمل ایک تنقیصی مقالہ کی پہلی قسط شایع ہوئی ہے -

۲ - بعضوں نے شہرت کا یہ ذریعہ اختیار کیا ہے کہ کسی مشہور شاعر یا معروف ادیب پر اعتراضات کرکے ہمیشہ کے لیے بدنام ہو جاتے ہیں - نساخ نے اپنے نزدیک کلام انیس پر خطِ نسخ کھینچدیا تھا - اُس کا مقصد تو پورا نہ ہوا البتہ نساخ "بدنام کنندۂ نکو نامے چند" کی حیثیت سے آج تک زندہ رہ گیا - عبداللہ اوج اگر غالب کے "ڈیڑھ جز و" پر تعریض نہ کرجاتے تو باوجود صاحب ہشت دیوان ہونے کے آج انھیں کون جانتا - غالب غالب ہی رہا مگر عبداللہ اوج کا نام غالب کی شہرت کی بدولت زندہ ہے - شاید اسی طرح جناب ادیب کی شہرت کے ساتھ جناب تجو کا نام بھی باقی رہ جائے -

۳ - اس تنقیص کا انجام وہی ہوگا جو گلزار نسیم پر مولانا شرر مرحوم کی تنقید کا ہوا - کچھ لوگ جناب تجو کی موافقت کریں گے کچھ مخالفت - دنیاے ادب میں مباحثۂ گلزار نسیم کے قسم کی ایک محفل بپا ہو جائیگی ہماری شاعری کا جو مرتبہ ہے وہی رہیگا - البتہ اس ہنگامے کے ذریعے چند ادبی نکات حل ہو جائیں گے -

۴ - ہماری شاعری کے لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ کو راہِ راست پر لایا جائے اس کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ اُردو شاعری پر جو اعتراضات عموماً وارد کیے جاتے ہیں اُنکا جواب لکھ دیا جائے -

مولانا حالی مرحوم کے مشہور مقدمہ سے جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اور اُن کے خلوص نیت کا جو غلط نتیجہ گمراہ طبقے نے نکالا تھا اُس کو دُور کرنا ہماری شاعری کا مقصد اولیں ہے۔ جناب بیخود نے جس عنوان سے تنقیص کی ابتدا کی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری شاعری کے مقصد کو سمجھنے میں اُن سے سہو واقع ہوا۔ الانسان مرکب من الخطاء والنسیان۔ انگلستان کا مشہور نقاد ریلے (Raleigh) ایسے ہی موقع کے لیے لکھتا ہے:

"اگر تم کو اظہار رائے کرنا ہی ہے تو کرو۔ مگر اس سے پہلے سمجھنے کی کوشش کرو"

اگرچہ ابھی صرف جلد اول کی قسط اول ہی شایع ہوئی ہے مگر

نمی دانم حدیثِ نامہ چون است ہمی دانم کہ عنوانش بجنون است

جناب بیخود فرماتے ہیں:

"مجھے ہماری شاعری سے مفصل بحث کرنا ہے اور دکھانا ہے کہ مولف علام نے کہاں کہاں خوشہ چینی کی ہے اور کہاں کہاں نکتہ آفرینی۔ علمائے بلاغت کے اقوال کہاں کہاں سنور گئے ہیں، کہاں کہاں مسخ ہو گئے ہیں۔ شاہیں تحقیق کی آئینہ دار ہیں یا آئینۂ تحقیق کا زنگار ...... مولف بے بدل کی شگفتہ بیانات، سنجیدہ ظرافت، سادہ رنگینی، پرکار سادگی (خط کشیدہ فقرے جناب ادیب کے ہیں) سبھی کی داد دینا ہے"

ان عبارتوں کو پڑھنے کے بعد جوہر آئینہ کا مقصد صاف ظاہر ہو جاتا ہے ع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا۔

تمہید میں جناب بیخود فرماتے ہیں

"ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ میری کتاب (آئینہ) ہماری شاعری کے لیے تہنیت کا ترانہ ہے، مسرت کا شادیانہ ہے یا اُردو زبان کا مرثیہ - اُردو شاعری کا نوحہ ہے"

خط کشیدہ فقروں سے واضح ہوتا ہے کہ جناب بیخود کو اُردو زبان اور اُردو شاعری سے قلبی محبت ہے لیکن ان کی کتاب سے اس دعوے کی تصدیق نہیں ہوتی۔ جو کتاب اُردو شاعری کی حمایت میں لکھی گئی ہو اُس کی اس شد و مد سے مخالفت کی جائیگی تو نتیجہ ظاہر ہے کہ گمراہ طبقہ گمراہ تر ہو جائیگا۔

ہمہ فکر تعمیر دارند و بس ۔ تو در بند تخریب بنیاد خویش

اردو زبان کے ساتھ ہمدردی کا دعویٰ کرنے کے بعد ہماری شاعری کی مخالفت کرنا یعنی اُردو شاعری کی جڑ

Judge if you must, but before you judge ✓ try to understand. (A note on Criticism)

کھوکھلی کرنا اپنے دعوے کو باطل کرنا ہے۔ جناب ہجوؔ دبجا بالِ خود صرف واقعی غلطیاں ہی دکھائیں گے لیکن اگر وہ اپنے اس خیال پر قائم بھی رہ سکیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ سطح بیں لوگوں کو اس کتاب سے ایک بدگمانی سی پیدا ہو جائے گی اور اس سے ہماری شاعری کی تصنیف کا جو مقصد ہے وہ فوت ہو جائیگا۔ انسان کا یہ فطری خاصہ قابلِ لحاظ ہے۔

۵ - جناب ہجوؔ دنے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ تنقید کے لیے زیبا نہیں ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شمشیر برہنہ لیے ہوئے میدانِ کارزار میں حریف کو للکار رہا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

"بعض احباب نے ادھر کچھ یوں ہی سی توجہ بھی فرمائی .... مگر دوری سے پینترے بدل کر رہ گئے" (آئینہ صفحہ ۱)

"ہم دو مختصر سے قطعے نقل کرتے ہیں اور ہے کوئی جو ان میں سے ایک شعر بھی حذف کر دینے کی قدرت رکھتا ہو" (آئینہ - صفحہ ۲۵)

کسی ادبی موضوع پر بالعموم اور تنقیدی مقالہ پر بالخصوص قلم اٹھاتے وقت جہاں تک ہو سکے ذاتی تعلقات کو بھلا دینا چاہیے۔ کیونکہ تنقید کا مقصد اظہار دوستی یا دشمنی نہیں ہوتا، بلکہ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر جذبات کا دخل نہ ہوگا تو لہجہ بھی شانِ تحریر کے شایاں ہوگا اور تہذیب کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے گا۔ آئینہ کے ہر ہر فقرہ سے ذاتی پرخاش کا اظہار ہوتا ہے، جو تنقید کی عالمانہ عبارت کے لیے نازیبا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی گرہ بہ ابرو۔ چیں بجبیں۔ کف در دہاں۔ چلا چلا کر دل کے بخارات نکال رہا ہو۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

"مولف علام نے اس قطعے کے متعلق دو صفحے سیاہ کیے مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں"

"جناب مولف کی دی ہوئی مثالیں زیادہ تر ایسی ہی ہیں یعنی غلط ہیں۔ سقیم ہیں۔ بے محل ہیں......

(آئینہ - صفحہ ۳۵)

اس عبارت کے بعد نقطے دیے ہوئے ہیں جن کا یہ مطلب ہے ع - کہ اب تہذیب کا دامن بھی چھوٹا جاہی مجھ سے

"اس وقت مصنف علام کی وہ حالت نظر آتی ہے جو مرض کے بحران اور آتش کے ہیجان میں ہوتی ہے" (آئینہ صفحہ)

اس تشبیہ کی شائستگی قابلِ ملاحظہ ہے۔

۶ - اس تمہید کے بعد میں جناب ہجوؔ کو یہ مشورہ دوں گا کہ اگر انکے نزدیک ہماری شاعری میں خامیاں ہیں تو وہ مہذب طریقہ سے اُن کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً جن مثالوں کو وہ غلط سمجھتے ہوں اُن کے بجائے صحیح مثالیں پیش کر دیں۔ فیصلہ اربابِ نظر کے ہاتھ ہے۔

اگر وہ ہماری شاعری کو از سر تا پا غلط یا مہمل سمجھتے ہوں تو اس موضوع پر اس سے بہتر ایک کتاب لکھ ڈالیں۔ کیونکہ آجکل ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے۔

اگر تنقیدی مقالات لکھنے کا شوق ہو تو میں یہ ضرور التماس کروں گا کہ وہ اس فن پر انگریزی میں چند کتابیں (کم از کم پچاس) پڑھ لیں۔ کیونکہ اُس زبان میں یہ فن معراجِ کمال پر پہونچا ہوا ہے۔ اس مطالعہ سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ تنقیص اور تنقید کا فرق بخوبی معلوم ہو جائیگا۔ اس موقع پر میں بصد ادب پنڈت بشن نرائن در کا ایک شعر نقل کرتا ہوں

ہمیشہ چاک پیراہن پہ پڑتی ہے نظر اُس کی
نہیں جز عیب بینی عیب کوئی چشمِ سوزن میں

نالۂ قیس

(جناب مولوی محمد عاصم صاحب قیس کاکوروی)

سینے میں داغِ دل کو درخشاں کیے ہوے　　نکلا ہوں آفتاب کو حیراں کیے ہوے
ایمان۔ کفرِ عشق کو ایماں کیے ہوے　　ہے سارے کافروں کو مسلماں کیے ہوے
جیتا ہوں جاں حضور پہ قرباں کیے ہوے　　ہے اتنی بات جاں کو مری جاں کیے ہوے
کیا کہیے چیرہ دستیِ شوقِ وصال کو　　جو ہر 'نہیں' کو آپ کی ہے 'ہاں' کیے ہوے
عہدِ وفا سے آپ کے ہے میری زندگی　　گویا کہ ہے جو پاس کو ارماں کیے ہوے
عاشق ہے جسم و روح سے بھی اپنی بے نیاز　　سب روح و جسم نذرِ جاناں کیے ہوے
لطفِ شہود یہ ہے کہ قصے ہوں مختصر　　اک حیرتِ محض کو فراواں کیے ہوے
سالک ہے راہِ عشق کا ہر دم حضور میں　　ہر پیچ رہ کو گیسوِ پیچاں کیے ہوے
کنجِ شبِ فراق ہے بزمِ شبِ وصال　　دامانِ شب کو زلفِ پریشاں کیے ہوے
پھر ہے مزاجِ طائرِ وحشی تو تنگ پر　　کنجِ قفس کو اک چمنستاں کیے ہوے

صحرا کو پیرہن پھاڑ کے جاتے کہاں ہو قیس
تارِ نفس کو تارِ گریباں کیے ہوے

ترکیب بند

(غیر مطبوعہ کلام حضرت امیر مینائیؒ)

باغِ ہستی میں گزرتے ہیں عجب لیل و نہار | کبھی ایامِ خزاں ہیں کبھی ایامِ بہار
موے گیسو میں سیاہی سے سپیدی آئی | کیا تلوّن ہے کہ کافور ہوا مشکِ تتار
نہ صراحی سی ہے گردن نہ وہ رُخ سرخ و سپید | نہ وہ انگیز بدن ہے نہ وہ سینے کا اُبھار
حُسن و خوبی کے مرقع پہ پھرا یہ پانی | رنگ باقی نہ رہا مٹ گئے سب نقش و نگار
صرصرِ مرگ چلی ایسی کہ پژمردہ ہوے | سیکڑوں رشکِ چمن، غنچہ دہن، لالہ عذار
جنکے پھولوں سے زیادہ تھے نزاکت میں بدن | پاؤں پھیلائے وہ سوتے ہیں تہِ سنگِ مزار
خاک کو اُنکی اُڑائے لیے پھرتی ہے ہوا | کبر سے رہتے تھے جو باد کے گھوڑے پہ سوار
مٹ گئے، خاک ہوے جامۂ ہستی اُنکے | جھاڑتے چلتے تھے دامن سے جو رستے میں غبار
جامۂ تنگ میں جو تنگ رہا کرتے تھے | کیا شکنجے میں لحد کے ہیں گرفتارِ فشار
یا تو مجمع درِ دولت پہ تھا یا اب کوئی | فاتحے کو بھی لحد پر نہیں آتا زنہار
اُن کے مرنے کا ہوا حُسنِ جوانی کو یہ غم | بن کے بیٹھا ہے لحد پہ صفتِ ماتمدار
چشمِ عبرت سے سوے باغ جو جا کر دیکھا | کہہ رہی تھی یہی اک شاخ پہ اک بلبلِ زار

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روے گُل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تیغِ ابرو کو جو دیکھو تو ذرا آب نہیں | تیرِ مژگاں میں وہ تیزی نہیں پر تاب نہیں
سر جھکا عالمِ پیری میں ہوا خشک بدن | قدِ صنوبر نہیں چہرہ گُلِ شاداب نہیں
کفن و غسل کا نزدیک زمانہ آیا | خواہشِ آبِ روان و شبِ مہتاب نہیں
شاہدِ پیر غضب ہے جو کرے اب گرمی | طائرِ روح کم از طائرِ سیماب نہیں
آئینہ سامنے آتا ہے تو شرم آتی ہے | حوصلے مٹ گئے نخوت کے وہ اسباب نہیں
شوق کہتا ہے جھکاؤں تہِ ابرو کیا سر | قابلِ سجدہ یہ ٹوٹے ہوے محراب نہیں
موجۂ موے کمر یا کسی بچھو کا ہے نیش | دہنِ مار ہے اب ناف کا گرداب نہیں

نہ رہا نام کو بھی حسنِ لب و دنداں کا — لعل میں رنگ نہیں موتیوں میں آب نہیں
شبنم و ذرہ و خُربا کا نہیں نام و نشاں — اب تو وہ جلوۂ خورشیدِ جہاں تاب نہیں
نہ وہ پوشاک ہی رنگیں نہ وہ چہرہ سیمیں — داغ ہی داغ ہے لالہ نہیں مہتاب نہیں
کارواں ہے نہ خریدار نہ بازار نہ مصر — وصلِ یوسف کے خیالات بجز خواب نہیں
جو مکاں خانۂ عشرت تھے ہوئے ہُو کے مکاں — کثرتِ خلق نہیں مجمعِ احباب نہیں

کلکِ تقدیر کہ شرحِ خطِ رخسار نوشت
معنیش فاعتبروا یا اولوالابصار نوشت

نغمۂ صفی

(جناب مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی ملقب بہ لسان القوم)

پھرتی ہے جس کو گردشِ دوراں لیے ہوئے — دل میں ہے وہ غریب کچھ ارماں لیے ہوئے
خنجر نگاہِ عربدہ ساماں لیے ہوئے — گردن پہ خونِ گبر و مسلماں لیے ہوئے
چھیڑا اٹھا یوں ہی نشترِ مژگاں نے ایک بار — اب تک خلش ہے دل میں رگِ جاں لیے ہوئے
اہلِ جہاں سے اے دل امیدِ کرم نہ رکھ — ہر آستیں ہے دشنۂ پنہاں لیے ہوئے
آتا ہے کس حسیں کے نظارے کو صبحدم — آئینہ ایک مہرِ درخشاں لیے ہوئے
جھک جھک کے دیکھتا ہے مرے جوشِ آہ کو — گردوں چراغِ مہ تہِ داماں لیے ہوئے
ہر عندلیب کو ہے چمن در نگاہِ عشق — ہر گُل بغل میں ایک گلستاں لیے ہوئے
آندھی ہیں راہِ شوق میں شوریدگانِ عشق — دامن میں خاکِ کوچۂ جاناں لیے ہوئے
بیٹھا ہوں عرصگاہِ قیامت میں شرمسار — دامانِ تر میں گوہرِ غلطاں لیے ہوئے
اُدھڑی ہوئی رگوں سے ملاتا ہوں بار بار — ہاتھوں پہ چند تارِ گریباں لیے ہوئے
مرجھا گئی ہو جو وہ کلی پھر کھلے گی کیا — سینے میں دل ہے پہلوِ حرماں لیے ہوئے
جوششِ بہار کی وہ گل افشانیاں کہاں — رنگِ خزاں ہے اب چمنستاں لیے ہوئے
آتی نہیں نظر مجھے پہنچی ہے اتنی دور — لطفِ شباب عمرِ گریزاں لیے ہوئے
بے طرح آج ہے رُخِ طوفانِ ابر و باد — سمتِ سوادِ شامِ غریباں لیے ہوئے

یہ رنگ اور دعوئے اسلام کیوں صفی
بوتل بغل میں ہاتھ میں قرآں لیے ہوئے

تاریخ رحلت حضرت ریاض مرحوم

(جناب نواب فصاحت جنگ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مینائی)

ہند میں ایک ریاض باقی تھے — بادۂ معرفت کے جو ساقی تھے

وہ ریاضِ سخنورِ کامل — شاعرِ فرد جوہرِ قابل

عندلیبِ ریاضِ گویائی — مستِ صہبائے جامِ مینائی

یوسفِ کاروانِ شعر و سخن — کوکبِ آسمانِ شعر و سخن

آہ دُنیا سے ہو گئے راہی — غرقِ حسرت ہے مہ سے تا ماہی

اُن سے قصرِ جناں وہاں روشن — بجھ گیا یاں چراغِ بزمِ سخن

لطفِ حق سے اُدھر وہ ہم آغوش — مجمعِ دوستاں اِدھر بیہوش

اُن کی تربت میں پھول جنت کے — یاں چبھے دل میں خار حسرت کے

وہ اُدھر عیشِ جاوداں کے لیے — ہم اِدھر نالہ و فغاں کے لیے

جامِ کوثر وہاں ہیں بہرِ ریاض — آنکھیں یاں خوں فشاں ہیں بہرِ ریاض

محوِ حور و قصور وہ ہیں اُدھر — یاں ہے زخموں سے چور قلب و جگر

سحر و افسوں تھا ہر کلام اُن کا — شہرۂ روزگار نام اُن کا

شعر مستانہ اُن کا حصہ تھا — مے و مینا نہ اُن کا حصہ تھا

ہر غزل ایک میکدہ پُر جوش — جس کا ایاغ تھا بادۂ بنوش

اثر اس نشہ کا خراب نہیں — مئے اطہر ہے یہ شراب نہیں

شوخیِ طبع اُن کی فطرت میں — مستیِ عشق اُن کی طینت میں

اُن کے احباب اُن کے پروانے — ایسے پروانے جیسے دیوانے

نثر بھی مثلِ نظم دلکش تھی — خلق شیدا تھی۔ لوٹ تھی۔ غش تھی

ایک اخبار تین افسانے — بادۂ نثر کے تھے مینا نے

چھپ کے نکلا نہیں ابھی دیواں — گنجِ مخفی کی شکل ہے پنہاں

سرد بزمِ مئے سخن ہے جلیل — جائے صہبا ہے اُن کا ذکرِ جمیل

کہہ گیا یہ چھلک کے جامِ ریاض — چمنِ خلد ہے مقامِ ریاض

۱۹۳۴ء

فریبِ خواب

(جناب "ابو عمر" صاحب لکھنوی)

دیکھا شبِ فراق میں اک مضطرب نے خواب — فردوسِ انبساط کا اک کُھل گیا ہے باب

مائل ہوا ہے حسن بعد نازِ عشق پر — میں ہوں حریمِ ناز میں قسمت سے باریاب

تاباں فروغِ حسن سے دیوار و در تمام — تابش فزا ستارۂ قسمت کی آب و تاب

اک نازنیں ہے خلوتِ راز و نیاز میں — ہے وقفِ انتظار، پریشانِ اضطراب

شوخی چھپی ہوئی ہے حیا و حجاب میں — بچپن کی سادگی میں ہے لیکن ابھی حجاب

دل کو نصیب نسبتِ حسنِ نظر ہے آج — حاصل ہے چشمِ شوق کو بھی فخرِ انتساب

بیتابیوں سے عشق کی ناآشنا ہے حسن — بیگانہ وش ابھی ہے وہ بیگانۂ شباب

میں مستِ جوشِ عیش، وہ ہے اس سے بیخبر — میں رندِ بے حجاب، وہ ہے پیکرِ حجاب

ڈوبا ہے اضطراب میں یاں جوشِ آرزو — معصومیت میں غرق وہاں جوشِ اضطراب

چشمِ اُمید دستِ نگر ربط و ضبط کی — آمادہ چشمِ ناز کہ ہو جائے محوِ خواب

میری نگاہِ شوق ہے مصروفِ التجا — اُسکی نگاہِ شرم ہے سرگرمِ صد عتاب

گستاخیوں پہ دستِ ہوس ہے تُلا ہُوا — نازک مزاجِ یار میں برپا ہے پیچ و تاب

اُکتا کے میری عرضِ تمنائے شوق سے — چشمِ غضب نے اُٹھ کے دیا خشمگیں جواب

فرمانِ تیغِ ابروِ خمدار "دُور باش" — چینِ جبیں کا حُکم کہ "زیں حلقہ سر متاب"

چشمِ عتابِ حسن نے بیدار کر دیا — آنکھیں کھُلیں تو دیکھ لیا دَورِ انقلاب

وہ جوشِ عیش ہے، نہ وہ ہے جوشِ آرزو — وہ دَور دہر ہے نہ وہ ہے رشکِ آفتاب

اب دل ہے لخت لخت، جگر داغ داغ ہے

میں ہوں فریب خوردۂ نقش و نگارِ خواب

اے انتظار تو نے!

(جناب مولوی محمد اسحاق صاحب مائل انصاری خیرآبادی)

آنکھوں کی نیند اُڑائی کس شوخ حیلہ جو نے — دھوکے میں مجھ کو ڈالا ہے کس کی گفتگو نے
بیتاب کر دیا ہے دل کو کس آرزو نے — کیسا کیا پریشاں اے انتظار تو نے

اے انتظار تو نے!

وہ بار بار میرا راہِ اُمید تکنا — ایفائے عہد پر وہ دل کا مرے دھڑکنا
مایوس ہو کے کیا کیا کچھ بیٹھے بیٹھے بکنا — کس درجہ بوکھلایا اے انتظار تو نے

اے انتظار تو نے!

وہ بدگمان ہونا وہ پیچ و تاب کھانا — دنیائے آرزو میں ہیجان سا اُٹھانا
سو سو طرح سے دل کو باتوں میں پھر لگانا — کھایا نہ رحم مجھ پر اے انتظار تو نے

اے انتظار تو نے!

وہ دل کا مُسکرانا، وہ عالم تخیّل — ہوش و حواس کا وہ ہو جانا محو بالکل
پھولے نہیں سمانا میرا وہ صورتِ گل — ہنس ہنس کے خوں رُلایا اے انتظار تو نے

اے انتظار تو نے!

وہ راہ چلنے والوں پر اشتباہ ہونا — کچھ دیر تک اُنھیں پر قائم نگاہ ہونا
پھر نا امید ہو کر دل کا تباہ ہونا — تڑپایا خوب مجھ کو اے انتظار تو نے

اے انتظار تو نے!

آہٹ ذرا جو پائی میں سمجھا کوئی آیا — سر جو جھکا ہوا تھا فوراً اُسے اُٹھایا
افسوس اے نگاہو! پھر بھی نہ کچھ دکھایا — بھٹکایا مجھ کو کیا کیا اے انتظار تو نے

اے انتظار تو نے!

آتے ہی ہوش اُڑ گئے "مائل" یہ دل ہی دل میں کہنا — اس آرزو میں میرا محوِ نظارہ رہنا
غمہائے ہجر اپنے تاب و جگر پہ سہنا — یہ ظلم کس سے سیکھے اے انتظار تو نے

اے انتظار تو نے

ہندو مسلمانوں میں اتحاد کیونکر ہو سکتا ہے؟

کانپور کی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشیں

(سلسلۂ ماہ گزشتہ)

(از ظفر الملک)

(ب) سیاسی و اقتصادی سفارشات

اب ہم سیاسی و اقتصادی سفارشات بیان کریں گے:-

(۱) ہمارا کام فنڈامنٹل رائٹس کمیٹی (بنیادی حقوق کی کمیٹی متعینہ کراچی کانگریس) کی سرگرمیوں کے بدولت بہت کم ہو گیا۔ ساتھ ہی اُسکے ہمارا خیال ہے کہ کانگریس کو اہلِ ہند کے روبرو سواراج کی مکمل تر تجویز کا خاکہ رکھنا چاہیے جس میں افراد کے حقوق و فرائض کا ذکر ہو، کانگریس کی اقتصادی پالیسی درج ہو اور وہ طریقے بیان کیے جائیں جن کے ذریعہ سے ایک آزاد، دیانت دار اور آزمودہ کار مجلس واضع قوانین حاصل ہو سکے۔ سواراج کی یہ تجویز ایسی ہو جو ہندو اور مسلمانوں کو یکساں طور پر اس بات کا یقین دلا سکے کہ کانگریس سب کے اخلاقی و مادی مفاد کے لیے غیر جانبدارانہ طور پر کوشاں ہے اور کسی ایک فرقہ کے مقابلہ میں دوسرے فرقہ کی ہوا خواہ نہیں ہے۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، زمیندار ہوں یا کسان، سرمایہ دار ہوں یا مزدور۔ کانگریس کو چاہیے کہ جو جماعتیں اقلیت میں ہوں اُن کے خطرات دُور کرے اور تمام طبقوں کے غربا کو اطمینان دلائے کہ سواراجی حکومت اُنکی فلاح و بہبود کے خیال کو سب سے مقدم رکھے گی۔

جب ایسی تجویز مرتب ہو جائے تو اس کی موافقت میں زور شور سے پرچار کیا جائے۔

(۲) کانگریس کے دستور العمل میں اس مقصد سے تبدیلیاں کی جائیں کہ عہدہ داروں اور مجلس انتظامی کے اراکین کے انتخاب کے لیے خاص صفات لازمی قرار پائیں۔ ہماری رائے میں اُن میں حسب ذیل صفات ہونا چاہیے:-

(الف) صوبہ وار اور ماتحت مجالس کے اراکین کی عمر کم سے کم ۲۵ سال اور کل ہندوستان کی مجلس کے اراکین کی عمر ۳۰ سال ہونا چاہیے۔

(ب) وہ کم سے کم ۵ سال تک کانگریس کے معمولی رکن رہ چکے ہوں۔

(ج) وہ کسی ایسی فرقہ دار انجمن کے رکن نہ ہوں جو ہندوؤں، مسلمانوں یا سکھوں کی جماعت کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرتی ہو۔

(د) وہ یہ یقین رکھتے ہوں کہ ملک کے موجودہ حالات میں عدم تشدد ہی کا وہ واحد طریقہ ہے جس پر سوراج حاصل کرنے کے لیے عمل پیرا ہونا چاہیے اور تشدد کی جس قدر کارروائیاں ہماری سیاسی جنگ کے سلسلے میں کی جائیں گی وہ ہمارے مقصد کے لیے نقصان رساں ہوں گی۔

(۳) فرقہ دار رہنماؤں کی پالیسی اور طریق کار کی خاص کر اسی فرقہ کے لوگوں کو مذمت کرنا چاہیے یہ بات پوری سرگرمی سے واضح کر دینا چاہیے کہ فرقہ دار جماعتوں سے سب فرقوں کے مفاد کو نقصان پہونچتا ہے جبکہ کانگریس ملک کے ہر باشندے کے فائدہ کے لیے کام کرتی ہے اور اس امر کے لیے کوشاں ہے کہ بنیادی آسایش کی ضروریات ایسے طور پر تقسیم ہوں کہ افلاس دُور ہو جائے۔ اور ہر شخص کو بسر اوقات کے لائق آمدنی ہو۔ اور اس طرح مختلف اقوام و طبقہ جات اور "دار" و "نادار" کے درمیان باہمی تصادم کا خطرہ نہ رہے۔

(۴) ہماری سختی کے ساتھ یہ رائے ہے کہ مذہب کی بنیاد پر جداگانہ انتخاب کے طریقے کو موقوف کر دینا چاہیے اور کانگریس کو کسی نہج سے اسکے برقرار رہنے پر راضی نہ ہونا چاہیے۔

منجملہ ۲۶ مسلمان شاہدوں کے جن سے ہم نے اس بارے میں سوالات کیے، ۹ انے جداگانہ انتخاب کے طریقے کو مردود قرار دیا، اور موجودہ فرقہ دارانہ بدمزگیوں کو بہت کچھ اسی کا نتیجہ ظاہر کیا۔ صرف سات نے اسکی تائید کی۔

بطور اصول کے ہم مذہب کی بنیاد پر مخصوص نشستوں کے خیال سے بھی اختلاف رکھتے ہیں لیکن بنظر اسکے کہ بعض اقلیت والی جماعتوں کے کثیر افراد میں شکوک اور اندیشے جاگزیں ہیں، ہمارا خیال ہے کہ ایک معینہ مدت کے لیے اقلیت والی جماعتوں کو مخصوص نشستیں دی جائیں۔

ہمیں یقین ہے کہ نئے اعتماد اور امیدوں کی بدولت جو بہتر اور زیادہ قومی تخیل پیدا ہوگا وہ علبد اس تخصیص کو غیر ضروری بنا دے گا۔

(۵) کانگرس کو فرقہ دار مجالس سے فرقہ دار حقوق کے تصفیہ کی کوشش ترک کر دینا چاہیے۔ اسے جب کبھی ضرورت پیش آئے ساری قوم کے نمایندہ کی حیثیت میں حکومت سے گفت و شنید کرنا چاہیے۔

(۶) ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے حملوں سے بچانے کے لیے جداجدا منظم کرنے کی تمام کوششیں جیسی کہ سنگھٹن اور تنظیم کی غرض سے موقوف کر دینا چاہیے۔

(۷) تمام فرقہ دار رضا کاروں کی جماعتیں مثل مہابیر دل اور علی غول کے توڑ دی جائیں اور ہندوؤں

اور مسلمانوں دونوں کے مشترکہ رضاکاروں کی جمعیتیں ترتیب دی جائیں۔

(۸) کانگریس کے ہر رضاکار سے اس بات کی قسم لی جائے کہ جب کبھی اُسکے حلقہ میں ہندو مسلمانوں میں فساد ہوگا تو وہ اس امر کی انتہائی جد و جہد کریگا کہ دونوں فرقوں میں صلح ہو جائے اور ناطرفداری کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مدد کریگا، اور اگر خود اُس پر حملہ کیا جائے تو جوابی حملہ نہ کریگا۔ بلکہ اتحاد کے مقصد کے خاطر تکلیف برداشت کریگا۔

(۹) ایک فرقہ کی کسی جماعت کی جانب سے دوسرے فرقہ کے لوگوں کے اقتصادی مقاطعہ کی جتنی کوششیں ہوتی ہیں وہ بدمزگی اور تصادم کا مستقل ذریعہ بن جاتی ہیں اور دونوں طبقوں کے بہترین مفاد کو نقصان پہونچاتی ہیں۔ اسکا پُر زور طریقہ پر استیصال کرنا چاہیے۔

(۱۰) دونوں جماعتوں کے افراد کے درمیان اقتصادی اشتراک عمل کو بڑھانا چاہیے۔ بنک، بیمہ، تجارت، اور صنعت و حرفت کے کام متحدہ کوششوں سے جاری کرنا چاہیے۔

(۱۱) خاص کوششیں اس امر کی ہونا چاہیے کہ کانگریس کا پرچار غریبوں، کسانوں، مزدوروں اور بیکاروں میں ہو ——— کانگریس کا اقتصادی نظام عمل خاص طور پر اُن کو سمجھایا جائے تاکہ یہ امر اُن پر بخوبی واضح ہوجائے کہ ہندوؤں مسلمانوں، اونچی اور نیچی ذات والوں سب کو بدیسی حکومت اور سوسائٹی کی موجودہ تنظیم کے ماتحت باقی رہنے سے یکساں نقصان پہونچتا ہے اور اُن کی اقتصادی حالت اُسی وقت بہتر ہوسکتی ہے کہ وہ سب مل کر مشترکہ اغراض کے لیے جد و جہد کریں۔

(۱۲) فرقہ وارانہ اتحاد کو مستحکم کرنے، مقامی ضروریات کے نگراں رہنے اور مقامی بورڈوں اور حکام کی کارروائیوں پر نظر رکھنے کے لیے جہاں تک ممکن ہو مشترکہ ہندو مسلم پنچایتوں اور اُنکے تحت میں مشترکہ رضاکار جمعیتوں کو وسعت دی جائے۔

(۱۳) کانگریس کے تمام جلسوں اور جلوسوں میں تشدد انقلاب پسندوں کے لیے "ہائے ہائے" "جے"! "زندہ باد" کے نعرے لگانا موقوف کیے جائیں۔

(۱۴) پکٹنگ (دھرنا) کی طرح ہڑتالیں بھی کلیۃً پُرامن ہوں۔ کسی طرح کی زبردستی ہرگز نہ کی جائے۔

(ج) تمدنی و معاشرتی سفارشات

اب ہم اپنی تجاویز کے تیسرے حصہ یعنی تمدنی و معاشرتی سفارشات پر آتے ہیں :-

(۱) ہر ہندو اور ہر مسلمان کو دوسری جماعت میں سے کم سے کم ایک شخص کو اپنا دوست بنانا چاہیے۔ جس سے اس امر میں مدد ملیگی کہ ہر جماعت کے نقطۂ نظر کو دوسری جماعت کے لوگ بہتر طریقے پر سمجھ سکیں۔

(۲) ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں میں ایک دوسرے کی شرکت روزافزوں ہونا چاہیے۔ موجودہ تہواروں میں سے بعض کو جیسے کہ ہولی، دیوالی، عیدالفطر اور شب برات ہیں دونوں جماعتوں کے مشترک تہوار کی حیثیت دی جائے۔ اور نئے مشترک قومی تہوار رائج کیے جائیں۔

(۳) تفریح اور دلچسپی کے لیے مشترکہ کلب اور دارالمطالعے اور مجلسیں قائم کی جائیں۔

(۴) ملک کے تمام باشندوں کو چاہیے کہ اپنے تئیں ہندی یا ہندوستانی کہیں اور لباس وضع کے ایسے اختلافات کو مٹائیں یا کم سے کم ان میں تخفیف کریں جن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے امتیاز میں بدنمائی پیدا ہوتی ہو۔ خیالات میں یکسانیت اور باہمی مودت پیدا کرنے کا یہ خاص ذریعہ ہوگا۔

(۵) پردہ موقوف کرنے کے لیے خاص کوششیں کرنا چاہیے، مگر ایسی احتیاطوں کے ساتھ جن کی ہندوستانی سوسائٹی کی بہترین روایات متقاضی ہوں —— ہندو اور مسلمان خواتین باہم گرز اندمیل جول پیدا کریں اور عورتوں کو مفاد عامہ کے کاموں میں زیادہ حصہ لینے کی ترغیب دی جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ پردہ کے اُٹھ جانے پر ہندو مسلم اتحاد کی راہ سے ایک بڑی رکاوٹ دفع ہو جائیگی۔

(۶) اچھوت پن، سوائے اس صورت کے کہ نامسانی اور خاص امراض کے تعلق میں ہو، موقوف ہونا چاہیے۔ کوئی انسان یا کسی انسان کا کھانا پانی ایسا متبرک متصور نہ ہو کہ کسی خاص ذات یا عقیدہ کے دوسرے انسان کے صرف چھو جانے سے ناپاک ہو جائے۔

(۷) اکثر شکایت کی جاتی ہے کہ میونسپلٹی یا دوسرے مقامی (نیم سرکاری) اداروں میں جہاں کوئی ایک جماعت برسر اقتدار ہوتی ہے تو انتخابی عہدوں، ملازمتوں، مالی امدادوں اور ٹھیکوں کی تقسیم میں نیز کسی خاص جماعت کے معاشرتی و مذہبی امور، تجارت اور پیشوں، گوشت کی دوکانیں کھولنے اور ہندوستانی زبانوں کی تعلیم اور مدارس کے متعلق ضمنی قواعد بنانے میں فرقہ وارانہ طرفداری کی جاتی ہے۔

اس قسم کے حالات جہاں کہیں اور جس حد تک بھی پائے جاتے ہوں نہایت درجہ قابل ملامت اور قومیت کے مخالف ہیں۔ ہر جگہ انکو روکنا اور موقوف کرنا چاہیے۔ مقامی مشترک پنچایتیں اس معاملہ میں بہت کچھ معین ہو سکتی ہیں۔

(۸) چوپایوں کا ذبیحہ جس میں مذہبی قربانیاں بھی شامل ہیں عام ملکی قوانین کے ماتحت ہونا چاہیے۔ جو حفظان صحت اور اخلاق عامہ پر نظر رکھ کر بنائے جائیں۔ گائے کی قربانی میں اس سے زیادہ کسی کو دخل نہ دینا چاہیے جتنا کہ بکرے، بھیڑ یا بھینس کی قربانی میں دخل دیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں کسی کی جانب سے اس بارے میں مداخلت کی جائے کانگریس والوں کا فرض ہونا چاہیے کہ مداخلت کے خلاف ستیاگرہ کریں۔

البتہ باہمی رضامندی سے جو رواج قائم ہوا ہو یا جو تصفیہ کیا گیا ہو اُس میں اس طرح پر دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

(۹) مساجد کے قرب میں باجہ بجانے پر کسی کو اس سے زائد مداخلت نہ کرنا چاہیے جتنی کہ مساجد اور مندروں کے قرب میں کسی دوسری قسم کی آوازوں پر کی جاتی ہے۔

جہاں کسی کی جانب سے اس بارے میں مداخلت کی جائے کانگریس والوں کا فرض ہونا چاہیے کہ مداخلت کے خلاف ستیاگرہ کریں۔

البتہ باہمی رضامندی سے جو رواج قائم ہوا ہو یا جو تصفیہ کیا گیا ہو اُس میں اس طرح پر دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

(۱۰) ہندوؤں کو چاہیے کہ موجودہ موروثی ذاتوں کے طریقوں کو معہ بیشمار گوتوں کے موقوف کردیں اور چار خاص ذاتوں (ورنوں) کی بنیاد کو جا مد وراثت کے اصول سے ہٹا کر پیشہ کی نوعیت اور درجہ پر قائم کریں (یعنی (۱) اہل علم کے لیے علمی پیشے (۲) ارباب عمل کے لیے انتظامی پیشے (۳) اصحاب طلب کے لیے پیدائش زر کرنے والے پیشے اور (۴) اُن لوگوں کے لیے جو ذہنی اعتبار سے ان تینوں کی طرح ترقی یافتہ اور تعلیم پذیر نہیں اور جو انکو صرف حقیر کاموں میں مدد دے سکتے ہیں محنت کے پیشے۔ سوراجی حکومت کا یہ فریضہ ہوگا کہ زندگی کے خاص انعامات یا عطایا یعنی (۱) عزت (۲) اقتدار (۳) دولت اور (۴) تفریح اور بسر اوقات کے خاص ذرائع یعنی (۱) عام اور شخصی وظائف (۲) کرایہ یا عام تنخواہیں (۳) تجارت اور (۴) کافی اجرتیں سب کو ان چاروں طبقات میں ایسے مناسب طریقے پر تقسیم کرے کہ غربت اور ثروت کی انتہائی حالتیں باقی نہ رہیں، ضروریاتِ زندگی سب کو یقینی طور پر حاصل ہوں، رشک و حسد کے مواقع کم ہو جائیں اور کار خیر کی تحریک زیادہ سے زیادہ بڑھ جائے۔

ذات پات کا موجودہ طریقہ جو داخلی طور پر انتشار کا باعث ہے اور آپس میں ایک کو دوسرے سے جدا کیے ہوئے ہے، اس طرح سے اگر ایک ایسی معاشرتی تنظیم میں تبدیل ہو جائے جس میں باہم کر معاونت کرنے والی مختلف پیشہ والوں کی ایسی جماعتیں ہوں جن میں سے ہر ایک کا وجود دوسرے پر منحصر ہو تو مسلمان عیسائی اور دیگر تمام مذاہب کے پیرو بھی اپنے عقائد میں کوئی تبدیلی کیے بغیر ان جماعتوں میں شریک ہو سکیں گے۔

ہم نے وہ تجاویز پیش کردی ہیں جو ہمارے خیال میں اُس معاشرتی سیاسی و مذہبی مخالفت کا انسداد کرنے میں معین ہوں گی جو فی زمانہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو جدا کیے ہوئے ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ بیماری ہمارے

معاشرتی نظام کی تہ تک پہونچ چکی ہے اور طریقۂ علاج لازمی طور پر دھیما اور تدریجی ہوگا اس لیے ہماری بہت سی تجاویز بظاہر ایسی ہیں جو تمام فوراً عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔ اُن پر عملدرآمد کے لیے مسلسل توجہ نگرانی اور استقلال کی ضرورت ہوگی۔ اس بنا پر ہماری آخری تجویز یہ ہے کہ کانگریس کو ایک مستقل مجلس بنانا چاہیے جسکے ارکین ایسے اصحاب ہوں جو ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے سئلے سے گہری دلچسپی رکھتے اور اس مقصد کے واسطے کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ مجلس دوسرے تمام کاموں کو چھوڑ کر ہمہ تن اُس خاص مدعا کے حصول ہی کے لیے کام کرے۔ سیاسی مشاغل سے نسبتاً آزاد ہونے کی بنا پر اُسکو ایسے طبقات آبادی میں کام کرنے کا بہتر موقع حاصل ہوگا جو سیاسی جد وجہد کے دائرہ سے باہر ہیں اور جن پر اس بیماری (نفاقِ باہمی) نے سب سے زیادہ قبضہ حاصل کر رکھا ہے۔

بے شبہہ کانگریس نے وقتاً فوقتاً اس مسئلہ پر اپنی توجہ مبذول کی ہے مگر اُسکی پالیسی کا رُخ اب تک مسئلہ کے سیاسی پہلو پر اور اُن مخصوص حالات پر رہا ہے جو وقتی طور سے رونما ہوتے رہے۔ لیکن اب ہماری رائے میں وقت اس کا ہے کہ کانگریس تعمیری ڈھنگ میں اہل ملک کی معاشرتی زندگی پر اُسی طرح پُرزور اور موثر طریقے پر اثر انداز ہو جس طرح کہ وہ اُنکی سیاسی زندگی پر اثر ڈال رہی ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ ہم ایک نئے تجربہ کا مشورہ دے رہے ہیں مگر ہماری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ یہ تجربہ اس لائق ہے کہ اس کی ضرور آزمائش کی جائے۔ اگر یہ کامیاب ہوا تو ہندو مسلم مسئلہ کا مستقل حل ہاتھ آجائے گا اور اگر اس مقصد کو تمامہ حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہو تب بھی بہت سی مشکلات میں اس کے ذریعہ سے کمی ضرور ہو جائے گی۔

جو سفارشیں ہم نے تجویز کی ہیں، اُن پر عمل درآمد کرنے کی خدمت اسی مجلس کے سپرد ہونا چاہیے۔ (جسکے بنانے کا اوپر مشورہ دیا گیا ہے)

تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشیں تمام ہوگئیں۔ آیندہ اختلافی یادداشتوں کے ضروری اجزا اور دیگر امور متعلقہ پیش کیے جائیں گے۔ اس خیال سے کہ لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو یہ امر ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ یہ سفارشیں کمیٹی کی اکثریت کی منظور کردہ ہیں یا مختلف الخیال ارکین کے درمیان مفاہمت کا نتیجہ۔ البتہ راقم الحروف کے معتقدات و خیالات چونکہ اکثریت کے خیالات سے تمام امور میں متفق نہ ہو سکے اس بنا پر اپنی یادداشت میں اُن اختلافات کی وضاحت کر دی۔

نظرے خوش گزرے

یہ پرچہ اچھا خاصہ "اودھ نمبر" بنگیا ہے، اس لیے کہ ایک طرف اسی پرچہ میں اودھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تجویز پیش کی جا رہی ہے اور دوسری طرف محض اتفاقی طور پر بغیر کسی خاص اہتمام کے صرف ایک مضمون اور ایک غزل کو شامل نہ کرنے سے یہ رسالہ تمامتر اودھ کے اہل قلم کی جولاں گاہ بنگیا ہے، اور اس میں کوئی مضمون نظم و نثر دوسرے صوبجات کے دوستوں حتیٰ کہ صوبہ آگرہ کے احباب کا بھی نہیں ہے۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ انتظامی تقسیم کے ساتھ ساتھ ہم لسانی و ادبی تفریق کے بھی حامی ہیں۔ اردو کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان بنانے کی جد وجہد کرنے والے سے اس قسم کا اندیشہ نہ رکھنا چاہیے اور امید ہے کہ الناظر کے قلمی معاونین کو، جو سارے ملک میں پھیلے ہوے ہیں، اس سے کوئی بدگمانی نہ پیدا ہوگی۔

برادر مکرم منشی امیر احمد علوی صاحب رمضان میں علیل ہو گئے، اس سبب سے "اسرائیلیات" کا دلچسپ سلسلہ فی الحال رک گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد شفا بخشیں۔ صاحب ممدوح نے آخری تاجدار دہلی بہادرشاہ ظفر کے متعلق عرصہ ہوا رسالہ شمع (آگرہ) میں متعدد نہایت دلچسپ مضامین لکھے تھے۔ اب انھیں کو بڑھا کر ظفر کی سوانحعمری مرتب ہوگئی ہے جو انشاء اللہ تھوڑے ہی دنوں میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر ارباب ذوق تک پہونچیگی۔ کتاب کا حجم اندازاً دو سو صفحہ کے قریب ہوگا اور قیمت ایک روپیہ سوا روپیہ۔ جو شایقین اپنی فرمائش درج کرانا چاہیں "الناظر بک ایجنسی" کو اطلاع دیں۔ تاکہ کتاب تیار ہوتے ہی ارسال خدمت کی جائے۔

حضرت ریاض مرحوم کے متعلق کئی مضامین اور تاریخیں آئی ہوئی رکھی ہیں اور غالباً ابھی اور اصحاب بھیجتے رہیں گے۔ جنکی اشاعت بھی انشاء اللہ تدریجاً ہوتی رہیگی۔ اس طرح امید ہے کہ سال بھر تک برابر مرحوم کا ذکر خیر جاری رہے گا۔

الناظر کے ابتدائی پرچوں کی تقسیم کچھ اس طرح ہوئی کہ تھوڑی سی ششماہی جلدیں مرتب ہونے کے بعد اگست کا کوئی پرچہ نہیں بچا، نہ قسم عام کا اور نہ ارزاں قسم کا۔ البتہ جولائی کے کچھ پرچے بچے ہیں، اور باقی مہینوں کے کافی تعداد میں ہیں۔ جو صاحب چاہیں قیمت بذریعہ ٹکٹ ارسال فرماکر منگالیں قیمت کی شرح حسب ذیل ہے:۔

قسم عام فی پرچہ ۵ر
اعزاز قسم فی پرچہ ۲ر } مع محصول ڈاک

جن اصحاب کے پاس اگست کے پرچے زائد از ضرورت ہوں وہ دفتر الناظر کو مرحمت فرمائیں تاکہ جن شایقین کی جلدیں نامکمل ہیں اُن تک پہونچائے جائیں۔ دفتر سے اُن پرچوں کی قیمت مل جائیگی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس گزشتہ سال میرٹھ میں ہوا تھا، اور اب کی آگرہ میں منعقد ہوگا۔ اسی کانفرنس کی صوبہ وار شاخ کا سالانہ جلسہ ابھی دو ماہ ہوئے، منظفرنگر میں ہوا تھا۔ اس قدر جلد جلد ایک ہی صوبہ میں ان کانفرنسوں کا انعقاد سوائے اسکے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ان مجالس کو خود اپنے وجود کا قوم کو یقین دلانا ہے۔ صوبہ کی انجمن جب سرگرم کار ہے تو مرکزی انجمن کو دوسرے علاقوں پر توجہ کرنا چاہیے جہاں ان صوبجات سے زیادہ اشاعت تعلیم کی ضرورت ہے۔ علی الخصوص اُن صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی اور جہالت دونوں زائد ہیں۔ یہاں تو ایک چھوڑ پانچ پانچ یونیورسٹیاں موجود ہیں اور تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد روز افزوں۔

ایجوکیشنل کانفرنس نے گزشتہ دور میں کافی کام کیا ہے مگر جب سے نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی اسکے معتمد ہوئے ہیں، کانفرنس کی سرگرمی اور جوش عمل میں فرق آگیا ہے۔ نواب صاحب کے مخلص، دیندار، علم دوست اور صحیح الخیال بزرگ ہونے کی بنا پر اس قسم کے عہدوں پر انکا انتخاب کردیا جاتا ہے مگر اول تو .... رئیسوں سے اسکی توقع ہی نفضول ہے کہ وہ اُن لوگوں کی سی سرگرمی و مستعدی سے کام کرسکیں گے جو عام طور پر محنت و جفاکشی کی زندگی بسر کرتے ہوں۔ اسکے سوا نواب صاحب طبعاً بہت سکون پسند ہیں۔ انکے لیے معتمدی کے بجائے صدارت کی کرسی زیادہ موزوں ہے۔ انجمن ترقی اردو کے بھی ایک زمانہ میں وہ معتمد بنا دیے گئے تھے اور باوجودیکہ ادب و شاعری سے صاحب ممدوح کو خاص شغف ہے مگر معتمد کی حیثیت سے اُنکا عہد کامیاب نہیں ہوا۔

ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے "مسلمانوں کے افلاس کا علاج" کے نام سے ایک رسالہ شایع کیا گیا ہے جو دراصل کانفرنس کی ایک منتخب کمیٹی کی رپورٹ ہے۔ اس میں مسلمانوں کے مالی انحطاط کے وجوہ و علل سے بحث کی گئی اور اُسکے انسداد و تدارک کے لیے بعض تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ رپورٹ کے مرتب ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب، مولوی سید طفیل احمد صاحب جائنٹ سکرٹری ایجوکیشنل کانفرنس، اور حافظ محمد ابراہیم صاحب وکیل نگینہ ہیں۔

رپورٹ کی تجاویز کو بنیاد قرار دیکر ایجوکیشنل کانفرنس نے غور و بحث کے بعد جو سفارشات منظور کی ہیں وہ رپورٹ کے ساتھ دو ورق پر الگ چھپی ہوئی دفتر کانفرنس (سلطان جہاں منزل۔ علیگڈھ) سے مل سکیں گی۔

ہم نے اس رسالہ کو بہت دلچسپی سے پڑھا۔ اور اُن سفارشات کا جو افلاس کے دفعیہ کے لیے پیش کی گئی ہیں کافی غور سے مطالعہ کیا۔ چونکہ یہ کمیٹی بزم تعلیمی کی بنائی ہوئی تھی، اس لیے قدرتاً اسکا نقطۂ نظر بہت کچھ تعلیمی رہا۔ اگر ایسے لوگ اس کمیٹی میں شریک ہوتے جو اقتصادیات، مالیات، صنعت و حرفت اور تجارت سے اُسی قدر باخبر ہوتے جس قدر ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب وغیرہ تعلیمی امور سے واقف ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ سفارشات زیادہ جامع اور مفید ہوتیں۔

کانفرنس کی منظور کردہ سفارشات میں سے ۱۵ تو وہ ہیں جن کا تعلق بڑی حد تک تعلیم، درسگاہوں، امتحانات اور بالآخر ملازمت سے ہے حالانکہ ملازمت کے ذریعہ سے کچھ ہی لوگوں کی شکم پری یا آسودگی ممکن ہے کیونکہ ملازمتوں کی تعداد محدود ہے اور رہیگی، اور اسکی آمدنیاں بھی ہمیشہ محدود رہیں اور رہیں گی۔ اب جاگیروں کا زمانہ نہیں رہا اور جو تعلقے یا زمینداریاں باقی ہیں وہ بھی چند روز کی مہمان نظر آتی ہیں۔

باقی ۸ تجاویز صنعت و حرفت کے بارے میں ہیں۔ ان میں سے دو جو بنک سے متعلق ہیں، سود کی لعنت کا طوق گردن میں ڈالے ہوئے خود اپنے غیر اسلامی ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہیں۔ البتہ باقی تجاویز کارآمد ہوسکتی ہیں۔ مگر ایک خاص فروگذاشت کی بنا پر اندیشہ ہے کہ کمیٹی کی رپورٹ اور کانفرنس کی سفارشات سے زیادہ فائدہ نہ پہونچے گا۔

کانفرنس پر یہ الزام بہت پُرانا ہے کہ وہ بکثرت تجاویز ہر سال منظور کر دیا کرتی ہے اور پھر سال بھر تک اس کی خبر نہیں لیتی کہ اُن پر عمل کس حد تک ہوا۔ گورنمنٹ سے جو سفارشات کی جاتی ہیں یا حکام سے جن تجاویز کا تعلق ہوتا ہے، اُنکے متعلق تو چند جانے یا کانفرنس کے دفتر سے مراسلت کی اطلاع کبھی کبھی ملتی بھی ہے لیکن جن تجاویز کا تعلق قوم سے ہوتا ہے وہ عموماً شرمندۂ عمل نہیں ہوتیں۔

مریض افلاس کے لیے صرف حکماے حاذق کی تشخیص اور نسخہ نویسی اگر کافی ہوتی تو زیبا کہنا تھا۔ مگر حالت یہ ہے کہ اول تو مریض کو اپنے مرض کی شدت کا احساس نہیں، اس لیے وہ علاج کی ضرورت ہی نہیں جانتا۔ دوسرے دوا قیمتی ہے، جسکی فراہمی آسان نہیں۔ تیسرے ترکیب استعمال سے نہ خود اُسکو پوری واقفیت ہے نہ کوئی فہمیدہ تیماردار میسر ہے۔ اور چوتھے وہ حد درجہ کا بد پرہیز واقع ہوا ہے۔

اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ضرورت اسکی تھی کہ کانفرنس کی جانب سے دردمند مسلمانوں کی ایک ذیلی مجلس اس غرض کے لیے بنائی جاتی کہ وہ مسلمانوں کو انکے مرض افلاس سے پوری طرح آگاہ کرے، اسباب

عمل سمجھانے، دفعیہ کی تدابیر بتائے، اُن تدابیر پر عمل کرنے کی راہیں پیدا کرے اُس بات کی نگراں رہے کہ جن لوگوں نے اُن کی بتائی ہوئی تجویزوں پر عمل کیا ہے وہ کس حد تک اس بیماری سے نجات پا سکے، اور اگر اُنکے عمل میں غلطیاں ہوں تو اُنکی اصلاح کرتی رہے۔ غرضکہ ہر منزل پر اُنکی نگرانی و امداد کرتی رہے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں اسی کانفرنس کے ماتحت شعبۂ اصلاح تمدن قائم کیا گیا تھا مگر مسلمانوں کی بدقسمتی سے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی علیحدگی کے بعد یہ اہم ترین شعبہ دفن کر دیا گیا اور اب شاید کہیں اُس کا نشانِ مزار بھی باقی نہیں۔

اصلاح تمدن کا کام اگرچہ موجودہ انگریزی داں طبقہ کے ہاتھ میں رہنے کے قابل نہیں اس لیے کہ اُس کے میلانات و رجحانات مشرقی سے زیادہ مغربی اور اسلامی سے زیادہ افرنجی ہوتے جاتے ہیں، لیکن اگر ایک ایسی جماعت ترتیب دی جا سکے جس میں دیندار انگریزی تعلیم یافتہ اور باخبر علماء شامل ہوں تو اصلاح تمدن کا شعبہ مسلمانوں کا افلاس رفع کرنے میں اب بھی بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔ اور ہمارے خیال میں مسلمانوں کے لیے وقت کی نہایت اہم ضرورت یہی ہے۔ ورنہ زمانہ یوں ہی گزرتا گیا تو اندیشہ ہے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے گا اور پھر اسکا وقت باقی نہ رہے گا کہ بزم تعلیمی یا مجالس سیاسی و قومی کچھ کام آسکیں۔

افلاس کا مسئلہ جہاں اقتصادیات سے تعلق رکھتا ہے وہاں بہت کچھ ماندوبود کے طریقوں سے وابستہ ہے۔ روپیہ زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے والے بھی مفلس رہیں گے اگر صرفِ زر صحیح طریقہ سے نہ ہوگا۔ اس لیے جب تک اقتصادی اصول اور تمدنی طریقوں میں مناسب امتزاج کی صورتیں نہ پیدا کی جائیں پوری کامیابی نہیں ہو سکتی۔

مسلمانوں کا انتشار گویا ابھی انتہائی حد کو نہیں پہونچا، یا اُنکی سیاسی خدمت کے لیے جو مجالس قومی قائم ہیں اُن کا وجود کافی نہیں کہ اب ہمارے صوبہ میں ایک نئی جماعت تیار کی جا رہی ہے جسکی رہنمائی غالباً ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صاحب فرمائیں گے، مالی امداد نواب محمد یوسف صاحب کریں گے اور خدمتِ نقابت حاجی سید محمد حسین صاحب بیرسٹر انجام دیں گے۔

جماعت کا نام کچھ رکھا جائے، مقصد جو چاہے بتایا جائے، پروگرام کیسا ہی خوشنما بنایا جائے، بات صاف ظاہر ہے۔ کونسل کے انتخابات کا زمانہ قریب آ رہا ہے۔ اسمبلی کے انتخابات میں اس طبقہ کو اتفاق سے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لیے آیندہ کی انتخابی جنگ کے لیے یہ ساری تیاریاں ہیں۔

(بقیہ "نئی کتابوں" کی پشت پر)

مرزا رجب علی سرور

- فسانۂ عجائب
- انشائے سرور

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات (نامکمل)
- صنم خانۂ عشق
- مرآۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین
- مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم لکھنوی

- سرمایۂ زبان اردو
- رسالہ تذکیر و تانیث
- قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس ہوش

- افسانہ نادر جہاں
- پیاری سہیلی

مرزا رسوا مرحوم

- امراؤ جان ادا
- اختری بیگم
- خونی شہزادہ
- شریف زادہ
- ڈراما لیلیٰ مجنوں

ریاض خیرآبادی

- حرم سرا ۲ جلد
- ناشاد

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد کامل
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول
- کامنی

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

- مرزالنی
- مار آستین
- بنگالی دولھن
- پرتاپ
- روہنی

سید عاشق حسین لکھنوی

- تارا
- شادی و غم

منشی امیر حسن کاکوروی

- الہ دین و لیلیٰ
- فسانۂ لارنس و دتہ مکھم

مولانا عبد الحلیم شرر

- ثانی اثنین
- ذی النورین
- ابو الحسنین
- خواجہ معین الدین چشتی
- حسن بن صباح
- عصر قدیم
- تاریخ یہود
- مسیح اور مسیحیت
- عرب قبل از اسلام
- صقلیہ میں اسلام
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرامپور
- الفانسو
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- بابک خرمی
- طاہرہ
- مینا بازار
- فردوس بریں
- ناول افلورا فلورنڈا
- غا صادق کی شادی

حکیم سراج الحق

- مسلمان تاجداران ہند
- ماہ دخت
- فیروز شاہ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- عالم خیال
- دیوان شوق

منشی محمد احسن وحشی

- نغمۂ حرم
- اشک حسرت
- معشوقۂ عرب
- محبوس کشتہ

خواجہ عبد الرؤف عشرت

- تذکرۂ آب بقا
- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو
- قواعد میر
- اصول اردو
- جہان اردو
- شاعری چار کتابیں
- لغات اردو
- ہندو شعرا

منشی موہن لال فہم

- بزم اکبری
- چاند سلطانہ
- خاتون اودھ
- فریب حسن
- مقدس ودیبی
- سنگاری کا پتلا

مولانا حکیم عبد الحی مرحوم

- تاریخ گجرات
- تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین مرحوم

- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- " جلد دوم
- " جلد سوم
- " جلد چہارم
- " جلد پنجم
- " جلد ششم
- " جلد ہفتم
- " جلد ہشتم
- " جلد نہم
- " جلد دہم
- " جلد یازدہم
- " جلد دوازدہم
- " جلد سیزدہم
- " جلد چہاردہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی خلیل الرحمن

- اخبار الاندلس
- مختصر تاریخ اسلامی
- مولدین

مولانا اکبر شاہ خاں

- تاریخ اسلام ۳ جلد
- آئینہ حقیقت نما

مولانا اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنی عباس
- عباسیہ مصر
- عباسیہ بغداد
- خلافت آل عثمان
- عمرو بن عاص
- تاریخ نجد

قاضی سلیمان منصور پوری

- رحمۃ للعالمین ۳ جلد
- سفرنامہ حجاز

مولوی انشاء اللہ مرحوم

- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات عراق و عرب
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش
- محاربات لیبیا

مولانا نجم الغنی رامپوری

- بحر الفصاحت
- تاریخ اودھ
- تاریخ حیدرآباد دکن
- تاریخ راجگان ہند
- تعلیم الایمان
- مذاہب اسلام

الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا مرحوم

- سیرۃ المحمود ۱۲/
- ڈکرم اروسی عہ/

مولانا حسرت موہانی

- شرح دیوان غالب عہ/
- کلیات دیوان حسرت سے/
- نکات سخن ۲ حصے ۱۲/

مسٹر سجاد حیدر بی اے

- خیالستان ۸/
- حکایات اختصاصات ۱۲/
- مواخوات دواستانی ۸/
- ثالث بالخیر ۸/
- زہرہ ۸/
- عمادالدین خوارزم شاہ ۸/
- جنگ جدال ۱۲/

مسٹر ظفر عمر بی اے

- مستقبل اسلام ۵/
- چہرہ دوں کا کلب ۹/
- نیلی چھتری ۱۲/
- بہرام کی گرفتاری عہ/
- لال کنھور ۸/

پروفیسر جلیل قدوائی ایم اے

- داستان تمنا ۸/
- سیر گل ۸/
- مونا دورنا ۸/
- عشق و حجاز عہ/

منشی فیاض علی بی اے

- سراج منیر ۱۲/
- ہیملٹ ۱۲/

منشی احمد علی بی اے

- تاریخ تمدن ۲ جلد ۸/
- شباب لکھنؤ ۸/

منشی امیر احمد علوی بی اے

- تاریخ اندور ۱۲/
- روزنامچہ ۱۲/
- شاہان مالوہ عہ/
- طرز امیر ۱۲/
- گوتم بدھ ۱۲/
- یادگار انیس ۵/

مولوی عبدالماجد بی اے

- فلسفہ جذبات ۸/
- مکالمات برکلے ۸/
- تاریخ اخلاق یورپ ۲ جلد سے/
- پیام امن ۱۲/
- تصوف اسلام ۸/
- سفر حجاز ۵/
- زود پشیماں ۸/

مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے

- تاریخ امریکہ ۸/
- سیر المصنفین ۲ جلد ۸/
- تاریخ مغربی یورپ ۸/
- خیالات اور رنگ ۸/

مرزا محمد عسکری بی اے

- ادبی خطوط غالب ۸/
- تاریخ ادب اردو للعہ/
- نوادر عہ/

برج نرائن چکبست دہلوی

- صبح وطن ۸/
- مضامین چکبست ۸/

سید مسعود حسن رضوی ایم اے

- روح انیس سے/
- ہماری شاعری ۸/
- امتحان وفا ۶/

پروفیسر منہاج الدین

- ریڈیو ۱۲/
- زینت آسماں ۱۲/
- نظریۂ منافقیت للعہ/

مولوی محمد ظفر ایم اے

- روح القرآن ۸/
- روحوں کے کرشمے ۱۲/

مسلم عظیم آبادی ایم اے

- پارسی علوم اور اسلام ۱۰/
- سلیقۂ تحریر عہ/

مسٹر حامد اللہ افسر بی اے

- پیام روح سے/
- ذاتی ملکیت کا جوگ عہ/

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن ۲ جلد للعہ/
- خطبات مدراس ۱۲/
- سیرت عائشہؓ ۸/
- حیات امام مالک عہ/
- خیام ۸/

مولوی عبدالسلام ندوی

- اسوۂ صحابہ ۲ جلد سے/
- سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ۸/
- انقلاب الامم ۸/
- التربیۃ الاستقلالیہ ۸/
- شعر الہند ۲ جلد سے/

مولوی عبدالباری ندوی

- مبادی علم انسانی ۸/
- برکلے کا فلسفہ ۸/

مولوی سعید انصاری

- سیر الانصار ۲ جلد سے/
- سیر الصحابیات ۸/

حاجی معین الدین ندوی

- خلفائے راشدین ۸/
- مہاجرین حصہ اول للعہ/

شاہ معین الدین ندوی

- مہاجرین حصہ دوم ۸/
- سیر الصحابہ جلد ششم سے/
- جلد ہفتم سے/

خواجہ حسن نظامی دہلوی

- میلاد نامہ عہ/
- ذکر غوث پاک ۱۲/
- کرشن جیون ۱۲/
- سیپارۂ دل ۸/
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲/
- اتالیق خطوط نویسی ۱۲/
- بیوی کی تعلیم ۸/
- بیوی کی تربیت عہ/
- اولاد کی شادی عہ/
- جگ بیتی کہانیاں ۱۰/
- بچوں کی کہانیاں ۲/
- سفر نامہ ممالک اسلامیہ ۸/
- غدر دہلی کے افسانے ۱۱ جلد عہ/

سید ظہور احمد چشتی

- اسلامی زندگی سے/
- تصویر معاشرت عہ/
- درس عبرت عہ/
- زندگی کی صبح و شام عہ/
- طوفان زندگی عہ/
- عروج زندگی عہ/
- مالی پریشانیوں کا علاج عہ/
- وسائل معاش ۸/

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی

- اسلام اور عیسائیت عہ/
- اسلام اور توریت ۱۰/
- پتھر سے ہیرا ۱۴/
- دامن باغباں عہ/

مولانا راشد الخیری دہلوی

- امت کی مائیں عہ/
- آمنہ کا لال عہ/
- سیدہ کا لال ۸/
- صبح زندگی ۸/
- شام زندگی ۱۲/
- شب زندگی ۲ جلد ۸/
- نوحۂ زندگی ۱۲/
- دُرِّ شہوار ۱۰/
- منازل السائرہ ۲ جلد ۸/
- موؤدہ ۸/
- بنت الوقت ۸/
- جوہر قدامت ۸/
- عروس کربلا ۸/
- یاسمین شام ۸/
- تیغ کماں ۸/
- محبوبۂ کربلا ۱۲/
- نانی عشو ۱۰/
- وداع ظفر ۸/

مسٹر طالب الحیدر جوش

- صبر کی دیوی ۱۲/
- فسانۂ جوش ۸/

نیاز فتحپوری

- جذبات بھاشا ۱۲/
- نگارستان عہ/
- شہاب کی سرگزشت ۸/
- گہوارۂ تمدن
- جمالستان ۸/

بنام خداوند جاں آفریں

(رجسٹرڈ نمبر ا) (ال ۷۸۰۴)

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجرائے الناظر) سنہ ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

(۲)

ایڈیٹر - ظفر الملک علوی

نمبر ۴ | اپریل سنہ ۱۹۳۵ء | جلد ۳۹

فہرست

قسم عام (رنگین سرورق، چکنا کاغذ) ۳ عـ سالانہ مع محصول ڈاک فی پرچہ ۵ـ/
ارزاں ایڈیشن (سادہ سرورق مظفر کا کاغذ) عـ/ " " " ۲/

ادبیات

امیر اللغات (۲ جلد) حضرت امیر مینائی کی نایاب گرانمایہ تالیف جس میں حرف الف کے الفاظ مع معنی و اسناد جمع کیے گئے ہیں۔ تقطیع کلاں۔ قیمت عـہ

نفس اللغة ۔ میر علی اوسط رشک کا قابل قدر لغت۔ اردو الفاظ کے تحقیقی معانی فارسی میں۔ حصہ اول عـہ ر

نور اللغات (۴ جلد) منشی نور الحسن صاحب نیر خلف حضرت محسن کاکوروی نے امیر اللغات کے تتبع میں یہ مکمل اردو لغت سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد تیار کیا ہے اور حکومت نے چھ ہزار روپیہ بطور امداد عطا کر کے اس کی اشاعت کرائی ہے

قیمت جلد اول (الف و ب) عـہ ر

" دوم (پ لغایۃ خ) ـــــہ ر

" سوم (د لغایۃ ق) عـہ ر

" چہارم (ک لغایۃ ی) للعـہ ر

سرمایۂ زبان اردو ۔ استاد جلال لکھنوی کا قابل قدر لغت جس میں محاورات، اصطلاحات و امثال کی تشریح کی ہے۔ ہـ ر

لغات اردو ۔ خواجہ عشرت لکھنوی نے اردو کے لغات کئی حصوں میں جمع کیے ہیں :۔ جلد اول (مصادر مفردہ) ۱۲ر جلد دوم (مصادر مرکبہ معاون فعل) ۸ر جلد سوم (مصادر مرکبہ معہ اسما) ہـ ر جلد چہارم (حروف روابط مستعملہ زبان اردو) ۸ر

معاون الشعرا ۔ پانچ ہزار کے قریب الفاظ کا لغت جس میں بلحاظ حروف تہجی ہر لفظ کے اعداد جمل دیے گئے، ان کی تذکیر و تانیث بتائی اور سند کا شعر درج کیا گیا ہے۔ شروع میں تذکیر و تانیث کی پہچان کے قواعد مرتبہ مولوی محمد منیر صاحب منیر لکھنوی۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت عـا ر

سیر المصنفین (۲ جلد) نثر اردو کی تاریخ اور ہر دور کے نثر نویسوں کے حالات اور انکی تحریروں کے نمونے۔ جلد اول (۱۰۹۷ء سے ۱۸۵۶ء تک) عـا ر جلد دوم (غدر کے بعد سے ۱۹۲۴ء تک) ہـ ر

تاریخ نثر اردو ۔ مولانا احسن مارہروی نے اس میں ہر قسم کے نمونے یکجا کر کے دکھایا ہے کہ گزشتہ چھ سو سال کے اندر اردو تحریروں میں وقتاً فوقتاً کیا تبدیلیاں ہوئیں اور ہر زمانہ کی تحریروں کا کیا انداز تھا۔ قیمت ہـ ر

تذکرۂ آب بقا ۔ بعض مشاہیر شعرائے ماضی و حال کی دلچسپ و کار آمد سوانحعمریاں، نشانات مزار اور منتخب کلام مع خمخانۂ عشرت۔ از خواجہ عشرت لکھنوی۔ قیمت عـا ر

ہندو شعرا ۔ اردو زبان کے ہندو شعرا کا تذکرہ بلحاظ حروف تہجی۔ از خواجہ عشرت۔ قیمت ہـ ر

بہار گلشن کشمیر (۲ جلد) تقریباً چار سو کشمیری الاصل ہندو شعرا کا ضخیم تذکرہ معہ سوا سو تصاویر اور خوشنما جلد کے۔ ساری کتاب دو رنگ میں چھپی ہے۔ قیمت عـہ ر

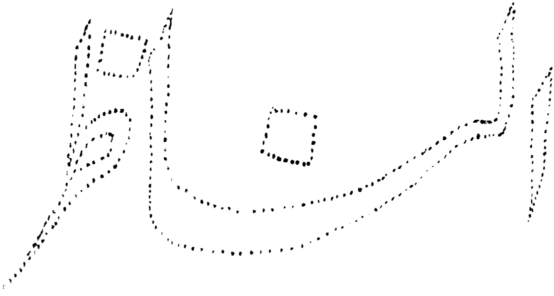
یادگار انیس ۔ انیس کے سوانح، خصوصیات شاعری، انیس و دبیر کے کلام کا موازنہ از منشی امیر احمد علوی بی اے۔ عـا ر

طرۂ امیر ۔ حضرت امیر مینائی کے سوانح، ادبی خصوصیات، شاعری، امیر و داغ کے کلام کا موازنہ اور آخر میں انکا منتخب کلام از منشی امیر احمد علوی بی اے۔ قیمت ہـ ر

مرأۃ الشعر ۔ شعر کی حقیقت و ماہیت۔ اس کے اقسام، اس کے علوم معانی و بیان، اس کے محاسن و معائب پر قابل قدر تالیف از پروفیسر عبد الرحمٰن صاحب۔

قیمت ـــہ ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ



نمبر ۴ جلد ۳۹ — اپریل سنہ ۱۹۳۵ء

ابراہیم عادل شاہ اوّل

سنہ ۱۵۳۵ء - سنہ ۱۵۵۷ء

(جناب ڈاکٹر م۔ ح۔ سید صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ لٹ)

پندرہویں صدی کے آخر میں سلطنتِ بہمنیہ کا چراغ گل ہوگیا مگر دکن میں مسلمانوں کا اقتدار پچاس سال بعد تک رہا۔ سیاسی حیثیت سے یہ اقتدار کئی حصوں میں تقسیم ہوگیا اور ہر حصہ کی تشکیل ایک آزاد حکومت سے ہوئی۔ بیجاپور میں کامل شاہانہ اقتدار قائم کرنے کا شرف یوسف عادل شاہ کو حاصل ہوا جو فتوحات عادل شاہی "تذکرۃ الملوک" اور گلشن ابراہیمی کے مصنفوں کے بیانات کے مطابق بیرونی شہزادہ تھا۔ بیس سال کی پُر از واقعات حکومت کے بعد سنہ ۱۵۱۰ء میں یوسف نے انتقال کیا اور اُس کا شیرخوار لڑکا اسمٰعیل جو پونجی نامی ایک جمیلہ مرہٹہ لڑکی کا اکلوتا بیٹا تھا، اُس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اپنے دیگر معاصرین کی طرح اسمٰعیل کو بحیثیت ایک جنگ آزما شہریار کے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اُس نے بیدر پر قبضہ کر لیا اور بہمنیوں کے مشہور و معروف فیروزہ کے تخت پر متمکن ہوا۔ یہ اُس کی زندگی میں قابلِ یادگار دن تھا اس لیے اُس نے نہایت فیاضی سے عطایا و ہدایا تقسیم کیے۔ اس کے چاروں لڑکے، ملو، انو، ابراہیم اور عبداللہ بھی عام انعام و اکرام سے سرفراز ہوئے۔ اسمٰعیل نے بسترِ مرگ پر اپنے بڑے بیٹے ملو کو اپنا جانشین نامزد کیا، باوجودیکہ تمام امرائے دربار

اُسکے مقابلہ میں ابراہیم کو پسند کرتے تھے۔ ابراہیم نے جب اپنے دوستوں کی درخواست تخت نشینی کو رد کر دیا تو نادل ناخواستہ شاہ مرحوم کی ہدایات پر عمل کیا گیا۔ لیکن ملو کی عیاشی اور بداعمالی کی بدولت کہ اُسنے نامی امراء کے خاندانوں کی آبرو کا بھی پاس و لحاظ نہیں کیا، عام مخلوق اُس سے بیزار ہوگئی اسلیے امراے دربار نے ابراہیم کو بادشاہ منتخب کر کے ملو کو تخت سے علٰحدہ کر دیا۔ اس طرح ابراہیم بیجاپور کا حکمراں قرار پایا۔

اواخر فروری ۱۵۳۵ء میں ابراہیم عادل شاہ اپنے معزول بھائی کے بجاے تخت نشین ہوا۔ تخت نشین ہوتے ہی اُس نے ایک ایسا فرمان جاری کیا جس کی رو سے مذہب شیعہ کو سخت صدمہ پہونچا۔ اور سُنی مذہب ترقی کرنے لگا۔ اُس نے شیعوں کے تمام مظاہرے ممنوع قرار دیے۔ اور امراء کے نام فرمان بھیجوائے کہ وہ اپنی تمام متعلقہ جاگیروں میں سُنی مذہب کے رواج دینے کی کوشش کریں۔ اُس نے اپنے جوش کی وجہ سے تقریباً تمام غیر ملکی لوگوں کو ملازمتوں سے برخاست کر دیا۔ کچھ تو وجے نگر (بیجانگر) چلے گئے اور بعض نے احمد نگر کی راہ لی۔ اپنے خاص محافظ دستے میں صرف چار سو غیر ملکی اشخاص باقی رکھے۔ اُن کو چھوڑ کر بقیہ تمام غیر ملکی افسر برطرف کر دیے گئے اور اُن کی بجاے دکنی اور حبشی لوگ مقرر ہوے۔ درباری زبان اُس نے ہندی مقرر کی، اسی زبان میں حساب کتاب بھی رکھا اور یہ کام ہندو محرروں کے سپرد کیا گیا[۱]۔

تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصے میں ابراہیم نے اپنی تمام تر توجہ وجے نگر کے معاملات پر صرف کر دی جس میں اُسے اپنے مفاد اور کامیابی کا اچھا موقع ملا۔ اُس زمانے میں وجے نگر کے معاملات نہایت پیچیدہ تھے۔ دارالسلطنت میں بھوج ترل کی شخصیت غالب تھی۔ بھوج ترل اپنی حکمت عملیوں سے اپنے نابالغ بھتیجے (حکمراں) کا نگراں بنگیا تھا، اس کا مقابل رام راجہ تھا، جس نے شاہی خاندان میں شادی کر لی تھی۔ اور سلطنت کے اعلیٰ مرتبہ کا ایک افسر تھا، بھوج ترل کے مقابلہ میں یہ خود بھی اپنا اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا، بھوج ترل کے دل میں بادشاہ بن جانے کا خیال موجزن ہوا تو اُس نے اپنے نابالغ بھتیجے کا نہایت بیدردی سے گلا گھونٹ دیا۔ بھوج ترل جیسے ظالم بیدرد کا یہ غیر معمولی فعل ہرگز ہرگز اس قابل نہ تھا کہ اُسے ہردلعزیزی حاصل ہوتی اور بنظر استحسان دیکھا جاتا، بلکہ یہ فعل اُس کی کامیابی کے لیے سدِراہ ہوگیا۔ دربار کے تمام امراء اُسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے اور اُن کی طبیعتیں اُس سے متنفر ہوگئیں۔ امراء نے رام راجہ سے درخواست کی کہ بھوج کے ان بیدردانہ مظالم کا ملک تخت

[۱] تاریخ فرشتہ حصہ سوم صفحہ ۸۰۰-۸۰۷۔ بساتین السلاطین صفحہ ۴۹۔ واقعات تاریخ دکن کیمبرج ہسٹری جلد سوم صفحہ ۴۲۹

خاتمہ کر دیا جائے۔ بھوج نرل نے جب یہ دیکھا کہ امرا اور رعایا کی نفرت کا یہ عالم ہے کہ وہ بغاوت پر تیار ہیں اور اُس کے مقابلہ میں راجہ رام کو برسراقتدار کرنا چاہتے ہیں تو اُس نے اپنے سفیروں کو چھ لاکھ ہُن اور بہت سے بیش بہا قیمتی تحائف ابراہیم کے حضور میں پیش کرنے کے لیے بھیجا اور ابراہیم سے درخواست کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے ضرور اُس کی مدد کرے اور اس آڑے وقت میں اُس کی دستگیری فرمائے۔ بھوج نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ خود کو ابراہیم کا باج گزار بھی تسلیم کر لیا اور سامان فوج کے روزانہ سفر خرچ کے لیے تین لاکھ ہُن دینے پر رضامند ہو گیا۔ ابراہیم نے اسدخاں کے صلاح و مشورہ سے بھوج کی اس درخواست کو منظور کر لیا، اپنی فوج کو ترتیب دے کر وجے نگر گیا، جہاں نہایت عزت کے ساتھ ایک اعلیٰ فرماں روا اور حاکم کی حیثیت سے اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس طرح سے بھوج کو جب مسلمانوں سے تقویت ہو گئی تو رام راجہ اور اسکے ساتھی امرا کو کسی قسم کی ہمت نہ پڑی اور انھوں نے کوئی عملی کارروائی بھوج کے خلاف نہ کی، بلکہ ہر وہ بھوج کی اطاعت کا دم بھرنے لگے اور ایک ہندو سلطنت میں مسلمانوں کو اس طرح سے مدعو کرنے کی خرابیوں پر باہم گفتگو کرتے رہے۔ اب بھوج ان لوگوں سے بالکل بے خوف ہو گیا، اُس نے خیال کیا کہ مجھے امداد کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے مسلمانوں سے واپسی کی درخواست کی پچاس لاکھ ہُن بہت سے تحفے تحائف جن میں بارہ ہاتھی، اور کئی خوبصورت گھوڑے بھی شامل تھے ابراہیم کے حضور میں پیش کیے، ابراہیم خوش خوش رضامند ہو کر مع اپنی فوج کے بیجاپور واپس آیا۔[1]

ابراہیم کا واپس ہونا ہی تھا کہ راجہ رام اور اسکے ساتھی دارالسلطنت کی طرف نہایت تیزی سے بڑھے۔ فوج کو رشوت دے کر بھوج کے خلاف برانگیختہ کیا۔ تمام فوج ظالم راجہ بے درد بھوج سے منحرف ہو گئی۔ بھوج نے جب اپنی بیچارگی اور بے بسی کا یہ عالم دیکھا تو اُس نے اپنے تمام ہاتھیوں اور گھوڑوں کو بیکار کر کے خودکشی کر لی۔[2]

اس بغاوت کی خبر ابراہیم کو ملی۔ اُس نے اس سے فائدہ اٹھانے کا اچھا موقع دیکھ کر ادونی کا قلعہ فتح کرنا چاہا۔ یہ مہم اسدخاں کے سپرد کی گئی۔ اسدخاں نے اپنی فوج لیکر قلعہ کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا چونکہ قلعہ کی محافظت کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی اور نہ کسی بیرونی امداد کی کوئی امید تھی اس لیے عنقریب وہ دشمنوں کے قبضہ میں آنے والا تھا کہ رام راجہ اپنی انتہائی کوششوں سے دارالسلطنت میں امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اُس نے اپنے بھائی وینکٹادری کو فوج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ وینکٹادری

[1] تاریخ السلاطین صفحہ ۵۰-۴۹، فرشتہ حصہ سوم صفحہ ۸۱-۲۰

[2] فرشتہ حصہ سوم صفحہ ۹۲-۹۸

نے مسلمانوں کو شکست دی اور قلعہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ فتح کی مسرت میں یہ لوگ اس قدر مدہوش ہوئے کہ ان کی مدہوشی سے اسد خاں نے فائدہ اُٹھایا اور اُس نے اچانک بجلی کی طرح سے ہندوؤں کے پڑاؤ پر حملہ کر دیا۔ سپہ سالار رنگ راج کو اچھی طرح سے بھاگنے کا موقع نہ ملا۔ اس لیے مجبوراً اُسے اپنے خزانے، اہل وعیال اور ہاتھیوں کو وہیں چھوڑنا پڑا۔ سپہ سالار کو اپنے اہل وعیال کی رہائی کی فکر دامنگیر ہوئی اُس نے اپنے بھائی راجہ رام سے صلح کا مشورہ کیا جس نے اُسے صلح کرنے کی رائے دی۔ دونوں بھائیوں نے اسد خاں کو رشوت دے کر استدعا کی کہ ابراہیم سے صلح کرا دی جائے۔ اسد خاں واپس چلا گیا۔ تاریخ فرشتہ میں صلحنامہ کے شرائط مذکور نہیں ہیں۔[۱]

اسد خاں نہایت مدبر، سیاست داں اور صاحب اثر تھا۔ اسی وجہ سے وہ دربار کے سب سے بڑے عہدہ پر ممتاز تھا۔ دوسرے امراء اُس سے حسد رکھتے تھے، اُنھوں نے اُس کے خلاف بادشاہ کو بھڑکانے کی کوشش کی اور عرض کیا کہ اسد خاں نے اس مہم میں ہندوؤں سے رشوت لی ہے، لیکن ابراہیم نے ان حاسد امیروں کی ایک نہ سُنی اور قلعہ آدونی کی واپسی پر اُسے سلطنت کا وزیر اعظم اور فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔

اسد خاں کی اس عزت افزائی سے اُسکے حاسدوں کو سخت تکلیف ہوئی اور وہ اُس کی مخالفت پر اور زیادہ آمادہ ہو گئے۔ دربار میں خفیہ طور پر خبریں مشہور ہو گئیں کہ اسد خاں، برہان نظام شاہ کا ہم مذہب ہونے کی وجہ سے[۲] اپنی جاگیر بلگام اُسے دینا چاہتا ہے۔ اس خبر سے بادشاہ کو اسد خاں کی دغابازی اور مکاری سے قلعہ کی واپسی کا پورا پورا یقین ہو گیا۔ اُس نے اپنے معتمدین کو جمع کیا اور اُن سے مشورہ کیا کہ اسد خاں کو اپنے قبضہ میں رکھنے کی کونسی یقینی تدبیر ہو سکتی ہے۔ معتمدین نے یہ صلاح دی کہ شہزادہ علی کے ختنہ کی تقریب میں اسد خاں کو مدعو کر کے دار السلطنت میں نظر بند کر لیا جائے۔ لیکن اسد خاں معمولی دماغ کا آدمی نہ تھا وہ نہایت سیاست داں اور چالاک تھا۔ اُس کے مخالفوں کا اُسے اپنے جال میں پھنسا لینا کوئی معمولی کام نہ تھا۔[۳]

۱۵۴۰ء / ۹۴۷ھ میں برہان نظام شاہ کو یہ خبر ملی کہ سُنی ابراہیم عادل شاہ اور اُس کے مدبر طاقتور شیعہ سپہ سالار اسد خاں میں باہم بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس سے وہ دلیر ہوا اور اُس کی ہمت بڑھی، وہ امیر برید سے

---

[۱] فرشتہ۔ صفحہ ۸۴ - ۸۶ بساتین السلاطین صفحہ ۵۳ - ۵۶

[۲] ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ صفحہ ۸۶

[۳] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم صفحہ ۴۴۰

[۴] بساتین السلاطین صفحہ ۵۶ - فرشتہ جلد سوم صفحہ ۸۶ - ۸۸

مل گیا اور اسد خاں کے خلاف اُس نے جھوٹی خبریں مشہور کر دیں۔ امیر علی بریدا اور برہان نظام شاہ دونوں نے مل کر ابراہیم کے مقبوضات پر حملہ کر دیا اور شولا پور کے پانچ اضلاع چھین کر خواجہ جہاں دکنی کے ملازموں کو دیدیے پھر بلگام کا رخ کیا۔ اسد خاں اپنے آقا کا ایک وفادار خادم تھا۔ وہ حملہ آوروں کا ایسی حالت میں مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اپنی حکمت عملی سے بظاہر برہان کے مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے چھ ہزار سواروں کے ساتھ اُس سے مل جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے سوا اُسے کوئی چارہ نہ تھا۔ ابراہیم کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس طرح سے برہان کی طاقت بڑھ گئی تو وہ بیجاپور سے گلبرگہ بھاگ گیا۔ برہان اور امیر علی برید نے مل کر بیجاپور کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔[۵۱]

اسد خاں بظاہر ابراہیم کے دشمنوں سے دوستی کا دم بھرتا رہا لیکن حقیقت میں وہ اپنے مالک کا ہمیشہ وفادار بنا رہا۔ اُس کو اپنے آقا کی یہ بُری حالت اور ذلت دیکھ کر دل ہی دل میں سخت صدمہ ہوا اور اُس نے اپنی حکمت عملی سے خفیہ طور پر اپنے معتمد خاص علی محمد بدخشی کو دریا عماد شاہ کے پاس بھیجا اور اُسے ابراہیم کی مدد کے لیے بلایا۔ اُس سے یہ وعدہ کر لیا کہ جیسے ہی وہ سرحد پر پہونچے گا یہ اُس سے مل جائے گا۔ اور اُس کا ساتھ دے گا۔ عماد شاہ نے اسد خاں کی یہ التجا قبول کر لی اور وہ فوراً گلبرگہ کی طرف بڑھا۔ اب برہان اور امیر علی برید نے دار السلطنت عادل شاہی کا محاصرہ اُٹھا لیا اور قرب و جوار کے مواضعات کو لوٹتے ہوئے دونوں برار کی فوج کی طرف بڑھے کہ ایسا نہ ہو یہ ابراہیم سے مل جائے۔ اسد خاں اپنے معاہدہ کے مطابق دشمنوں کا ساتھ چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ عماد شاہ سے جا ملا۔ اور اُس سے درخواست کی کہ وہ اسکے آقا ابراہیم سے مصالحت کرا دے۔ عماد شاہ نے اسد خاں کی سچائی اور راستبازی کا یقین کر کے دل سے اُس کا ساتھ دیا اور ابراہیم کو اس کی غلطی سے متنبہ کر کے خادم و مخدوم کی اس بدگمانی کو دُور کر دیا جو حاسدوں نے پیدا کر دی تھی اس تجدید اتفاق نے خادم و مخدوم کے اُلجھے ہوئے معاملات کو بالکل سُلجھا دیا۔ غنیم نے بہت بُری طرح سے شکست کھائی۔ اسی اثناء میں امیر برید کی اچانک وفات ہو گئی (۱۵۴۲ء) اور برہان کو مجبوراً ابراہیم سے صلح کرنی پڑی۔ اُس نے شیخ طاہر کو ابراہیم کی خدمت میں صلح کے لیے بھیجا جس میں یہ طے پایا کہ شولا پور اور اُس کے پانچوں ضلعے ابراہیم کو واپس دیے جائیں اور اُن اضلاع پر برہان کا کوئی استحقاق نہ ہو۔[۵۲]

برہان نظام شاہ کو اس شکست کا بیحد افسوس ہوا جس میں اُس نے اپنی پوری حکمت عملی سے کام لیا تھا۔

---

۵۱ فرشتہ۔ صفحہ ۸۹-۹۰۔ بساتین السلاطین صفحہ ۵۶-۵۷۔ ہسٹاریکل لینڈ مارکس آف دی ڈکن صفحہ ۳۸-۳۹-۹۲

۵۲ بساتین السلاطین صفحہ ۵۷-۵۸۔ فرشتہ جلد ۳ صفحہ ۹۰-۹۲

اسی غم کی تلافی میں اُس نے بیجاپور پر ایک مرتبہ پھر لشکرکشی کا ارادہ کیا تاکہ شولاپور اور اُس کے اضلاع دوبارہ اُسے مل جائیں اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر برہان نے شیخ طاہر کو جمشید قطب شاہ کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا تاکہ وہ جمشید قطب شاہ اور رام راجہ کو شاہ بیجاپور کی مخالفت پر متفق کرلے[1]۔ ان میں فوراً ایک سیاسی اتحاد قائم ہوگیا اور تینوں بادشاہ بیجاپور کے خلاف جنگ پر آمادہ ہوگئے۔ عنقریب ہندو دکن سے گولکنڈہ مشرق سے برہان، علی برید اور خواجہ جہاں شمال مشرق سے بیجاپور پر لشکرکشی کرنے والے ہی تھے کہ برہان عادل شاہی اضلاع کے حدود میں داخل ہوگیا، راستے کے مواضعات میں لوٹ مار کرتے ہوئے کئی مرتبہ عادل شاہی فوجوں کو شکست دی۔ اسی اثناء میں جمشید نے مشرق سے حملہ کرکے کاکنی پر قبضہ کرلیا۔ اور ایک مضبوط قلعہ بھی بنالیا۔ ملک کے جس قدر حصہ پر وہ قبضہ کرسکتا تھا اُس پر تسلط کرکے ساگر کے قریب انگیر کا محاصرہ کرلیا۔ اِدھر رام راجہ نے اپنے بھائی وینکٹادری کو رائچور کے خلاف بھیجا[2]۔

ابراہیم ہر چہار طرف سے دشمنوں کے نرغے میں تھا، اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے ایسی حالت میں اُس نے اپنے قابل اور وزیر اسد خاں سے رجوع کیا۔ اسد خاں نے خاص چانکیائی انداز میں یہ رائے دی کہ سب سے پہلے کمزور کو علیحدہ کیا جائے اور بقیہ دو سے میل کرکے اس کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ ابراہیم نے برہان کو شولاپور دے کر صلح کرلی اور رام راجہ سے اتحاد پیدا کرنے کے لیے تحفہ تحائف پیش کیے۔ اس طرح سے اُس سے برہان اور راجہ رام سے علیحدہ علیحدہ صلح ہوگئی۔ اب صرف جمشید قطب شاہ باقی رہ گیا۔ اسد خاں نے جمشید قطب شاہ کا مقابلہ کرکے کاکنی قلعہ کو جو اُس نے تعمیر کیا تھا ڈھا دیا اور دو مرتبہ اُسے شکست بھی دی۔ جمشید قطب شاہ گولکنڈہ کے دروازہ کی طرف بھاگا، جہاں اسد خاں نے پہونچ کر جنگی قاعدہ کے مطابق دست بدست لڑائی میں پھر اُسے شکست دی۔ جمشید کا چہرہ بھی زخمی ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی فتح کے بعد قابل اطمینان صلح کے شرائط حاصل کرلینا نہایت آسان تھا۔ اس طرح سے بیجاپور کے خلاف سیاسی اتحاد کی پہلی جنگ کامیاب ہوئی[3]

ابراہیم ایسی صلح پر جو اتنی ذلت اٹھانے کے بعد حاصل کی گئی ظاہر ہے کہ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ رام راجہ نے برہان کو ترغیب دی کہ وہ کلیگر کو فتح کرلے۔ ابراہیم فطرتاً حملہ آور کے مقابلہ کی تیاریاں کرنے لگا۔ کئی مہینے کی جنگ کے دوران میں دونوں فوجیں دریائے بھیم کے دونوں کنارے پر

۱۔ تاریخ فرشتہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۳۰

۲۔ بساتین السلاطین۔ صفحہ ۵۸-۵۹۔ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۹۲-۹۳

۳۔ فرشتہ جلد [illegible] بساتین السلاطین صفحہ ۵۹ - [illegible] تاریخ [illegible] آف دی دکن صفحہ ۱۲۸

معطل پڑی رہیں۔ ابراہیم نے عاجز آکر دریا پار کرکے دشمن کو زبردستی لڑنے پر مجبور کیا۔ برہان کو شکست فاش ہوئی۔ جس میں اُس کا تمام سازوسامان اور بہت سی قیمتی چیزیں ابراہیم کے ہاتھ لگیں[ا۵]۔ برہان صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہوا اور حقیقت میں وہ اس کا خواہشمند بھی تھا۔ کیونکہ وہ امیر برید کو جس نے اس جنگ میں یکایک علٰحدگی اختیار کرلی تھی ہموار کرنا چاہتا تھا اور جس نے ابراہیم کے خلاف برہان کو مدد دینے سے انکار بھی کردیا تھا۔ برہان نے خیال کیا کہ اگر وہ کندھر فتح کرلے تو اس میں ابراہیم کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور اس بات کا وعدہ بھی کیا کہ اگر ابراہیم وجے نگر میں فتوحات حاصل کرے تو یہ کسی قسم کی روک ٹوک نہ کریگا۔ ابراہیم کو پورا اختیار ہوگا کہ جس قدر ملک چاہے کافروں سے چھین لے[۵۲]، کوئی مزاحم نہ ہوگا۔ پھر بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم نے یقیناً امیر برید کو مدد دی، باوجود اس کے برہان نے اوسا، اودگی اور کندھر کے قلعے چھین لیے[۵۳]۔

اس کے بعد ابراہیم کی حالت میں تغیر واقع ہوا۔ اُس کی طبیعت یکایک مظالم پسند ہوگئی۔ ہم یہ نہیں بتاسکتے کہ اس فوری تبدیلی کی کیا وجہ تھی۔ ممکن ہے کہ اس کا یہ سبب ہو کہ جو فوج اُس نے امیر علی برید کی مدد کے لیے روانہ کی تھی اُس نے اپنے فرائض انجام نہ دیے ہوں۔ ابراہیم کو اس کی دغابازی کا شک ضرور تھا۔ ممکن ہے کہ اُسے یہ خیال بھی ہوا ہو کہ برہان کے پے در پے حملوں کے پردے میں امیروں کی بھی کچھ سازش ضرور ہے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ابراہیم نے اپنے افسروں کو نہایت بیدردی سے ستانا شروع کردیا۔ اور صرف دو مہینے کے قلیل عرصہ میں چالیس ممتاز ہندو اور ستر مسلمانوں کو قتل کرادیا۔ امراء جب بالکل مایوس ہوگئے تو انھوں نے اس بات کی سازش کی کہ اُسے تخت سے اُتار دیا جائے اور بجائے اُسکے اُس کے بھائی عبداللہ کو تخت پر بٹھایا جائے[۵۴]۔ مگر قبل اسکے کہ اُن کا یہ منصوبہ پورا ہو بادشاہ کو اس کی خبر لگ گئی۔ جس سے اُس کا جنون اور بھی مشتعل ہوا۔ اُس نے اب ہر راہی کو جس پر ذرا بھی سازش میں شرکت کا شبہ ہوتا تھا قتل کرانا شروع کردیا۔ شہزادہ عبداللہ گوا بھاگ گیا۔ بہت سے امراء دارالسلطنت چھوڑ کر چلے گئے کیونکہ اب کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بادشاہ کے ظلم کا شکار اب کون بنے گا۔ بیچارہ اسدخاں بھی بیلگام چلا گیا۔ کیونکہ بادشاہ کو پھر اس کی طرف سے شک پیدا ہوگیا تھا[۵۵]۔

[ا۵] بساتین السلاطین صفحہ ۷۰ - ۷۱ - فرشتہ جلد ۳ صفحہ ۹۴ - ۹۵

[۵۲] برہان مآثر - صفحہ ۵۰

[۵۳] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم ۴۴۱

[۵۴] فرشتہ - جلد ۳ - صفحہ ۹۵ - ۹۶

[۵۵] بساتین السلاطین - صفحہ ۵۱ - ۵۲ - دانڈراڈا - صفحہ ۲۶ - ۲۸ - فرشتہ - جلد سوم صفحہ ۹۶ - ۹۸ -

شہزادہ عبداللہ اپنے بھائی کے ظالمانہ برتاؤ سے عاجز آکر گوا کو چلا گیا تھا۔ بیجاپور کے بہت سے امراء نے مدد حاصل کرنے کی امید میں عبداللہ کو ترغیب دی کہ برہان نظام شاہ اور جمشید قطب شاہ سے خط و کتابت کی جائے۔ ان بادشاہوں نے بیجاپور کی پریشان اور تباہ حالت دیکھ کر اور اسد خاں کے تنفر کو معلوم کرکے وعدہ کیا کہ وہ عبداللہ کو تخت پر بٹھانے میں ضرور مدد دیں گے۔ انھوں نے گوا کے پرتگالیوں کو اس مضمون کا خط لکھا کہ ابراہیم عادل شاہ کے مظالم کی وجہ سے وہ پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اُسکی سلطنت میں ایسی بدامنی پھیلے گی جسے وہ رفع نہ کر سکے گا۔ اس لیے اُنکی دلی خواہش ہے کہ شاہزادہ عبداللہ کو بھیجدیا جائے۔ تاکہ اُسے بھائی کی جگہ پر تخت نشین کر دیا جائے۔ پرتگالی ان کا ساتھ دینے پر رضامند ہو گئے۔ اور اُنھوں نے کہا کہ اس میں کامیابی کی اُمید اُسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اسد خاں پورے طور پر اُن کا ساتھ دے۔ مگر اسد خاں کی یہ حالت تھی کہ خواہ اُسے کتنی ہی تکلیف اُٹھانی پڑتی اور اشتعال دیا جاتا لیکن وہ اپنے مالک کا ساتھ چھوڑنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ برہان اور جمشید خود بیجاپور کی طرف بڑھے۔ اسد خاں نے اُن کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اسد خاں گھبراتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں سلطنت کو یہ خود آپس میں تقسیم کر لیں جب یہ اپنی سلطنتوں کو واپس گئے تو پرتگالیوں نے بھی مدعی شہزادہ کی کوئی مدد نہ کی۔ شہزادہ کے مددگاروں کی جماعت بیجاپور اور گوا دونوں جگہ منتشر ہو گئی۔ کانکن نے پرتگالیوں سے بیزار ہو کر ابراہیم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ابراہیم نے فوج لیکر سے مغربی گھاٹ طے کرکے بغاوت کو فرو کیا۔ اسد خاں کی اپنے آقا سے مصالحت ہو گئی۔ وہ آخری وقت اپنے وفادار نوکر کو عالم نزع میں بستر مرگ پر دیکھنے کے لیے روانہ ہوا۔ لیکن ابراہیم کے بیلگام پہونچنے سے پہلے پہلے جنوری ۱۵۴۹ء میں اسد خاں کا انتقال ہو گیا۔[1]

بیجاپور اور گوا میں جو مخالفت عبداللہ کی وجہ سے ۲۲ راگست ۱۵۴۸ء کو پیدا ہو گئی تھی وہ ابراہیم عادل شاہ اور پرتگالی گورنر گارسیا ڈی سا کے درمیان ایک صلحنامہ کے ذریعہ سے دُور کی گئی۔[2]

برہان نظام شاہ نے بیجاپور کے خلاف ۱۵۴۹ء کے اواخر یا ۱۵۴۹ء کے اوائل میں پھر ایک مرتبہ نبرد آزمائی کی۔ وہ شہزادہ عبداللہ کو جمشید قطب شاہ اور پرتگالیوں کی مدد سے ابراہیم کے تخت پر بٹھانے میں ناکام رہا۔ برہان نظام شاہ کی کوششوں کی ناکامی کی اصلی وجہ اسد خاں کی راسخ وفاداری تھی۔ چونکہ اسد خاں کی وفات کی وجہ سے اُس کے آقا ابراہیم کی بہبودی کی کوئی فکر کرنے والا نہ تھا۔ اس لیے برہان نے اپنی پرانی کوشش کے اعادہ کے لیے موقع غنیمت جانا۔ اُس نے اپنے اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے عام راجہ کے پاس سفیر بھیج کر

---

[1] فرشتہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۹۸-۹۹ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ جلد سوم صفحہ ۴۴۱-۴۴۲ بساتین السلاطین صفحہ ۵۲-۵۳

[2] فاریا۔ جلد دوم حصہ ۳ دانوراڈا ۲۴۰-۲۴۱

آپس میں اتحاد اور دوستی کا اعتراف کیا۔ ابراہیم کو جب اس نامہ و پیام اور اتحاد و دوستی کی خبر معلوم ہوئی تو اُس نے بیجاپور میں رام راجہ کے سفیروں سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ سفیر اپنی جان کے خوف سے فوراً وجے نگر واپس گئے۔ اور ابراہیم کے اس طرز عمل سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ رام راجہ بہت غصہ ہوا اور اُس نے ابراہیم کو احمد نگر سے جنگ میں پھنسا دینے کے لیے برہان نظام شاہ کو ایک خط لکھا کہ حسب معاہدہ وہ عادل شاہی سلطنت پر فوج کشی کرے۔ برہان کلیانی کے خلاف روانہ ہوا۔ ابراہیم اپنی ایک فوج لیکر مداخلت کرنے والوں کے مقابلہ کے لیے تیار رہا۔ اس میں اُسے شکست ہوئی اور کلیانی برہان کے قبضہ میں آگیا۔[۵۱]

ابراہیم نے کلیانی فتح کرنے کی پھر جلد تیاری کی۔ برہان کو جب یہ خبر ہوئی تو اُس نے رام راجہ کے پاس اپنے سفیر بھیجے۔ رام راجہ نے احمدپور کے قریب برہان سے ملاقات کرنی چاہی تاکہ سال آیندہ کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کرلیا جائے۔ اس واقعہ نے ابراہیم کی توجہ جنوبی سرحد کی طرف منعطف کردی۔ رائچور اور مُدگل دشمنوں کی متفقہ قوت کا مقابلہ نہ کرسکے اس لیے اُن کے قبضہ میں آگئے۔ پھر بھی برہان کو تسکین نہ ہوئی وہ ابراہیم سے سخت متنفر تھا۔ ان دونوں فتوحات کے بعد اُسے اپنے ہندو دوست کو ابراہیم کے دارالسلطنت بیجاپور کے محاصرہ کے لیے تیار کرلینا کچھ مشکل نہ تھا۔ چنانچہ ابراہیم قلعہ بند ہوگیا اور احمد نگر اور وجے نگر کی فوجوں نے اُس کا محاصرہ کرلیا۔ احمد نگر کا زبردست توپ خانہ قلعہ کے مقابلہ میں لا یا گیا۔ ابراہیم نے بھی قلعہ کی محافظت میں سُستی سے کام نہیں لیا بلکہ اُس نے نہایت بہادری اور دلیری کا ثبوت دیا۔ اسی طرح سے محاصرہ جاری رہا۔ ابراہیم کی خوش قسمتی کہ محاصرہ کے دوران میں برہان سخت بیمار پڑ گیا حتیٰ کہ احمد نگر واپس ہونے پر مجبور ہوا، اور وہیں ۳ ردسمبر ۱۵۵۳ء کو اسکی وفات ہوئی۔[۵۲]

برہان کی وفات کے بعد ابراہیم کو اُمید تھی کہ اب اُسے احمد نگر سے فرصت مل جائیگی۔ چنانچہ برہان کے جانشین حسین برہان سے ایک مرتبہ اُس کی دوستانہ ملاقات بھی ہوئی مگر یہ سمجھوتا زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا کیونکہ حسین نظام شاہ کے کئی بھائی اپنے باپ برہان کے انتقال کے بعد بھاگ گئے تھے اور اُنھوں نے ابراہیم عادل شاہ کے یہاں پناہ لی تھی۔ یہ لوگ اس کے علاوہ سلطنت میں احمد نگر کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۵۵۴ء میں خواجہ جہاں والی پرینڈا (جس پر نظام شاہ نے حملہ کیا تھا کیونکہ وہ دوسرے شاہزادوں کے حقوق کی تائید کرتا تھا) بیجاپور بھاگ آیا۔ اسی زمانے میں سیف عین الملک نے برار چھوڑ دیا۔ اور ابراہیم عادل شاہ کے یہاں پناہ لی تھی۔ ابراہیم نے اُسے سابق

---

۵۱ فرشتہ ۔ جلد سوم ۔ ۱۲۰ ۔ ۱۵۴ اور ۲۳۵

۵۲ برہان مآثر صفحہ ۷ ۔ ۳۵۸ ، فرشتہ جلد سوم ۱۰۴ ۔ ۱۰۵ و ۲۳۸ ۔ کیمبرج ہسٹری جلد سوم ۴۲۲

اسد خاں لاری کی جاگیر عطا کی جس کی وجہ سے وہ بیجاپور کا بڑا دولتمند اور طاقتور امیر بن گیا۔ دونوں پناہ گزینوں نے ابراہیم کو اپنے بھتیجے علی کی تائید پر آمادہ کرلیا۔ یہ حسین کا سوتیلا بھائی بھی تھا۔ اور ابراہیم کے دربار میں پناہ گزیں تھا۔ شہزادہ کو اپنے سوتیلے بھائی کی سلطنت پر لشکرکشی کیلیے ایک چھوٹی سی فوج دی گئی۔ اُدھر ابراہیم نے شولاپور کا محاصرہ کرلیا۔ مگر علی کو خلاف توقع بہت مایوسی ہوئی اور حسین دریا عماد شاہ کے ہمراہ شولاپور پہونچا۔ ابراہیم نے سیف عین الملک کو مقدمۃ الجیش کے ہمراہ بھیجا تاکہ وہ حسین اور دریا عماد شاہ کو آگے بڑھنے سے روکے۔ مگر اُس نے جلد بازی سے کام لیا اور حسین کی تمام فوج پر حملہ کردیا۔ اُس کی تھوڑی سے فوج چاروں طرف سے گھر گئی۔ ایک افسر نے بدحواسی کے عالم میں ابراہیم کو یہ خبر دی کہ اُس نے سیف عین الملک کو گھوڑے سے اُتر کر حسین کے سامنے شاہی آداب بجالاتے دیکھا۔ ابراہیم اس خبر کی تصدیق کیے ہوے بغیر بیجاپور کی طرف ہٹ گیا۔ ابراہیم کے جلدی سے ہٹ جانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُسے خبر ملی تھی کہ سیف عین الملک جو حقیقۃً اُس سے ملنا چاہتا تھا، دشمنی کی نیت سے اُس کا پیچھا کررہا ہے۔ حسین جس کی فوج نے کافی زک اُٹھائی تھی احمدنگر واپس ہوا۔ اور ابراہیم کے لیے یہ جنگ بالکل بیکار ثابت ہوئی[1]۔

ابراہیم کی ذلت کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہوا بلکہ موجودہ جنگ کا دوسرا یہ نتیجہ ہوا کہ عین الملک نے بغاوت شروع کردی۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سے عین الملک کی حکمت عملی کی غلط ترجمانی ابراہیم سے کی گئی، جسکی وجہ سے اُس نے بیجاپور کے پسپا ہوجانے کو بہتر سمجھا۔ کچھ عرصہ کے بعد عین الملک بھی دارالسلطنت پہونچا اور بادشاہ سے ملاقات کرنی چاہی تاکہ غلط فہمی کا ازالہ کیا جاسکے۔ مگر ابراہیم یہ سمجھتے ہوے کہ سیف اس کا تعاقب کررہا ہے قلعہ بند ہوگیا اور اُس سے ملنے سے انکار کردیا۔ اُسکے قاصد کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا گیا اور سیف کو بتادیا گیا کہ اگر وہ باغی نہیں ہے تو پھر بھی ایک کُتّا نوکر ہے جس سے کوئی فائدہ کی امید نہیں کی جاسکتی۔ عین الملک نے اس برتاؤ کی وجہ سے متنفر ہوکر سلطنت بیجاپور میں ایک باغی کی حیثیت اختیار کرلی کیونکہ وہ اب بھی اپنے قدیم آقا کے پاس احمدنگر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اُس نے دریائے مان کی طرف رُخ کیا، فصلوں کو لوٹنے اور برباد کرنے لگا، اور کاشتکاروں پر ٹیکس مقرر کرکے اپنی فوج کی تنخواہ دینے لگا۔ اُس نے شاہی فوج پر کئی مرتبہ فتوحات حاصل کیں اور عبداللہ کی تائید میں جو اس وقت گوا میں موجود تھا، اعلان بھی کردیا۔ اُس کے بھتیجے صلابت خاں نے پانچ ہزار سواروں کی فوج کو جو اُس کے خلاف بھیجی گئی تھی شکست دی اور سیف عین الملک نے بھی خود اُس دس ہزار فوج کو جو دلاور خاں کی

---

[1] برہان مآثر صفحہ ۷۶-۸۰، فرشتہ جلد سوم ۱۰۵-۱۰۷، کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم صفحہ ۴۴۳

سرکردگی میں بھی شکست دی۔ حبشی سردار اور خود ابراہیم بیجاپور بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ عین الملک نے اُن کا تعاقب کیا۔ ابراہیم جب بہت تنگ اور پریشان ہوگیا تو اُس نے رام راجہ سے مدد مانگی۔ رام راجہ نے اپنے بھائی دنکٹا دری کو پندرہ ہزار سواروں کے ہمراہ اُس کی مدد کے لیے بھیجا۔ سیف عین الملک نے ہندو فوج پر شبخون مارا مگر شکست کھائی کیونکہ ہندو ہوشیار تھے۔ عین الملک کی فوجیں قریب قریب بالکل برباد ہوگئیں اور وہ اپنے بھتیجے صلابت خاں کے ساتھ احمد نگر کی سرحد پر بھاگ گیا۔ اور التجا کی کہ اُسے شاہی ملازمت میں دوبارہ داخل کرلیا جائے، حسین نظام شاہ نے دھوکا دینے کی غرض سے اُس کا جواب اثبات میں دیا۔ لیکن جب عین الملک حاضر ہوکر آداب شاہی بجالایا تو اُس نے اُسے قتل کرادیا[۵۵]۔

عین الملک کی بغاوت کے زمانہ میں شہزادہ عبداللہ نے جو اس وقت گوا میں موجود تھا، باغی کی حمایت پر اعتماد کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اپنے بھائی کے تخت کا دعوے کیا۔ اُسے پرتگالیوں نے بھی مدد دی۔ عین الملک کی بغاوت کے ساتھ ساتھ عبداللہ نے اپنے کو شاہ بیجاپور مشہور کردیا۔ دو ہزار سواروں اور تین ہزار پرتگالی پیادوں کے ہمراہ عادشاہی چوکی (بیرونی قلعہ) پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا۔ اُسے ایک پرتگالی افسر کے ماتحت کرکے خود بیجاپور کا رُخ کیا بالآخر ابراہیم نے اُسے شکست دی اور وہ قید کرکے قتل کرادیا گیا[۵۶]۔

ان تمام حالات کے سُدھرنے کے بعد ابراہیم عادل شاہ، شراب نوشی اور عیاشی کی زیادتی کی وجہ سے ایک پیچیدہ اور مہلک مرض میں مبتلا ہوگیا۔ اُس نے اپنے دورانِ علالت میں بہت سے طبیبوں کو جو اُس کے علاج میں ناکامیاب ہوئے قتل کرادیا، اور بعض کو ہاتھیوں سے کچلوا کر مرواڈالا۔ جو طبیب باقی رہ گئے تھے وہ بیچارے اپنی جان لیکر حدودِ سلطنت سے باہر نکل بھاگے۔ آخر کار طبیبوں کے چھوڑ دینے پر ۱۵۵۷ء میں اُس کی وفات ہوئی۔ اور اپنے آبا و اجداد کے مزارات کے قریب دفن کیا گیا[۵۷]۔

---

۵۵ بساتین السلاطین۔ صفحہ ۵۵-۵۶ فرشتہ جلد ۳- ۱۰۷-۱۱۱ ہسٹاریکل لینڈ مارکس آف دی دکن صفحہ ۹۲ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۴۴۳-۴۴۴

۵۶ فاریا حصہ دوم باب ۲ کیمبرج ہسٹری جلد سوم صفحہ ۴۴۴

۵۷ فرشتہ۔ جلد ۳- صفحہ ۱۱۱-۱۱۲

قائم

(جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب بی اے ایل ایل بی۔ وکیل)

آپ کا نام قیام الدین اور قائم تخلص تھا۔ اگرچہ مولد چاند پور ضلع بجنور تھا مگر بسلسلۂ ملازمت زندگی کا بیشتر حصہ دلّی میں بسر ہوا۔ فارسی استعداد اچھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ کلام میں فارسی تراکیب دلپسند انداز کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اس وقت دلّی میں شعرائے باکمال کا جمگھٹا تھا اس لیے قائم کو بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا پہلے خواجہ میر درد سے اصلاح لی، بعد میں مرزا سودا سے تلمذ ہوا۔ اور فن شاعری میں نام پیدا کیا۔

دلّی کی تباہی کے بعد اپنے وطن واپس آئے اور کچھ روز نواب محمد یار خاں کے ساتھ ٹانڈہ میں رہے۔ اسکے بعد رامپور چلے گئے۔ تھوڑے دن وہاں بسر کیے۔ بعد ازاں لکھنؤ گئے اور مہاراجہ ٹکیت رائے کا شقہ اپنے وطن کے عامل کے پاس لے گئے۔ روپے اور املاک جو ضبط ہو چکی تھیں اُن کو پھر بحال کرایا۔ لیکن وہاں سے پھر طبیعت اُچاٹ ہوئی اور رامپور چلے گئے اور وہیں ۱۲۰۸ ہجری میں انتقال فرمایا۔ علاوہ ایک کلیات کے اُردو شعراء کا تذکرہ بھی فارسی میں تحریر فرمایا ہے جس کا نام مخزن نکات ہے۔ مجموعۂ نغز میں لکھا ہے کہ قائم امروہہ کے قاضی مقرر کیے گئے تھے اور اس عہدۂ قضا پر تعینات تھے۔

آزاد نے آبِ حیات میں اس باکمال شاعر کو مرزا سودا کے تحت حاشیے پر جگہ دی ہے

کلام پر تبصرہ

ذرا چند سطریں ملاحظہ ہوں:۔

"یہ صاحب کمال بانداز اکلے رہنے والے تھے گر فن شعر میں کامل تھے۔ ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان سے پیچھے نہیں رکھ سکتے۔ کیا کیجیے کہ قبول عام اور کچھ شے ہے۔ شہرت نہ پائی"

معلوم ہوا کہ حضرت آزاد شہرت کے پیچھے پیچھے ہیں۔ جسکے کلام نے شہرت نہ پائی آپ نے بھی اس کو زمرۂ شعراء سے خارج کر دیا۔ کیا سخن فہمی اسی کا نام ہے؟ سبحان اللہ!

نیز یہ بھی خیال خام ہے کہ کلام قائم کو شہرت نصیب نہ ہوئی۔ آپ کے دو شعر تو بتاب زبانزد خاص و عام ہیں:۔

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند　　کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا　　آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

جب شیفتہ کے زمانہ تک بعض لوگ قائم کو سودا کا ہم پلہ سمجھتے تھے تو یہ کہنا کہ کلام قائم کو شہرت نصیب نہ ہوئی

بیجا ہے۔ چنانچہ شیفتہ نے اس عام خیال کی یہ کہکر تردید کی ہے کہ

"آنچہ بعض ناشناسان سخن بہ مکانت سوداؔ ابشا رندش حرف دردیوانگی شاں از جنون است"

بڑے بڑے اُستادوں کا بھی یہی حال ہے کہ اُن کا ایک آدھ شعر ضرب المثل ہو جاتا ہے۔ نہ کسی کا تمام کلام ضرب المثل بنتا ہے اور نہ شہرت پذیر ہوتا ہے۔ عوام سخن فہم نہیں ہوتے۔ خواص کو چاہیے کہ جو کلام اُنھیں پسند آئے اُس کی تعریف کریں اور جو ناپسند ہو اُس کی بُرائی کریں۔ ورنہ بُرے بھلے میں تمیز کرنا دشوار ہو جائیگا۔ اگر محض شہرت کو اچھے کلام کا معیار سمجھا جائے تو بہت سے بے کمال اُستاد بن جائیں گے، اور بڑے بڑے اُستاد شعراء کی فہرست سے خارج ہو جائیں گے۔ آزاد سے کوئی پوچھے کہ میر مناحک کا آپ کو صرف ایک شعر ملا اور آپ نے اُن کا حال درجِ کتاب کیا۔ برخلاف اِس کے نظیر کا کلام کافی مشہور ہے اور اُنکا کلیات بھی دستیاب ہوتا ہے لیکن آپ نے اُنکا ذکر حاشیہ پر بھی نہ کیا۔ یہ کیوں؟ انصاف! انصاف!!

درصل قائم کا تصور یہ ہے کہ ابتدا میں اُس نے ہدایت اللہ خاں ہدایت سے اصلاح لی۔ بعد ازاں خواجہ میر درد کا شاگرد ہوا۔ اسکے بعد مرزا سوداؔ سے مشورۂ سخن کرنے لگا۔ اور ہر ہمہ اُستادانِ فن سے اُس کا بگاڑ ہوا یہاں تک کہ ہدایت کی ہجو میں ایک قطعہ کہا اور سوداؔ نے قائم کی ہجو کہی تو مرزا سوداؔ سے جا کر معافی مانگی اور قائم کی بجاے مرزا نے فوقی تخلص ایک فرضی شاعر کا نام لکھدیا۔ (تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم)

شیفتہ گلشن بیخار میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"قائم تخلص شیخ محمد قیام الدین از ساکنانے چاندپور وارشد تلامذۂ مرزا رفیع سوداؔ است۔ شاعرے ست خوش گفتار بلند پایہ موزونیت عالیقدار گرانمایہ ...... ہمہ حال قائم در سخن دستگاہے دل پسند دارد گو بپایۂ سوداؔ نباشد احاطہ بر اصناف او را میسر است۔ لاسیما از قطعات و رباعیات معانیے کہ دلالت بر شوخیِ فکرش کند از طبعش تراویدہ ...."

صاحب طبقات الشعراء لکھتے ہیں:۔

"بسیار آدم بامزہ و اہل درد، متواضع خلیق، مہذب صورت، پاکیزہ سیرت، خوش مقال و در سخنوری بکمال از خوش خیالانِ زماں و ابنہ نظر ثانی جہاں فکر رسا دارد و در نازک خیالی ذہنی عالی و در سخنوری رسیدہ"

مصحفی اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں:۔

"در پختگی کلام و چستی مصرع غزل دردیہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق زمانہ و روش بروش استادان او میرفت بلکہ در بعضے مقام رجحان می جست"

ہمارے پیش نظر قائم کا وہ مختصر مجموعۂ کلام ہے جو حسرت موہانی نے شائع کیا ہے۔ اُس میں تقریباً ایک ہزار

اشعار غزل کے ہونگے۔ آخر میں ایک قصیدہ کے بھی چند اشعار درج ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن کے متعلق تو ہم کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتے اور لامحالہ دیگر تذکرہ نویسوں کی رائے کو تسلیم کرنا پڑیگا۔ البتہ غزل گوئی کے متعلق ہم اپنی رائے دے سکتے ہیں جو درج ذیل ہے۔

تین چار غزلوں کے پڑھنے کے بعد طبیعت نے جو مزا پایا تو دل سے یہ صدا آنے لگی کہ قائم کا شمار اُستادوں میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسی معیار سے بقیہ غزلیات دیکھی گئیں اور سچ یہ ہے کہ آپ کے طرزِ ادا اور مضامینِ نو کی جلوہ گری اور فارسی تراکیب کی دلکشی آپ کو کسی اُستاد کے پیچھے بیٹھنے نہیں دیتیں۔ اگرچہ تشبیہات معمولی ہیں لیکن سلیقہ کے ساتھ بندھی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قائم اپنا مرتبۂ شاعری خود بھی بلند سمجھتے تھے۔ چنانچہ حسب ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہمعصر شعرا کو یہاں تک کہ حضرت سودا کو بھی جو اُستاد تھے اپنے سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے اور میر کے تو مقابل ہونا تو صاف صاف کہتے ہیں، البتہ سودا کا لحاظ کر جاتے ہیں:۔

اے گردشِ زمانہ تری کج روی کے بیچ — کیسر نواحِ ہند سے شعر و سخن گیا
سودا تو اپنے حال میں مدت سے مست ہو — (ق) قائم رہا تھا ایک سو اپنے وطن گیا

قائم ترے سخن کو مدت سے اناہے — ظاہر میں تجھ سے ناخوش گو ہے ہزار سودا

قائم جو کہیں ہیں فارسی یار — اُس سے تو یہ ریختہ ہے بہتر

سبزے نے بھی قائم کے ہو گو نگر سخن یاروں کا سبز — آگے بلبل کے کسے خوش آتی ہے فریادِ زاغ

قائم تو بھی لگا کے نہ کہیو یہ ریختہ — ہونا پڑے گا حضرتِ اُستاد کی طرف

میرا سا لب و لہجہ کہاں مرغِ چمن میں — گُل کترتا ہوں سو زنگ سے یہ طرزِ سخن میں

قائم یہ فیضِ صحبتِ سودا ہے ورنہ میں — طرحی غزل سے میر کی آتا تھا بر کہیں

آج قائم کے شعر ہم نے سُنے — ہاں اک انداز تو نکلتا ہے

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ — اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

قائم میں عندلیب خوش آہنگ تھا چمن — زاغ و زغن کے ساتھ کیا ہمقفس مجھے

بہر حال قائم کے کلام سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ آپ یقیناً علمِ اُستادی بلند کیے ہوئے ہیں۔ قائم کے اشعار میں ایسی کشش ہے کہ خواہ مخواہ دل اُدھر کو کھنچا چلا جاتا ہے۔ روانی اور سلاست کے علاوہ ترکیب شعر کی چستی اور مضمون کی بلندی یہ دونوں آپ کو اُستاد کہنے پر مجبور کرتی ہیں۔

ذیل میں قائم کی چند فارسی تراکیب جو سرسری طور پر قلمبند کی گئی ہیں درج کی جاتی ہیں:۔

کاغذِ آتش زدہ، ملوثانِ خروش، تبسم فروش، پریشاں نظری (یہ ترکیب میر تقی میر کے یہاں بندھ چکی ہے)

جلوہ جا ہے اے اُس بُتِ ہرجائی کا — نہ پریشاں نظری جُرم ہے بینائی کا

چوبِ کِرم خوردہ، ستم ظریف، یک سرِ ہزار سودا، مستغنائے عہدِ شباب، خانہ بر اندازِ عندلیب، دیدۂ خوں بار، محلِ غیرت، زلفِ شوخ سر، طولِ امل، کاوشِ طلب **شعر**

آمادۂ خلش ہیں مرے عضوِ تن ہنوز — کاوش طلب ہیں تیغ سے زخمِ کہن ہنوز

نعل در آتش **شعر**

بیتابی کو ذرّے کی ہو واں کون سی ارزش — پھر آپ کو کہتا ہے جہاں نعل در آتش

داغ بر بالائے داغ، دریا دریا، رہینِ بہار **شعر**

جوں نخلِ شمع کب ہیں رہینِ بہار ہم — جز اشک و آہ رکھتے نہیں برگ و بار ہم

سینہ خراشی، گاہ باشد، **ع** گاہ باشد کہ ترے دل میں یہ تاثیر کریں + واشد، دم قدم **شعر**

دم قدم سے ہے ہمارے ہی جنوں کی رونق — اب بھی کوچوں میں کہیں شور و فغاں سنتے ہو

غلط نگاہی۔ دوا پذیر۔ **شعر**

قائم نہیں ہے دردِ محبت دوا پذیر — تا جان ہے یہ جان کا آزار ساتھ ہے

ہمراہانِ پیش قدم۔ شوقِ پریشانی۔ دشتِ بلا خیز۔

قائم کے یہاں تشبیہات بھی موجود ہیں۔ مثلاً

شب دردِ دل نے شرم رکھی ورنہ مثلِ شمع — بے طرح جوشِ گریہ سے علی الاتصال تھا

ہوا سے آہ سے چمکا ہے سوزِ داغ مرا — مدد نے باد کی روغن کیا چراغ مرا

رات کو چین ہے نہ دن کو تاب — دل ہے یا رب کہ پارۂ سیماب

جا سے ہو دن نہیں یہ بحرِ جہاں — خانہ بر دوش رہ تو مثلِ حباب

دل پاکے اُسکی زلف میں آرام رہ گیا — درویش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا

مانندِ غنچہ موجبِ آشفتگی ہوا — پہونچا کسی کے دل کو جو گردوں سے انبساط

شب غم سے مری جان ہی پہ آن بنی تھی — جو بال بدن پر تھا سو برچھی کی انی تھی

قائم کے یہاں بعض ہندی الفاظ خوب بندھے ہیں، ملاحظہ ہوں:۔

کس بھروسے پہ دلا ہم کو تجا تھا تو نے — اسی مُنہ سے تجھے دعویٰ تھا شکیبائی کا

ہنس ہنس کے ڈالتا ہے یہ کس کے گلے میں ہاتھ — کیا مجھ کو وہ معاملہ شب کا بسر گیا

صحت کا دل میں پاؤں نہ آزار کی ہوس — ناگفتنی ہے کچھ ترے بیمار کی ہوس

موافقت کی بہت شہریوں سے میں لیکن — وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں

کیا ہتیا ہیں تجھے دینی ہے لے عزیز — اتنا پڑا ہے تک خدا جا کے مر کہیں

دل نازک دکا عشق ورشی — اتنا ہے نپٹ ہراس مجھ کو

روئیگی کب تک اے قرۂ اشکبار بس — اب کیا ہے مجھے ڈبوئیگی جل تھل تو بھر گئے

سنگ کو آب کریں پل میں ہماری باتیں — لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

دوس کیا دیجیے چور کو قائم — بند گھر کا میں آپ در نہ کیا

دسا ور سے کوئی جاتا ہے خالی ہاتھ یوں قائم — بھلا آیگی کن یاں کی تو کچھ تو جنس بھر لیجا

اپنے ہم عصر شعرا کی طرح قائم کے یہاں بھی متروکات کلاں ہیں :-

نت بجائے ہمیشہ۔ تنک بجائے ذرا

جو ٹوٹ جائے تنک یہ طلسم ہستی کا — ہزار گنج ہوں ظاہر مرے دفینے میں

سجن یعنی محبوب، اسے میاں بالکل متروک ہے ۔ انھوں کو بجائے انکو ۔ لیک یعنی لیکن، جوں ہوا بجائے جس طرح ہوا، میں نہ دیکھا بجائے میں نے نہ دیکھا، چاہے ہے بجائے چاہتا ہے، انھیں کیونکر گزری بجائے انکی کیونکر گزری، بجھ نام سے بجائے میرے نام سے، دِوانا بجائے دیوانہ، سدا بجائے ہمیشہ، سیں بجائے سے، سلایا نہ جائے گا بجائے سلوایا نہ جائیگا، تنک بجائے تنک کر، پونچھیو بجائے پونچھیو، جوں بجائے مانند، پھیر بھیجا بجائے پھر بھیجا، ہم کھینچا بجائے ہم نے کھینچا، تیں یاد کیا بجائے تونے یاد کیا، کبھو بجائے کبھی، ہُوا بجائے مرا، چاہیئے بجائے خدا جانے، وسے بجائے وہ، بیچ بجائے میں، جگت بجائے زمانہ، آونے بجائے آنے، کسو بجائے کسی، تجھ بغیر بجائے تیرے بغیر، کن نے بجائے کس نے، اندھیاری بجائے اندھیرا ؎

شمع مجھ کو ڈھونڈ را گور کی اندھیاری سے — ہجر کی کاٹی ہیں میں نے تو شب تار بہت

آپی بجائے آپ ہی، نیں بجائے نہیں ؎

[illegible] ایک زخم نیں مرے تن پر — کون سی ہے یہ امتحاں کی طرح

[illegible] کیونکہ بجائے کیونکر، جان کو مذکر باندھا ہے ؎

[illegible] کے راہ میں تجھ کو جان تک — اب اور عذر کروں کہاں تک

[illegible] بجائے [illegible] اور [illegible] بجائے تمھارے ۔ ایک جگہ کیفیت کو کیفیت یعنی یائے مشدد کی جگہ یائے مفتوح باندھ گئے ہیں ؎

کیفیت شب جا سکے ہے تجھ پہ جو آنی سے [illegible] — حسن نور شمع کب اس طرح دکھلاتی ہے صبح

معشوق سے مساویانہ گفتگو کو بھی کوئی عیب نہیں سمجھتے، فرماتے ہیں

ہرگز جب خفگی آئی تو جھگڑا کیا ہے — تم کو خواہند وہبت ہم کو طرحدار بہت

ایک رکیک شعر بھی حسرت کے انتخاب میں ملا۔ ممکن ہے اس قسم کے اشعار کی تعداد اصل دیوان میں بہت زیادہ ہو، کیونکہ اُس وقت اس قسم کے اشعار لکھنا کوئی عیب کی بات نہیں سمجھتے تھے۔

کسی سپاہی پسر کو نہ دیجو دل قائم — کہ اہل فن کا ہے عالم میں مغتنم جینا

قائم کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی قید فرنگ کو سخت مصیبت سمجھا جاتا تھا

ہوا ہے تا بہ نفس رشتۂ پر پرواز — ہمیں تو زندگی قید فرنگ ہے صیاد

ذیل میں آپ کے منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں:—

۱ پھر کے جو وہ شوخ نظر کر گیا — تیر سا اک دل سے گزر کر گیا

۲ اے ابر اپنے گریہ میں جس وقت جوش تھا — جو قطرہ اشک کا تھا سو طوفاں خروش تھا

۳ ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ جائے غم ہے شیخ — کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

۴ نہ جانے کونسی ساعت چمن سے بچھڑے تھے — کہ آنکھ بھر کے نہ پھر سوئے گلستاں دیکھا

۵ غرور مجھ کو نہیں شیخ بے گناہی کا — امیدوار ہوں میں رحمت الٰہی کا

۶ نہ کر غرور تو منعم کہ ایک گردش میں — فقیر کا سا پیالہ ہے تاج شاہی کا

۷ بے دماغی سے نہ اس تک دل رنجور گیا — مرتبہ عشق کا یاں حسن سے بھی دور گیا

۸ لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قائم — شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

۹ طراز کلک قضا اور بھی تو ہیں مشہور — پہ تجھ سا صفحۂ ہستی پہ نقش کم کھینچا

۱۰ دل بارات کس کی یاد تھی کہ میاں ملال تھا — صدقے میں، کچھ تو بول کہ کیا تجھ پہ حال تھا

۱۱ چھوٹ کر دام سے ہم گرچہ رہے گلشن میں — پر تری قید کو صیاد وہبت یاد کیا

۱۲ وہ حال سے مرے اتنا نہ بے خبر ہوتا — اگر مرا اثر آہ نامہ بر ہوتا

۱۳ جب تک ہے مثل آئینہ امکان دیکھنا — دکھلائے جو فلک سو مری جان دیکھنا

۱۴ گلی سے اس کی جو قائم کو لائے ہم تو کیا — یہ دل پہ نقش ہے اب تک کہ پھر گیا ہوگا

۱۵ چپ سی کچھ لگ گئی ہے جو کوئی — تجھ سے اک بار ہمکلام ہوا

۱۶ جب سنگ آشنا نہ ترا تکیہ گاہ تھا — ہم کو بھی کوچے عشق میں اک عزوجاہ تھا

۱۷ عیش و طرب کہاں ہے غم دل کدھر گیا — صدقے میں اس گزشت کے سب کچھ گزر گیا

۱۸ آئے بھی فصلِ گل تو ہمیں کیا کہ ہم نشیں
جس دل میں کچھ ہوا تھی سو اب دل وہ مر گیا

۱۹ ہرگز نہیں مقدور تری حمد زباں کا
برہان ہے دعوے کی مرے عجز بیاں کا

۲۰ اے عشق مرے دوش پہ تو بوجھ رکھ اپنا
ہر سر متحمل نہیں اس بارِ گراں کا

۲۱ پوشیدہ ہے جوں بو وہ ہر اک رنگ میں قائم
دیکھے تو اگر غور سے گلزارِ جہاں کا

۲۲ گو خضر تھا منزل کو نہ مقصود کی پہونچا
جویا نہ ہوا یاں جو ترے نقشِ قدم کا

۲۳ کیا دور جو بخشش پہ کریں نازِ جرائم
جس روز کہ شافع ہو تو اعمالِ اُمم کا

۲۴ یا ختمِ رسل گرچہ گنہگار ہے قائم
پر اُس کو بھروسا ہے ترے فضل و کرم کا

۲۵ ناپختگی کا اپنی سبب اُس ثمر سے پوچھ
جلدی سے باغبان کی جو خام رہ گیا

۲۶ آہ اے مرغِ چمن کچھ تو بھی واقف ہے کہ صبح
گل نے کیا پوچھا تھا ہنس کر باغباں نے کیا کہا

۲۷ ٹکڑے کب غم نے یہ جگر نہ کیا
نہ کیا نالہ ہم نے پر نہ کیا

۲۸ خُم کے خُم پی گئے سے منصور
لیک اُس کا سا شور و شر نہ کیا

۲۹ دیا فلک نے ہمیں عز و جاہ یا نہ دیا
غرض یہ ذکر مناسب ہے کیا؟ دیا نہ دیا

۳۰ تو مہرباں کبھو ہم پہ ایک دم نہ ہوا
ہوئے جو تجھ پہ ہم عاشق تو کچھ ستم نہ ہوا

۳۱ ترے فراق میں مر کر کھلا ہے یہ عقدہ
کہ تھی وہ موت سمجھتے تھے جس کو ہم جینا

۳۲ صبا کیا گلشن تک ہمارے مشت پر لیجا
قفس میں ہم پہ جو گزرے سو یاروں کو خبر لیجا

۳۳ تا بفلک نالہ تو پہونچا تھا رات
نیں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا

۳۴ کوچہ گردی دلِ مجنوں نے مرے کی ایجاد
مبتذل جان کے ڈھب بادیہ پیمائی کا

۳۵ ناصح تو کہے ہے یوں کہ گویا
ہے دل پہ کچھ اختیار میرا

۳۶ نے وعدہ اُس کے ساتھ نہ پیغام کیا کہوں
پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا

۳۷ ہنسنے کا یار یہ بھی کوئی طور ہے کہ آج
قائم نے تیرے ہات سے گھبرا کے رو دیا

۳۸ نہ جرم اُس کا ہے ثابت نہ کچھ مری تقصیر
خدا ہی جانے کہ رنجش کا کیا ہوا باعث

۳۹ رہا میں اُس سے گرفتہ اک عمر تک لیکن
کیا جو خوب تامل تو کچھ نہ تھا باعث

۴۰ ناصحا پوچھ نہ احوال خموشی مجھ سے
ہے یہ وہ بات کہ آتی نہیں تقریر کے بیچ

۴۱ کچھ آج دل پہ یہ وحشت کا رنگ ہے صیاد
ترے قفس سے چمن مجھ پہ تنگ ہے صیاد

۴۲ گئی بہار خزاں آئی گل ہوئے پامال
مری رہائی میں اب کیا درنگ ہے صیاد

فریبِ اغنیاں پہ ہو کے غافل
نہ اے بلبل اکٹھے خار و خس کر

کہ عندلیب گل نے جو پھاڑا ہے پیرہن
رکھتا ہے کس کے گوشۂ دستار کی ہوس

کس سے کہوں حال بد کہ وہ آپ
کچھ مجھ سے بھی جانتا ہے بہتر

جو سوزِ عشق کا چرچا وہاں نہیں قائمؔ
تو کیا میں جاؤں گا دینے بہشت میں آتش

نالوں سے عندلیب کے آیا ہے جی تنگ
کس نے مرے مزار پہ لا کر چڑھائے گل

توڑنا دیر و حرم تک بھی نہ چنداں ہے گناہ
اپنے مذہب میں ہے کچھ کفر تو آزردنِ دل

اب کے جو یہاں سے جائیں گے ہم
پھر تجھکو نہ منہ دکھائیں گے ہم

جو کوئی در پہ ترے بیٹھے ہیں
دونوں عالم سے پھرے بیٹھے ہیں

قائمؔ اور تجھ سے طلب بوسہ کی کیونکر کیجیے
یوں وہ ناداں ہے پر اتنا تو بد آموز نہیں

عبث ہیں ناصحا ہم سے زخود رفتوں کی تدبیریں
رُکے ہے بحر کب گو موج سی ہوں لاکھ زنجیریں

جانے دو جو نصیب میں ہونا تھا سو ہوا
یارو خدا کے واسطے تکرار مت کرو

یہ جانتا میں نہیں ہوں کہ دل ہے کیا قائمؔ
پر اک خلش سی رہے ہے مدام سینے میں

کوئی مختار کہو یا کوئی مجبور ہمیں
ہم سمجھتے ہیں جہاں تک کہ ہے مقدور ہمیں

اپنا قصور سعی ہے ملتا جو تو نہیں
کیونکر ملے وہ جسکی ہمیں جستجو نہیں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں
یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں

کہتا ہے آئینہ کہ ہے تجھ سا ہی ایک اور
باور نہیں تو لا میں ترے روبرو کروں

مجھ سا جہان میں کوئی آشفتہ سر نہیں
ہے یوں تو زلفِ یار بھی پر اسقدر نہیں

قائمؔ تو اس طرح جو پھرے ہے خراب و خوار
اے خانماں خراب گر تیرے گھر نہیں

حیرت نے کیا ہے یک جہاں کا
جوں آئینہ روشناس مجھکو

قائمؔ کے حال سے ہے غرض عبرت کہ چرخ
ایسا گرا نہیں کہ وہ تجھ سے سنبھل سکے

نہ دیکھ سرسری اوراقِ گل کو یاں قائمؔ
ہے شرح تنگیِ غنچہ فراغ میں گل کے

شب کو تو شغل گریہ ہے اور دن کو مشقِ غم
اوقات اس طرح کوئی کبتک بسر کرے

پہلے ہی سو جھتی تھی ہمیں اے شبِ فراق
یہ رات بے طرح ہے خدا ہی سحر کرے

صورت میں تری گر نظر آوے ملک الموت
جی دنیا کسی طرح سے دشوار نہ ہووے

دو چیز ہیں یادگار دوراں
تیرا ستم اپنی جاں فشانی

۶۸ عشق تو قائم نہ ہو آپ سے — اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیے
۶۹ بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائم — مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے
۷۰ کسی بلا میں پھنسے' قید ہووے جاں سے جائے — پر آدمی کو خدا تجھ پہ مبتلا نہ کرے
۷۱ کس کس صورت سے جلوہ گر ہے — اللہ رے نمود بے نشاں کی
۷۲ یہ دل وہ جنس ہے کہ دنیا گر کہیں اُسے — دھڑکا یہی رہا کہ نہ رے باز بس مجھے

قطعات تاریخ وفات لسان الملک خیام العصر حضرت ریاض

(جناب مولانا حسن مرتضیٰ صاحب شفق عماد پوری مقیم الہ آباد)

(۱)

اگرچہ سب سے تھا جس کا رنگِ تغزل — وہی ایک شاعر تھا ہندوستاں میں
فصیحوں نے بھی جس کا مانا تھا لوہا — فصاحت رہ تھی اُس کی تیغ زباں میں
پرانا تھا ساقی وہی ایک باقی — مُریدِ سخن بزم پیر مغاں میں
ہوا ختم دور مے و جام اُس پر — کہاں مست ایسا کوئی اب جہاں میں

شفق نے لکھا مصرعِ سالِ رحلت
جناب ریاض آہ پہنچے جناں میں
۱۳۵۳ھ

(۲)

ہندوستاں کو کر گئے خالی زبان سے — بے مثل تھے جو شاعرِ اُردو زباں ریاض
آباد اُن کے دم سے تھا میخانۂ سخن — تھے مست جام بادۂ پیر مغاں ریاض
افسوس راہیِ چمن جاوداں ہوئے — اے باغِ جہاں بلبلِ خلد آشیاں ریاض

ازتف نے مصرعِ سن رحلت کہا شفق
ہے سے جناں کو چل بسے جادو بیاں ریاض
۱۳۵۳ھ

(۲۰)

اصطلاحات فلسفہ پر تنقید

(بسلسلۂ ماہ جنوری ۳۵ء)

(جناب مولوی محمد اجمل خاں صاحب ایم اے، ایل ایل بی ۔ وکیل)

اِن ضمیموں میں وہ اصطلاحات درج کی جاتی ہیں جن کا ترجمہ "فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ" مرتبہ انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن) میں درج نہیں ہے ۔ گو میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہ ضمیمے اُس کمی کو پورا کر دیں گے جو فرہنگ اصطلاحات میں ہے ۔ لیکن میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ یہ کمی بہت بڑی حد تک پوری ہو جائیگی ۔ اور ان اوراق کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ خود اندازہ کر سکیں گے کہ اس میدان میں ابھی کس حد تک تحقیقات کی گنجایش ہے ۔

اجمل

ضمیمہ نمبر (۱) اصطلاحات اخلاقیات

اصطلاح انگریزی	ترجمہ	اصطلاح انگریزی	ترجمہ
Ability	قابلیت ۔ محرک اخلاق	Compact / Contract	معاہدہ
Abstinence	پرہیزگاری		
Benevolence	کرم ۔ سخاوت	Continence	عفت ۔
Blasphemy	الحاد ۔ کفر	Criterion	معیار
Bonum	نیکی ۔ بھلائی	Cynics	کلبی
Categorical Imperative	حکم صریح	Duty	فرض
Ceremonial	رسم ۔ رواج	Charity	سخاوت
Certainty	جزم ۔ یقین	Chastity	عصمت ۔ پاکبازی
Chance	اتفاق ۔ موقعہ	Deontology	اخلاقیات
Choice	پسند	Design	نقشہ
Chrematistics	علم المعیشت	Destiny	مقدر ۔ قسمت
Civility / Courteousness	شائستگی ۔ تمیزداری	Economics	معاشیات
		Eudemonism	لذتیت ۔ لذت پرستی

English	ترجمہ
Faith	ایمان
Feudalism	فوجی جاگیرداری
Freedom	آزادی۔ اختیار۔ حریت۔
Grandeur	عظمت۔ شکوہ
Humanity	مروت۔ انسانیت
Interest	دلچسپی۔ رغبت
Intolerance	عدم تحمل
Irony	طنز
Magnanimity	دریا دلی۔ بلند ہمتی
Merit	رتبہ
Peripatatic	مشائیین
Parsimony	جزرسی۔ کنجوسی
Politics	سیاست
Political	سیاسی
Pragmatism	عمل در معقولات
Progress	ترقی
Prudence	دوراندیشی۔ پیش بینی۔ احتیاط۔
Physiognomy	قیافہ
Quietism	سکوت۔ مراقبہ
Reform	اصلاح
Resolve	تہیہ
Rectitude	دیانتداری
Self Control	ضبط نفس
Self development	ارتقائے نفس
Self Surrender	تسلیم نفس
Selfishness	خودغرضی۔ مطلب پرستی۔ غرض آشنائی
Serfdom	غلامی
Slavery	غلامی
Socialism	اشتراکیت
Society	جماعت۔ سماج
Social	سماجک
State	سلطنت۔ راج
Theology	دینیات
Theological	دینی
Vanity	خودپسندی۔ گھمنڈ۔ انانیت۔ خودی

ضمیمہ نمبر (۲) اصطلاحات منطق

اصطلاح انگریزی	ترجمہ
Abduction Syllogism	قیاس راجع الی الثبوت
Abcissio Infiniti	لگاتار نکاسی۔ طرح سلب
Absurd	نامعقول۔ خلاف عقل
Aeteology	علم العلل۔ فلسفۂ اسباب
A Fortiori	بہ اولیٰ

English	Urdu
Allegory	تمثیل
Antimony	ضد قانونی
Aphorism / Apophthegm	مختصر مثل۔ سوتر
Assent	ایجاب
Assertion	بیان۔ اقرار
Assertory	ایجابی
Attributive terms	حدود توصیفی
Causality / Causation	سببیت
Colligation of facts	اجتماع واقعات
Commensurate terms	حدود وحدانی
Contingent	مشروط
Crucial Instance	آخری مثال
Demonstration	تصریح
Denomination	قسم۔ نام
Designation	معنی۔ مراد
Development	ارتقا۔ تدریج
Dialectical	استخراجی
Empirical	تجربی
Enthymeme	قیاس مختصر
Enumerative judgement	قضیۂ تعدادی
Episyllogism	قیاس ثانوی
Equipollency	مساوات قضایا

English	Urdu
Equivocation	ذو معنین۔ توریہ
Exceptive proposition	قضیۂ استثنائی
Exclusiva	طریقۂ طرح
Exclusive proposition	قضیۂ مخصوصہ
Explicitive judgment	حکم توضیحی
Exponsible proposition	قضیۂ مطلقہ
Exposition	تشریح توضیح
Extension of terms	وسعت حدود
Fallacy of figure of speech	مغالطۂ خطابی
Fundamentum Divisionis	اصول تقسیم / بنائے تقسیم
Identity	یگانگت
Infinite terms	حدود لامتناہی
Instance	مثال
Intension of terms	وسعت حدود
Interaction	معاکست۔ عمل و ردعمل۔
Intermixture of effects	اختلاط اثرات
Measurement	ناپ۔ پیمایش
Methodology	علم تقسیم۔ انقسام

English	اردو
Mixed modes	ضروب مخلوط
Nomanalism	اسم پرستی
Principle of Nota* Notae	اصول صفت موصوف
Paronymous Words	الفاظ مشترک الصوت، تجنیس صوتی
Per se	خود بخود۔ فی نفسہٖ
Per Accidens	اتفاقاً
Plurality of causes	کثرت علل، تعدد اسباب
Prerogative Instance	مثال اول
Relative terms	حدود اضافی
Second intentions	بعد کا ارادہ

English	اردو
Fallacy of Secondum Quid	مغالطۂ اصولی
Self-evident	بیّن۔ بدیہی
Subaltern genus	جنس التحت
Subsumption	شمولِ مقولۂ عامہ
Symbol	علامت۔ نشان
Synthetic Judgement	حکم ترکیبی
Topic	مقولہ
Truth	صدق
Uniformity of nature	یکسانیت۔ قدرت
Verbal propositions	قضایائے لفظی

* اصول صفت موصوف یہ ہے :—

Nota Notae est nota rei ipsius

یعنی جو کسی صفت کی تعریف کرتا ہے وہ اُس شے کی تعریف کرتا ہے جو اُس صفت کی حامل ہے۔

غزل شیخ محمد عبدالعزیز صاحب عزیزؔ ماصل پوری

تصور میں موافق گر مری تقدیر ہوجاتی — جو صورت سامنے آتی تری تصویر ہوجاتی

جو ہے تقدیر دشمن کی، مری تقدیر ہوجاتی — بتِ کافر کے ملنے کی کوئی تدبیر ہوجاتی

نقابِ رُخ سرک جاتا تو لاکھوں خون ہوجاتے — نگاہیں تیر بن جاتیں، ادا شمشیر ہوجاتی

اگر فرہاد میرا نام مذہب عشق میں لیتا — ذرا سی دیر میں تیار جوئے شیر ہوجاتی

عزیزِ خستہ تن نے کل اُنھیں پہلو میں دیکھا تھا
الٰہی آج پوری خواب کی تعبیر ہوجاتی

تلافی مافات

سلسلۂ ماہ گزشتہ

(جناب منشی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی اے، ایل ایل بی - وکیل)

(۸)

دل شکستہ اور اپنی بزدلی کا داغ بدستور اپنے دل پر لیے ہوئے پرویز گھر واپس آیا، ہمایوں کسی مریض کو دیکھنے گیا ہوا تھا، پرویز لائبریری میں پہونچا اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا، سر ہاتھوں سے تھام لیا اور اپنی گزشتہ زندگی پر تنقید کرنے لگا۔ شیریں کا چہرہ برابر اُسکے سامنے تھا، کوشش کی کہ سامنے سے ہٹ جائے مگر کامیاب نہ ہوا، انتہائی اضطراب میں آنکھیں بند کرلیں، سوچنے لگا کہ اگر میں اس چہرے تک پہونچ جاؤں تو اس کا گلا گھونٹ ڈالوں ——— لیکن اس خیال کے ساتھ ہی قوت ارادی نے تمام دوسرے خیالات پر غلبہ حاصل کرلیا، بہ آواز بلند کہنے لگا "میں اپنے اور دوسرے گناہوں میں قتل کا گناہ نہیں شامل کرنا چاہتا" ——— قتل کا گمان گزرتے ہی پرویز کے تخیل کا رخ بدل گیا، دل میں کہنے لگا "میں مرجاؤں گا تو کیا شیریں کا چہرہ اُس وقت بھی میرا پیچھا نہ چھوڑے گا، کیا جب میرا شمار ارواح میں ہوگا، اُس وقت بھی یہ شکل مجھے چین نہ لینے دیگی، اُس وقت بھی یہ سحر آگیں آنکھیں مجھے دیکھتی رہیں گی، زندگی میں تو وہ اور میں جدا نہ ہوسکے کیا موت کے بعد بھی میں اُس سے جدا نہ ہونگا" پرویز کی محویت کا یہ عالم ہوا کہ دوپہر گزری سہ پہر ہوگئی اور اُسے خبر نہیں ہوئی، دن ختم ہوکر شام ہوئی، رات کے آثار نمایاں ہو چلے، کمرے میں تاریکی ہوگئی، مگر وہ یوں ہی بیٹھا رہا، حتیٰ کہ ہمایوں واپس آیا، اُسی نے روشنی کی، کھڑکیاں کھولیں، پھر باپ کے پاس آکر بیٹھ گیا اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر کہنے لگا

"پاپا، میں جانتا ہوں کہ آپ سے زیادہ شریف خیال، حق پرست، اور ایمان دار انسان مشکل سے دنیا میں ہوگا، آپ ہمیشہ وہی کرتے ہیں جو حق ہوتا ہے وہی کہتے ہیں جو صداقت ہوتی ہے، میں آپ کی صبح کی بیہوشی کا سبب خوب جانتا ہوں۔ میں نے آپ سے شیریں کے متعلق سوال کیے، اُن سوالات سے آپ کا ذہن اُس کی عبرتناک داستانِ حیات کی طرف منتقل ہوگیا، اور آپ کو اپنے اور اُسکے زمانۂ طالب علمی کی یاد آگئی، کام آپ ویسے ہی زیادہ کرتے ہیں، دماغ اس کشاکش کو برداشت نہیں کرسکا ——— اب میں آیندہ سے کبھی اُسکا ذکر آپ کے سامنے نہیں کرونگا، البتہ اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ آج میں نے اُسکی صورت دیکھی"

پرویز کرسی پر سے اُچھل پڑا، شیریں کا چہرہ جو
اب مستقلاً اُسکے سامنے رہتا تھا، اُسکے اور قریب
آگیا،

"کیا اُس نے اپنی صورت خود تمھیں دکھائی"
پرویز نے کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا

"جی نہیں، میں نے غلطی سے اُس کی صورت
دیکھ لی، میں آج اُس کے پاس گیا، دروازہ کھلا
ہوا تھا، میں بے تکلف اندر چلا گیا، وہ سو رہی تھی
نقاب اُلٹی ہوئی تھی ـــــ پاپا وہ بہت حسین ہے
اتنی حسین کہ اُس سے بڑھ کر خوبصورت عورت میں نے
کبھی نہیں دیکھی، اُس کا بشرہ مکمل ہے گویا سنگ مرمر
سے تراشا گیا ہے، اُس کی آنکھیں اتنی خوشنما ہیں
کہ وہم و گمان میں بھی اتنی خوشنمائی نہیں آسکتی، البتہ
بال اُس کے بالکل سفید ہیں، لیکن اُنکی سفیدی میں
بھی سیاہی سے زیادہ خوبصورتی ہے مگر باوجود اسکے
وہ نقاب پہنتی ہے"

"پھر تم نے اُس سے اسکا سبب نہیں دریافت
کیا" پرویز نے کہا

"ہاں میں نے دریافت کیا اور اُسنے تفصیل سے سب
باتیں مجھے بتلائیں ـــــ میں نے اُس کی خوشامد کی
اُس سے التجا کی کہ وہ مجھے اُس شخص کا پتہ بتادے
جو اسکی تباہ حالی کا ذمہ دار ہے لیکن اُس نے
نہیں بتایا"

پرویز کے دل کی حرکت تیز ہوگئی، خون دماغ کی
طرف منتقل ہونے لگا، ہمایوں کی گفتگو کے دوران میں
اُس کی حالت اُس شخص کے مانند تھی جس کے سر پر ایک
برہنہ دو دھاری تلوار لٹک رہی ہو جس کا گرنا بھی
بدیہی اور لازمی ہو، وہ خواہ کسی رخ سے گرے زخمی
ضرور کرے گی، ـــــ "اُس نے مجھے اپنے چہرے کے نہ جلنے
کی وجہ بھی سمجھائی کہ جس وقت دھماکا ہوا اُس نے
فطرتاً اپنا بازو چہرے پر رکھ لیا، جس سے چہرہ جلنے سے
بچ گیا، مگر شانے اور ہاتھ پر بہت زخم آئے ـــــ صحت
پانے پر جب اُسے اس کا علم ہوا کہ اُس کا منگیتر ایک
غلط فہمی میں مبتلا ہو کر مفقود الخبر ہوگیا ہے تو اُسے بہت
صدمہ ہوا، اُس پر طرہ ماں کی موت اور بےکسی اِس
ہجوم غم نے اُس کے بال سفید کر دیے ـــــ میں نے
دوبارہ اُس سے التجا کی کہ وہ مجھے اپنے منگیتر کا نام و
نشان بتادے مگر اُس نے صرف اتنا کہا کہ وہ اب
بھی بقید حیات ہے اور خوش و خرم، اور اُس کو اپنی
حیوانیت اور بزدلی کی کوئی سزا نہیں ملی ہے ـــ پاپا،
انسان کا فرض ہے اور انسانیت اس کی متقاضی ہے
کہ اُس شخص کو سزا دی جائے، مجھے اگر وہ شخص کسی
طرح مل جائے تو میں اپنے ہاتھ سے اُس کی
دھجیاں اُڑا دوں"

پرویز کیا، ہر ذی روح کے لیے برداشت کی
ایک انتہا ہوتی ہے، خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ شخص
اپنے جرم کی سنگینی سے واقف ہو کوئی بھی بیٹے کی
زبان سے ایسے الفاظ نہیں سُن سکتا ـــــ لڑکھڑاتا
ہوا وہ کرسی سے اُٹھا، دفعتاً شیریں کا چہرہ اُسکے سامنے
سے غائب ہوگیا، ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا وہ ہمایوں

کے پاس پہونچا اور بآوازِ بلند کہا

"ہمایوں اُٹھو، وہ کمبخت تمھارے سامنے موجود ہے، اُٹھو اور اُس کی دھجیاں اُڑا دو"

پرویز کو بولتے دیکھ کر ہمایوں کھڑا ہو گیا، ایک لمحے تک وہ بالکل خاموش رہا، اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جو کچھ پرویز کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے، لیکن رفتہ رفتہ اُسے خیال ہوا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ یقیناً درست ہے، اُسے تعجب ہوا کہ وہ اب تک اس راز کی تہ کو کیوں نہیں پہونچا تھا۔

"پاپا، پاپا" اُس نے روتے ہوئے کہا "نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا"

پرویز نے ہمایوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں، شیریں کا چہرہ اب اُسکے سامنے نہیں تھا لیکن اب اُس سے زیادہ تکلیف دینے والی شے تھی، بغور اُس نے ہمایوں کے چہرے کو دیکھا — بے اعتباری، تعجب، اور خوف نے رفتہ رفتہ یقین کے جذبے کو جگہ دی، اسکے بعد نفرت کا اظہار ہوا، اور نفرت بھی اتنی مکمل اور عمیق جسکا کوئی مرافعہ نہیں — اپنی تمام روح کی گہرائیوں کے ساتھ ہمایوں پرویز سے نفرت کرنے لگا اور پرویز کو اس کا علم ہو گیا

"پاپا، پاپا" ہمایوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "خدا کیلئے مجھ سے کہدیجیے کہ یہ سچ نہیں ہے، صرف یہ لفظ کہہ دیجیے "اور میں یقین کروں گا"

پرویز کا سر نیچا ہو گیا، اُس کی آنکھیں جھک گئیں، چہرے پر سرد پسینہ آگیا، اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھائے کہ ہمایوں کو چھوئے، ہمایوں پیچھے ہٹ گیا اس طرح گویا کسی زہریلے ناگ کی دسترس سے باہر ہونے کی کوشش کر رہا ہے، پرویز نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا — ہمایوں کی ٹانگیں جواب دینے لگیں، کرسی کا سہارا لیکر بیٹھ گیا، غم اور غصے سے اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں

"پاپا، پاپا" اُس نے چپکے سے کہا "پاپا، پاپا"

کمرے کے باہر پرویز شرابیوں کی طرح جھومتا ہوا زینے پر چڑھ رہا تھا، آگے آگے اُسکے شیریں کی تصویر بھی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی، اُسے خیال آیا کہ اُسنے ایک بار ایک مریض سے کہا تھا کہ "انسانی تکالیف کی ایک حد ہوتی ہے جسکے آگے نہ وہ جا سکتی ہیں اور لے جائی جا سکتی ہیں" اس وقت اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا یہ خیال غلط تھا، ہمایوں سے اُسے بیحد محبت تھی، اُس کی نفرت نے اس کا دل توڑ دیا، وہ جسمانی ہر قسم کی اذیت برداشت کرنے کو تیار تھا، مگر ہمایوں کی جانب سے نفرت کا اظہار، اُسکی روح کے لیے تکلیف دہ تھا — شیریں کی تصویر اب بھی آگے آگے چل رہی تھی، اُسے خود حیرت تھی مگر اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُسکے لیے شیریں پھر وہی شیریں ہو گئی تھی جو پچیس برس پہلے تھی — اب تک پرویز نے کبھی موت کی خواہش نہیں کی تھی، اُسکے نزدیک موت ایک محض فضول چیز تھی، جس طرح بغیر کسی سبب کے کسی چلتی ہوئی گھڑی کو روک دیا جائے۔ لیکن وہ اسوقت

خود موت کی آرزو کر رہا تھا، اب اُسکے نزدیک موت بہت دلچسپ چیز تھی تمام تکلیفوں کی خاتم، تمام صدموں کا علاج، اُسے خیال آیا کہ اگر وہ مرجائے تو پھر ہمایوں اُسے کراہت اور نفرت کی نظر سے نہیں دیکھے گا نہ شیریں کا چہرہ اُس کے سامنے رہ کر اُس کے دل پر چرکے دیگا۔ یکایک اُس کی ذہنیت میں ایک عظیم تبدیلی ہوئی، اُس نے سوچا کہ "وہ عورت جس سے مجھے محبت ہے میرے سامنے موجود ہے، وہ لڑکا جس کو میں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں نیچے موجود ہے اور ہر طرح کے آرام و آسائش اُسے مہیا ہیں، اس سے زیادہ اور کیا انسان مانگ سکتا ہے" یہ سوچ کر وہ مسکرایا اور جواب میں شیریں کا چہرہ بھی مسکراتا ہوا نظر آیا، خوابگاہ میں پہونچکر ایک زہر قاتل کی شیشی اُس نے لی، تھوڑا سا زہر ایک گلاس پانی میں گھولا اور کہا

"شیریں میں تمھیں گواہ کرتا ہوں اس بات کا کہ میں اپنے اعمال بد اور اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں اور اُس منصف کے سامنے جا رہا ہوں جو بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے مقدمے کا فیصلہ نہایت منصف مزاجی سے کرتا ہے، سب سے بڑا منصف حقیقی ہے اور سب سے بڑا ارحم الراحمین"

پرویز کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ لاجواب آنکھیں آنسو سے ڈبڈبا آئیں گو وہ سُرخ سُرخ لب مسکراتے ہی رہے، اُس نے زہر پی لیا، کمرے میں روشنی نہیں تھی، وہ لیٹ گیا

"شیریں" اُس نے پکارا "شیریں آؤ، اور میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دو"

"شیریں کی تصویر آگے بڑھی اور اُسکی پٹی کے پاس دو زانو بیٹھ گئی، پرویز نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا لیکن نہ لے سکا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا سر جھک رہا ہے اُس جگہ کی طرف جو ہر مرد کی پہلی اور آخری آرامگاہ ہے ——— عورت کا سینہ ——— اور تھوڑی دیر میں پرویز مر گیا۔

(۹)

ہمایوں کو شب بھر نیند نہیں آئی، غم و اندوہ کرب بےچینی نے اُس کا یہ حال کیا کہ ایک منٹ کو پلک نہیں جھپکی، گناہ باپ سے سرزد ہوا تھا اور بار بیٹے کے کندھے محسوس کر رہے تھے، لیکن چارہ کوئی نہیں تھا، جو شخص مجرم تھا وہ اُس کا باپ تھا اور اُس کی رسائی سے باہر، اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ صبح ہوتے ہی باپ سے علیحدہ رہنے کی تدبیر کریگا، اسکا ارادہ تھا کہ دُنیا کو اس کا علم نہ ہونے پائے کہ باپ بیٹوں کے تعلقات میں پیشتر کی بہ نسبت کسی قسم کا فرق ہے مگر اپنی جگہ پر وہ اُس سے انتہائی نفرت کرنے لگا تھا، اُسے یقین تھا کہ پرویز کی زندگی اب تو یہ نفرت یقیناً باقی رہیگی ——— دل ہی دل میں وہ اس کا تہیہ کر رہا تھا کہ اس نفرت کا علم وہ کسی کو نہ ہونے دیگا حتیٰ کہ پرویز کو بھی، اُسے کیا معلوم تھا کہ رات ہی کو پرویز کو اس کا احساس ہو گیا تھا کہ اُسکا بیٹا جو اسکا گوشت پوست ہے اُس سے کھبا گتا اور اُس سے نفرت کرتا ہے۔ اب ہمایوں کی سمجھ میں آیا کہ شیریں نے

اُسے اپنے منگیتر کا نام اور پتہ بتانے سے کیوں انکار کیا تھا؛ اور اس علم سے اُس کی قدر و منزلت اُس کے دل میں زیادہ ہو گئی، صبح کو مقررہ وقت پر وہ لائبریری میں آیا اور یہ دیکھ کر کہ پرویز ابھی نہیں نیچے اُترا اُسنے اخبار اُٹھا لیا اور اُسے دیکھنے لگا، بظاہر نظریں اخبار پر تھیں لیکن دل و دماغ کہیں اور تھے، نوکرنے ناشتہ لا کر رکھدیا اور چلا گیا، ہمایوں کو انتظار کرتے کرتے نو بج گئے اور پرویز نہیں آیا، نوکرنے ڈرتے ڈرتے ہمایوں سے کہا

"میاں، آج ڈاکٹر صاحب ابھی تک نہیں اُترے"

"ہاں شاید وہ شب میں دیر کو سوئے، اب آتے ہی ہوں گے"

"مگر میاں اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا، آپ جا کر دیکھ آئے، ممکن ہے اُن کی طبیعت کچھ خراب ہو"

طوعاً و کرہاً ہمایوں اوپر گیا، جب دروازے دھب دھبانے سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ اندر داخل ہوا، پرویز بستر پر لیٹا ہوا تھا، پورے لباس میں، چہرے پر سکون و راحت کا تبسم تھا، ہمایوں قریب گیا، باپ کا شانہ ہلایا، پھر نبض دیکھی، دل دیکھا، کہیں کوئی اثر نہیں تھی، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے پرویز کی بند آنکھوں کے پپوٹے دیکھے اور اُنھیں دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گیا، ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو گلاس پر پڑی، لے اُٹھا کر سونگھا، حمام میں جا کر اُسے خوب دھویا اور الگ رکھ دیا، خود نیچے اُتر کر نوکروں کو اطلاع دی اور

میز پر سر رکھ کر بیٹھ گیا —— اس کا ابتدائی جذبہ اطمینان اور سکون کا تھا، اُس نے محسوس کیا کہ پرویز نے مناسب ترین طریقہ اختیار کیا، خود نجات پانے کا اور ہمایوں کو نجات دینے کا —— دل ہی دل میں اُس نے پرویز کی قدر کی اور اُس کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے اُسے قعر مذلت سے بچا لیا —— لیکن رفتہ رفتہ اُسے خیال پیدا ہوا کہ موت سے باپ مر گیا مگر داغ رسوائی نہیں مٹا، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تکلیف جو اُسے باپ کو زندہ دیکھ کر ہوتی وہ اب نہ ہوگی لیکن کیا بزدلی اور بے غیرتی کی یاد کو بھی وہ بُھلا سکے گا، اس جذبے کے بعد اُسے اُس محبت کا احساس ہوا جو پرویز کو اُس سے تھی اور اس خیال کے ساتھ ہی آنسوؤں کا دروازہ جو اب تک بند تھا کھل گیا، اور وہ رونے لگا، جب کچھ دل ہلکا ہوا تو اُسے اس کا اوراک ہوا کہ وہ اس وقت دنیا میں یکہ و تنہا ہے، جہانگیر کسی قانونی غرض سے باہر گیا ہوا تھا، اور کوئی ایسا تھا نہیں جو اُس کی مدد کرے یا اُس سے ہمدردی کی باتیں کرے، مثلاً اُسے خیال آیا کہ شیریں سے بڑھ کر کون پرویز کا [illegible] ہو سکتا ہے [illegible] وہ اُٹھا اور [illegible] شیریں [illegible] جو [illegible] وقت تھا، شیریں باغ [illegible] ہمایوں نے [illegible] آواز [illegible] کہا

"میرے باپ کا انتقال ہو گیا [illegible] کا ذریعہ وہ خود تھے"

شیریں [illegible] چوک [illegible]

"مجھے سخت رنج ہے اور تمہارے ساتھ ہمدردی ہے"

"آپ کو رنج ہونے اور ہمدردی کرنے کی کوئی وجہ نہیں، یہ فرض تو میرے باپ کا تھا اور اب میرا ہے"

شیریں پھر چونک پڑی، اُس نے سمجھ لیا کہ معلوم ہوتا ہے پرویز نے موت سے پیشتر سب حال ہمایوں کو بتا دیا

"میں اس لیے آیا ہوں" ہمایوں نے خفیف سی خاموشی اور ہچکچاہٹ کے بعد کہا "کہ آپ سے درخواست کروں کہ میرے مرے ہوئے باپ کو معاف کر دیجیے"

"لیکن اُنھوں نے خود کبھی معافی کی خواہش نہیں کی" شیریں نے تھوڑی سی خاموشی کے بعد جواب دیا

"میں جانتا ہوں، لیکن میں تو آپ سے اسکی خواہش کر رہا ہوں، پرویز نہیں تو پرویز کا لڑکا آپ سے اس کی التجا کرتا ہے کہ اپنی گزشتہ محبت کے صدقے میں پرویز کو معاف کر دیجیے، اور اُسے اپنے خالق کے حضور میں گنہگار نہ جانے دیجیے"

"لیکن اُنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی اسکی خواہش نہیں کی" شیریں نے پھر ذرا درشتگی سے جواب دیا۔

"اسی لیے تو اُنھیں معاف کرنے کی اور زیادہ ضرورت ہے، علاوہ بریں اسی پر میری زندگی کا دارومدار ہے، آپ یقین کیجیے کہ جب تک آپ اُنھیں معاف نہیں کریں گی میں کسی ایک ذی روح سے بھی آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکوں گا —

آئیے آئیے میرے ہمراہ چلیے، میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں آپ سے چاہتا ہوں اُس کا کرنا آپ پر بہت گراں ہے، لیکن میری خاطر اُنھیں معاف کر دیجیے، آپ سوچیے اگر اُن سے یہ گناہ سرزد نہ ہوا ہوتا تو آج آپ میری ماں ہوتیں، اسی لیے میں نے خود بھی اُنھیں ابھی تک معاف نہیں کیا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھے بھی معاف کرنا ہوگا اور آپ کو بھی" —

یہ کہکر ہمایوں نے شیریں کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے آیا پرویز کی نعش ابھی تک اُس کی خواب گاہ میں تھی ہمایوں شیریں کو سیدھا وہیں لے گیا، شام ہو چکی تھی، ہمایوں نے روشنی کی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا،

"یہ اُن کی نعش ہے، خود تو وہ چلے گئے مگر میرے لیے ذلت اور بے غیرتی کی گٹھری چھوڑ گئے، للہ اُنھیں معاف کر دیجیے، خدا کے واسطے اُنھیں معاف کر دیجیے"

شیریں نے آہ سرد بھری، وہ پرویز کے بالکل قریب کھڑی تھی، اتنی قریب کہ اسکا دامن پرویز کے جسم سے مس ہو رہا تھا، لیکن اب اُس کے دل میں پرویز کی جانب سے کوئی خطرہ تھا نہ کوئی عناد، پرویز اب وہی پرویز تھا جس سے کسی زمانے میں اُسے عشق تھا، جسکے آغوش میں بیٹھی وہ گھنٹوں باغوں اور چاندنی راتوں کی بہار دیکھتی رہتی تھی، جسکے گلے میں بانھیں ڈال کر وہ سیکڑوں خواہشیں کیا کرتی تھی، اُس وقت اُسے محسوس

ہوا کہ موت سب مرضوں کی دوا ہے' ——— سب
معموں کا حل' ——— ہمایوں آہستہ سے باہر نکل آیا
اور شیریں اور پرویز پھر ایک بار ایک دوسرے کے
ساتھ تنہا رہ گئے' شیریں نے نقاب اُلٹ دی،
روشنی پرویز کے چہرے پر پڑ رہی تھی، ایک ایک سطر
خوب روشن اور عیاں تھی' موت پرویز کے لیے بہت
مہربان ثابت ہوئی تھی' آنکھیں بند تھیں' دہانے کے
دونوں جانب وہ لکیریں جو ظلم اور خود غرضی کی نشانی
تھیں محو ہو گئی تھیں' چہرے کی سختی نرمی اور سکون
میں بدل گئی تھی' لبوں پر وہی دلکش مسکراہٹ تھی جو
شیریں نے پچیس برس پہلے اپنے ایام محبت میں بارہا
دیکھی تھی' اب پرویز پھر ایک بار وہی پرویز تھا جو
شیریں کے ساتھ اُسی جماعت میں تعلیم پاتا تھا جسکے ساتھ
وہی دار التجربہ میں کام کیا کرتی تھی ——— شیریں نے
پھر بغور پرویز کے چہرے کو دیکھا' معاً اُسکے ذہن میں
خیال آیا کہ "جن سے ہمیں محبت ہوتی ہے اُنھیں پر
ہم ظلم زیادہ کرتے ہیں" ——— "اے خدا' اے یزداں"
اُس نے باواز بلند کہا "میری مدد کر' مجھے استقلال دے'
مجھ کو ظرف عطا کر کہ میں اُسے معاف کر سکوں"
دفعتاً اُسے جہانگیر کے الفاظ یاد آئے ——— "خدا
ہم پر مصیبت ڈالتا ہے کہ ہم دوسروں کی مصیبت کا
احساس کر سکیں' اور دوسروں کی مصیبت و غم
میں شریک ہو کر اُنکی ہمدردی کر سکیں"
پھر اُس نے پرویز کے چہرے کی طرف دیکھا' اور اب
اُسے علم ہوا کہ پرویز کے چہرے میں بہ نسبت گزشتہ دن
کے جب وہ اُس سے ملنے گیا تھا بہت تغیر ہو گیا ہے
اُسے خیال آیا کہ یقیناً ان چوبیس گھنٹوں میں اُسے
اپنے افعال گذشتہ پر بہت شدید پشیمانی ہوئی
"اے میرے مالک" اُس نے دونوں ہاتھ
جوڑ کر' پرویز کی پٹی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر
کہا "مدد کر میری مجھے معاف کرنے میں" ———
یکایک اُس کے دل میں رحم کی لہریں موجزن ہوئیں'
جھک کر اُس نے پرویز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں
لے لیا اور پرویز کے مردہ چہرے پر آنسوؤں کی
بارش ہونے لگی ◆

(۱۰)

شیریں باہر نکلی تو رات زیادہ ہو چکی تھی اُس نے
جہانگیر کو ہمایوں کے پاس بیٹھے پایا' وہ بھی وہیں
جا کر بیٹھ گئی' اُس کے قلب کو ایک عجیب سکون
حاصل تھا' اُس کے سینے میں ایک انوکھی راحت
تھی جیسے اُس کی تمام تکالیف' اُسکے تمام مصائب
کا خاتمہ ہو گیا' جہانگیر ہمایوں کو سمجھا رہا تھا'
"ہمایوں' زندگی کے لیے موت ضروری ہے اور
لازمی' ہم کو اس کا علم نہیں کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے'
لیکن یہ ایک پردہ ہے جو ہمیشہ انسانی آنکھوں کے
سامنے پڑا رہتا ہے اور صرف چند لمحوں کے لیے موت
کے وقت اُٹھتا ہے' ——— زندگی ایک قوس قزح
ہے جو دو عظیم خاموشیوں' دو بڑے سکوتوں کو ملاتی ہے'
آفرینش سے پہلے کی خاموشی اور موت کے بعد کا
سکوت ——— یہ ایک سیڑھی ہے دونوں کے درمیان'

اور اس لیے انسان کا اختتام، اُسکے آغاز سے زیادہ تعجب انگیز نہیں، — وہ خدا جس نے زندگی میں ہمارا خیال رکھا کیا وہی خدا مرنے کے بعد ہماری خبر نہیں لے سکتا — تمھارے باپ میرے حقیقی بھائی تھے، اور ایک ایسے بھائی جن کی مثال مشکل سے ملیگی، اُن کا ورقِ حیات پاک وصاف ہے اور بے داغ، ایک دھبہ بھی بزدلی یا بیغیرتی کا اُس پر نہیں" — اس موقعہ پر ہمایوں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھُپا لیا مگر شیریں اُسی طرح بیٹھی رہی — "وہ بہادر تھے" جہانگیر نے سلسلہ جاری رکھتے ہوے کہا "زندگی کے میدان جنگ کے ایک نڈر اور دلیر سپاہی، جو دشمن سامنے آیا، جس غنیم نے حملہ کیا، اُنھوں نے مردانہ وار اُس کا مقابلہ کیا — بزدلی کے نام سے وہ آشنا نہ تھے، ہر فرض کو اُنھوں نے مردانگی سے مردوں کی طرح انجام دیا، اُن کے پہلو میں عالی ظرف دل تھا — یہ دنیا جنت ہو جائے اگر ان کے سے دو چار آدمی اور دنیا میں ہوں، اُنکی مثال سے ہمکو سبق لینا چاہیے — ہمایوں تم خود اندازہ کرسکتے ہو کہ مجکو اُنکی موت کا کتنا صدمہ ہے، لیکن جب تک ہم کو خود رنجوں سے سابقہ نہیں پڑتا ہم دوسروں کے رنجوں کو محسوس نہیں کرسکتے، اپنی کمزوریاں دیکھ کر ہم کو اندازہ ہوتا ہی کہ دوسروں کے عیوب کو کس طرح پوشیدہ کرنا چاہیے — آج وہ ایک سکوت عظیم میں سونے جا رہے ہیں، اور وہاں اُسوقت تک سوتے رہیں گے جب تک قیامت نہ آئے اور خدا خود اپنے طلسم نہاں کو نہ توڑے"

جہانگیر کی آواز بھرا گئی، سلسلہ ٹوٹ گیا، اور ناتمام غم میں وہ اُٹھ کر باہر چلا گیا —

ہمایوں نے شیریں سے پوچھا "آپنے اُنھیں معاف کردیا" شیریں نے مُنہ سے جواب نہیں دیا، اثبات میں سر ہلا دیا، اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اماں" ہمایوں نے کہا — ایک معصوم مگر مصیبت زدہ بچے کی طرح وہ اُٹھا، اور شیریں کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا ؛

غزل میاں عبدالعزیز صاحب فطرت (راولپنڈی)

نشیمن ہو گیا برباد میرا | بحمد اللہ دل ہے شاد میرا
جلایا آشیاں برق نظر سے | کرے گا اور کیا صیاد میرا
بجھی ہیں داغہاے دل کی شمعیں | ہوا ظلمت کدہ آباد میرا
یہ غم خانہ۔ یہ دل۔ یہ حسرت آباد | یہ ہے کاشانۂ برباد میرا
کہاں سے آ رہی ہے غم کی آواز | کہیں ہوگا دلِ ناشاد میرا

سلطان صلاح الدین اور عقلمند ناتھن

ایک ایکٹ کا ڈراما

از مشہور جرمن ڈراما نویس لسنگ

(جناب پروفیسر سید علی عباس حسینی صاحب ایم اے)

[گاٹ ہولڈ ابراہیم لسنگ جرمن شاعر اور ڈراما نویس سیلیشیا میں ۲۲ جنوری ۱۷۲۹ء کو پیدا ہوا اور برنزوک کے مقام پر ۱۵ فروری ۱۷۸۱ء کو اس نے انتقال کیا۔ اس نے ابتدا میں مذہبی تعلیم پائی تھی لیکن وہ فطری طور پر صحافت اور نقد کی طرف مائل تھا۔ ۱۷۵۵ء کے بعد لسنگ نے ڈراما نویسی شروع کی اور اسقدر مقبولیت اور شہرت حاصل کی کہ وہ ۱۷۶۷ء میں ہمبرگ تھیٹر کا ڈائرکٹر مقرر کر دیا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ والفن ٹیل کے کتب خانہ کا لائبریرین بھی ہو گیا۔ اور ان دونوں فرائض کو اپنی آخر زندگی تک بہت ہی کامیابی سے ادا کرتا رہا۔

اس کی تصانیف سے "مس سارا سمپسن" "منا واں بارن ہلم" ایمیلیا گیلوٹی اور ناتھن دی وائز زیادہ مشہور ہیں۔ ذیل کا ٹکڑا اُسکے ڈراما "عقلمند ناتھن" سے لیا گیا ہے۔ لسنگ نے اس حصے میں بہت ہی عمدہ پیرائے میں اُن اختلافات کو ظاہر کیا ہے جو مختلف مذہبوں کے پیرووں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اس نے اس امر پر زور دیا ہے کہ عیسائی ہوں یا مسلمان، یہودی ہوں یا ہندو، سب کے سب مذہب کی اصلی غرض و غایت، یعنی خدمت، اخوت و محبت کو یکلخت بھول بیٹھے ہیں۔ وہ جنت کو اپنا مخصوص حق سمجھتے ہیں لیکن اُس کے حصول کے لیے جو فرائض ضروری ہیں اُن سے کیسر غافل ہیں۔ حالانکہ وہی مذہب سچا ہو سکتا ہے جسکے ماننے والے خلق اللہ کے سب سے بڑے خادم ہوں اور جسکے متبعین سب سے زیادہ نیکی اور محبت کے کام انجام دیں۔

لسنگ نے شاید اسی اختلافات و افتراق کے مٹانے کے لیے صلاح الدین کی بہن کا نام سیتا رکھا ہے جو ظاہر ہے کہ موجودہ رواج کے لحاظ سے بالکل غیر اسلامی ہے۔ اس مختصر سے سین میں اس مذہبی بحث کے علاوہ جس خوبی سے مختلف دیگر حقائق پر چند جملوں میں روشنی ڈالی گئی ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ ذیل کا ترجمہ سرسری مطالعہ کی غرض سے نہیں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ غور سے پڑھنے اور غور کرنے کے لیے۔]

سین :-
سلطان صلاح الدین کا محل، دربار کا ہال کمرہ

افراد :-

صلاح الدین ——— سلطان
سیتا ——— صلاح الدین کی بہن
نیتھن ——— یہودی

صلاح الدین (احکام دیتے ہوے) جیسے ہی وہ یہودی آئے اُسے یہاں لے آنا .... بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے مابدولت کے حکم کی تعمیل میں عجلت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی!

سیتا :- نہیں بھائی صاحب۔ شاید وہ گھر پر موجود نہ رہا ہوگا۔

صلاح الدین - ممکن ہے!

سیتا - آپ کے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ کوئی جنگ کرنے والے ہیں؟

صلاح الدین - ہاں! .... اور ایسے اسلحوں سے جنکے استعمال سے میں بالکل بےخبر ہوں۔ کیوں جی سیتا، کیا مجھے جھوٹی بات بنانا، اور دھوکا دیناہی پڑے گا؟ مجھ سے اور ان باتوں سے کیا مطلب!... اور یہ کس لیے؟ روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے، روپیہ! اور وہ بھی ایک یہودی سے! صلاح الدینؒ اور اس طرح کا جھوٹ، اس قماش کی ذلیل حرکتیں! دُنیا کی سب سے زیادہ ذلیل چیز کے لیے!

سیتا - ہاں، لیکن دُنیا کی یہی حقیر چیزیں بہت زیادہ نفرت کیے جانے پر، بدلا لینے کے لیے بہلنے ڈھونڈھنے لگتی ہیں۔

صلاح الدین - یہ سچ ہے .... لیکن اگر یہ یہودی جیسا کہ وہ درویش کہتا تھا، سچا اور ایماندار ثابت ہوا تو؟

سیتا - تو پھر آپ کی مشکلات کا خاتمہ ہے! اس لیے کہ جال ایک لالچی اور جھوٹے یہودی کے لیے بچھایا جاتا ہے نہ کہ ایک راستباز شخص کے لیے! وہ تو بغیر کسی چال کے ہمارا ہے۔ مجھے تو ایسے آدمی کی گفتگو سُن کر بڑی خوشی ہوگی۔ ذرا دیکھوں تو وہ کتنی صفائی اور آسانی سے ہمارے جال کو پھاڑ ڈالتا ہے اور کن تدبیروں سے ان گتھیوں کو ایک ایک کرکے سلجھا دیتا ہے۔

صلاح الدین - سیتا، تم سچ کہتی ہو۔ مجھے بھی اس مشاہدے میں بڑا لطف آئے گا۔

سیتا - تو پھر آپ کیوں پریشان ہیں۔ اگر وہ اپنے تمام ہم قوموں کی طرح ایک مکار اور عیار یہودی ہے تو آپ اس کی سلطنتاً پروا نہ کرنی چاہیے کہ وہ آپ کو بھی اسی نظر سے دیکھے گا جس سے وہ سارے عالم کو دیکھتا ہے۔ بلکہ اگر ایسی صورت میں آپ کے چہرے سے غیر معمولی

جذبات ظاہر ہونگے تو آپ کو وہ صرف بے وقوف ہی نہ سمجھے گا بلکہ بے وقوف بنائے گا بھی !

صلاح الدین - تو میں محض اس لیے ایک بُرا فعل کروں کہ بُرے آدمی مجھے بے وقوف نہ سمجھیں ؟

سیتا - ہاں بھائی جان، اگر آپ کسی شے سے اُس کا صحیح مصرف لینا بُرا فعل سمجھتے ہیں، تو ایسا ہی ہے !

صلاح الدین - سچ ہے، عورت کے ذہن میں جو تدبیر آئیگی وہ اسکے لیے ہزار بہانے اور ہزار نام تجویز کرلیگی !

سیتا - بہانے ؟

صلاح الدین - بہن مجھے ڈر ہے کہ یہ تمھاری نازک حرفتیں میرے سخت ہاتھوں میں پاش پاش ہو جائینگی - ایسی تدبیروں کا کامیاب بنانا اُنھیں لوگوں کا کام ہے جو انھیں سوچ سکتے ہیں - عمل، موجد کی سکبدستی کا محتاج ہے ! .... خیر ان باتوں کو جانے دو - جیسا بھی مجھ سے بُرا بھلا ہوگا میں اس کام کو انجام دونگا - لیکن دل یہی چاہتا ہے کہ انجام بخیر نہ ہو !

سیتا - بھائی جان ذرا ہمت سے کام لیجیے اگر آپ حتمی طور پر ارادہ کرلیں گے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ کام ہو کے رہیگا - یہ عجیب بات ہے کہ آپ جیسے مرد ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ اُنکی ساری ترقیاں اُن کی تلواروں ہی کی مرہون منت ہیں - حالانکہ جب شیر لومڑی کے ساتھ شکار کھیلتا ہے تو وہ اُسکی رفاقت کو ذلیل وحقیر سمجھنے کے باوجود اُسکی چالوں کی قدر کرتا ہے -

صلاح الدین - اچھا یوں ہی سہی ! لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ عورتیں ہمیشہ مردوں کو اپنی ہی سطح پر کھینچ لاتی ہیں ! اچھا بہن سیتا اب تم یہاں سے چلی جاؤ، مجھے اپنا سبق اچھی طرح یاد ہو گیا ہے !

سیتا - کیا میں یہاں سے چلی جاؤں ؟

صلاح الدین - تو کیا تمھارا ارادہ یہاں موجود رہنے کا تھا ؟

سیتا - نہیں آپ کے پاس نہیں، بلکہ اس بغل والے کمرے میں،

صلاح الدین - کیا ! ہماری باتیں سننے کے لیے ؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ! اگر مجھے کامیاب دیکھنا ہے تو یہاں سے جلدی چلی جاؤ ! دیکھو وہ پردہ ہلتا ہے - یہودی آگیا، خبردار یہاں نہ ٹھہرنا ! جاؤ، میں دیکھتا رہوں گا !

(سیتا ایک دروازے سے جاتی ہے - نیتقن دوسرے دروازے سے داخل ہوتا ہے - صلاح الدین تخت پر بیٹھ جاتا ہے)

صلاح الدین - یہودی، قریب آ، اور قریب ! .... بالکل میرے قریب - ڈر دل سے نکال ڈال !

نیتقن - ڈر، ظل اللہ ! ڈر تو جہاں پناہ کے دشمنوں کے دل میں ہو سکتا ہے -

صلاح الدین - تمھارا نام نیتقن ہے ؟

نیتقن - ظل اللہ !

صلاح الدین - عقلمند نیتقن ؟

نیتقن - نہیں جہاں پناہ !

صلاح الدین - لیکن لوگ تو تمھیں یہی کہتے ہیں،

نیتقن - ہاں، لیکن عوام !

صلاح الدین - میں تو عوام کی آواز کو حقیر نہیں سمجھتا! میں بہت دنوں سے اُس شخص کی ملاقات کا مشتاق ہوں جسے لوگوں نے عقلمند کا خطاب دے رکھا ہے۔

نیتھن - لیکن جہاں پناہ اگر لوگوں نے یہ خطاب طنز سے دیا ہو؟ اگر عقلمند کے معنی دُور بیں کے ہوں اور اس سے مراد یہ ہو کہ میں اپنا مطلب نکالنا خوب جانتا ہوں، تو؟

صلاح الدین - مطلب سے تمہارا منشا مقصد و غایت حقیقی سے ہے؟

نیتھن - تو جہاں پناہ، خود غرض سب سے زیادہ دُور بیں ثابت ہوگا اور عقلمند اور دور بیں کے ایک ہی معنی ہونگے۔

صلاح الدین - تمہاری یہی گفتگو جو کچھ تم اپنے کو ثابت کرنا چاہتے ہو اُسکے بالکل ضد تمہیں ثابت کر رہی ہے۔ تم انسان کا صحیح مقصد جانتے ہو، عوام نہ تو اسے جانتے ہیں اور نہ اُنھوں نے اسکے جاننے کی کوشش کی۔ صرف یہی امر آدمی کو عقلمند بناتا ہے!

نیتھن - لیکن ظل اللہ، ہر شخص اپنے کو عقلمند سمجھتا ہے!

صلاح الدین - بس انکسار ختم کرو! جب ہم حقیقت کی تلاش میں ہوں تو اس طرح کا انکسار ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اس لیے اب کام کی بات کرو اور صاف و بے تکلف گفتگو!

نیتھن - جہاں پناہ، میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں، اور یہ ثابت کر دوں گا کہ میں ظل اللہ کی عنایات کا مستحق ہوں۔

صلاح الدین - تم میری کیونکر خدمت کرو گے؟

نیتھن - میرے پاس جو کچھ مال ہے اُسکا بہترین حصہ سستے داموں پر حاضر ہے۔

صلاح الدین - کیا کہا مال؟ تمہارا مال؟ یہ سودا تو میری بہن کر سکتی ہے (دل میں۔ سُن کے خوش تو ہو گئی ہوگی!) - خود مجھے خرید و فروخت میں کوئی درخور نہیں۔ میں اصول تجارت سے بالکل ناواقف ہوں۔

نیتھن - تو کیا جہاں پناہ مجھ سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ میں نے اپنے سفر کے دوران میں دشمن کی فوجی حرکت کا مطالعہ کیا ہے اور اب وہ کدھر بڑھنے والا ہے؟ اگر ایسا ہے تو.......

صلاح الدین - یہ بھی میری غرض نہیں۔ مجھے دشمن کی نقل و حرکت کے بارے میں کافی اطلاع ہے.... تم میری بات سنو!

نیتھن - ظل اللہ میں ہمہ تن گوش ہوں!

صلاح الدین - جس چیز کے متعلق میں تم سے دریافت کرنا چاہتا ہوں وہ ان باتوں سے بالکل ہی مختلف ہے۔ چونکہ لوگ تمہیں عقلمند کہتے ہیں اس لیے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کون سے مذہب و ملت کو بہتر سمجھتے ہو؟

نیتھن - جہاں پناہ، میں یہودی ہوں۔

صلاح الدین - اور میں مسلمان ہوں! عیسائی ہم دونوں کے درمیان ہیں۔ اس طرح تین مذہب ہوئے۔ اور ان میں سے ایک ہی سچا ہو سکتا ہے۔ تمہارا جیسا آدمی کسی مذہب پر اس لیے قائم نہیں رہ سکتا کہ اتفاقاً

اسکی پیدائش اسی ملت میں ہوئی۔ بلکہ تمہارا سا عقلمند اگر کسی مذہب کو اختیار کرتا ہے تو اس لیے کہ دھن کا یقین، اسکی رائے اور اسکے دلائل اس ترجیح پر اسکا ساتھ دیتے ہیں۔ اسلیے مجھے آج تنہائی اور خلوت میں اپنی پسند و ترجیح کے وجوہ و اسباب بتاؤ۔ مجھے آج تک اتنی مہلت نہ ملی کہ میں اس مسئلہ پر بطور خود غور کر سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ میں پہلا بادشاہ ہوں جس نے اس طرح کی عجیب فرمائش کی ہو، لیکن میرے خیال میں مجھے اس سوال پر نادم و مخجل ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے!

کیا میں پہلا بادشاہ ہوں؟ ہاں، ہاں، کہہ بھی ڈالو!....

اچھا اگر تمہیں اپنے پریشان خیالات اکٹھا کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تو میں وہ بھی بخوشی منظور کرتا ہوں (دل میں۔ بہن نے تو سُن لیا ہوگا۔ وہ مجھے بتائیگی کہ میں نے ٹھیک چال چلی یا نہیں) - نیتقن، تم غور کر لو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔ (باہر چلا جاتا ہے)

نیتقن - (تنہا) عجیب معاملہ اور طرفہ معمہ ہے! آخر سلطان چاہتا کیا ہے؟ میں زر نقد کے لیے تیار ہو کر آیا، وہ صداقت کا طالب ہے۔ صداقت! گویا صداقت روپیوں کی برابری کر سکتی ہے! وہ تو ایک غیر مستقل سکہ ہے! کیا وہ وزن کی جائیگی؟ اگر ایسا ہو تو کیا کہنا! پھر تو نیا ہی سکہ بنے؟ ویسا سکہ نہیں جو داؤں پر لگایا جا سکتا ہے جو بساط پر پھینکا جا سکتا ہے!.... کیا صداقت بھی عقلمند کے سر میں اسی طرح جمع کی جا سکتی ہے جس طرح سونا تھیلیوں میں کہ جب ضرورت ہوئی پیش کر دیا گیا نکال لیا گیا؟.... اس معاملہ خاص میں ہم دونوں میں سے یہودی کون پرت رہا ہے؟ وہ صداقت طلب کرتا ہے، کیا اسے واقعی صداقت کی ضرورت ہے؟..... آخر اس کا منشا کیا ہے؟ اس کی غرض کیا ہے؟ ..... یا..... یا یہ محض ایک چال ہے؟..... لیکن یہ اس کی سی بزرگ شخصیت کے لیے بڑی ذلیل حرکت ہوگی! اگر بڑوں کے لیے کوئی فعل چھوٹا بھی رہ جاتا ہے؟ دیکھو وہ مکان میں درّانہ چلا گیا۔ حالانکہ اسے ٹھہر کر دق الباب کرنا چاہیے تھا! مجھے ہوشیاری سے کام لینا چاہیے۔ اس وقت اسے کوئی سخت جواب دینا اور مندہی یہودی بن کر باتیں کرنا مناسب نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی قرین عقل نہیں کہ بالکل ہی یہودیت نہ برتی جائے اس لیے کہ اگر یہودیت نہ ہو تو اقتضائے انصاف یہی ہے کہ اسلام ہو! بس یہی بات ٹھیک ہے! بچوں کی طرح بڑے بوڑھے بھی کہانیوں سے خوش کیے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ اچھی طرح کہی جائیں!.... دیکھو وہ آ رہا ہے! (صلاح الدین اندر داخل ہوتا ہے)

صلاح الدین (دل میں۔ بس اب راستہ صاف ہے!) نیتقن، میں جلد تو نہیں آگیا؟ کیا تم نے اس مسئلے پر غور کر لیا؟ بیان کرو کوئی سنتا نہیں ہے!

نیتقن - کاش سارا عالم سنتا ہوتا!

صلاح الدین - تمہیں اپنے مذہب پر بڑا بھروسا ہے! بیشک۔ یہ تمہاری عقلمندی ہے کہ تم صداقت نہیں چھپانا چاہتے اور اعلان حق میں اپنی جان و مال کا بھی خیال نہیں کرتے۔

نیتھن - ہاں، مگر اُسی وقت جبکہ ضرورت مجبور کرتی ہے اور فائدہ دکھائی دیتا ہے .....

صلاح الدین - تو مجھے امید ہے کہ آج کے بعد سے میں مصلح الدین کے خطاب کا مستحق ہو جاؤں گا !

نیتھن - واقعی بہت ہی محترم خطاب ہے !.... مگر .... مگر جہاں پناہ - قبل اس کے کہ میں اپنے مطلب کا اظہار کروں مجھے ایک کہانی کہنے کی اجازت دیجائے

صلاح الدین - ہاں ہاں مجھے اچھی کہانیاں ہمیشہ سے مرغوب ہیں -

نیتھن - اچھی ؟ - جہاں پناہ یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے !

صلاح الدین - پھر وہی متکبرانہ انکسار ؟ بس کہانی شروع کرو !

نیتھن - زمانۂ قدیم میں مشرق میں ایک شخص رہتا تھا جسے اُسکے دوست نے ایک نایاب و بیش قیمت انگوٹھی دی - اس انگوٹھی میں اس طرح کا اوپل جڑا تھا کہ اُس کا رنگ ہر وقت بدلا کرتا تھا - اور اُس کا خاص اثر یہ تھا کہ جو شخص اس انگوٹھی پر اعتقاد رکھیگا وہ خدا کا محبوب ہوگا اور ساری دنیا اُس سے محبت کریگی - اس مشرقی کو وہ انگوٹھی اس قدر پسند تھی کہ وہ کبھی اُسے اپنے ہاتھ سے نہ اُتارتا تھا - اور اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ انگوٹھی اُسکے خاندان سے باہر نہ جائیگی - اس لیے اپنے وصیت کی کہ اسکا وارث اسکے بیٹوں میں سے محبوب ترین فرزند ہوگا اور وہ اپنی اولاد میں سے محبوب ترین فرد کو یہ انگوٹھی عطا کریگا - اور یوں ہی یکے بعد دیگرے انگوٹھی خاندان کے محبوب ترین فرد کے پاس رہیگی اور وہی ساری جائداد کا مالک ہوگا - جہاں پناہ سن رہے ہیں ؟

صلاح الدین - میں خوب سمجھ رہا ہوں، چلو، آگے بڑھو -

نیتھن - ایک سے دوسرے کے پاس ہوتی ہوئی بالآخر یہ انگوٹھی ایک ایسے شخص کے پاس پہونچی جسکے تین لڑکے تھے - تینوں علی درجہ باپ کے مطیع، اور وہ بھی تینوں سے یکساں محبت کرتا تھا - اس کی محبت بھری نظروں میں ان میں سے ہر ایک یکساں طور پر اس انگوٹھی کا اور اس کی جائداد کا مستحق معلوم ہوتا تھا - اس نے اپنی اسی کمزوری سے مجبور ہو کر ان میں سے ہر ایک سے خفیہ طور پر اس انگوٹھی اور جائداد کی وراثت کا وعدہ کر لیا - اس طرح ایک زمانہ گزر گیا یہاں تک کہ اُس کے مرنے کا دن قریب آگیا، باپ اب پریشان ہوا - وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے اُن لڑکوں میں سے جو اُس پر یکساں طور پر اعتماد کرتے تھے، ایک کو خوش اور دو کو مایوس کرے - اب وہ کیا کرتا ؟ ..... اُس نے خفیہ طور پر ایک جوہری کو بلایا کہ اُس سے کہے کہ وہ بالکل اسی طرح کی دو اور انگوٹھیاں بنادے، خواہ کتنا ہی خرچ ہو اور کتنا ہی صرف کیوں نہ ہو لیکن انگوٹھیاں ایسی بنیں کہ اصل سے سرِ مو فرق نہ ہو! جوہری نے حرف حرف تعمیل کر دی ! - جب انگوٹھیاں بن کر آئیں تو خود بڑے میاں نہیں پہچان سکے کہ ان میں سے اصلی کون سی ہے اور نقلی کون سی ہیں ! اب باپ نے

خوش ہوکر بیٹوں کو بُلایا، ہر ایک سے وہ علیحدہ علیحدہ رخصت ہوا اور اسنے ہر ایک کو ایک انگوٹھی اپنی دُعاؤں کے ساتھ دی.... اور وہ مرگیا! جہاں پناہ سُن رہے ہیں؟

صلاح الدین (جس نے کہ پریشان ہوکر ہیودی کی طرف سے پشت پھیر لی تھی) ہاں ہاں میں سُن رہا ہوں، تم قصے کا انجام بیان کرو!

نیتھن - جہاں پناہ، کہانی ختم ہوگئی! اسکے بعد جو واقعات پیش آئے وہ دماغ پر تھوڑا سا زور دینے سے ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے۔ ابھی باپ کا کفن بھی مَیلا نہ ہونے پایا تھا کہ ہر ایک لڑکا اپنی اپنی انگوٹھی پیش کرکے جائداد کا دعویدار ہوا، سوالات و جوابات شروع ہوگئے، بحثوں کے دفتر کھل گئے اور جھگڑے کا افتتاح ہوگیا! مگر سب بے سُود! اصلی انگوٹھی کا اسی طرح اُسوقت پتہ نہ چلا جس طرح (تھوڑی دیر سلطان کے جواب کا انتظار کرکے) آج اصلی مذہب کا!

صلاح الدین - تو کیا میرے سوال کا تمھاری طرف سے یہی جواب ہے؟

نیتھن - نہیں جہاں پناہ! لیکن یہ کہانی میری طرف سے بحیثیت معذرت کے پیش کی جاسکتی ہے۔ اُن انگوٹھیوں میں جو باپ نے مخصوص طور پر اس لیے بنوائی تھیں کہ کوئی ان میں فرق نہ نکال سکے میں فرق نکالوں، یہ میری مجال کہاں!

صلاح الدین - ہٹاؤ بھی یہ بیکار کی باتیں نہ بناؤ! تم مذہب کی مثال انگوٹھی سے دیتے ہو! میں نے جن مذاہب کا نام لیا ہے، اُنکے صاف صاف مخصوص علامات ہیں اور وہ ایک دوسرے سے لباس و غذا تک میں مختلف ہیں!

نیتھن - جہاں پناہ یہ صحیح ہے — لیکن وہ اپنے اساس میں مختلف نہیں ہیں! کیا ان میں سے ہر ایک تاریخ پر مبنی نہیں ہے؟ خواہ وہ تاریخ سماعی ہو یا تحریری؟ کیا تاریخ کی بنا اعتماد پر نہیں ہے؟..... تو پھر ہم سب زیادہ کس پر بھروسا کرسکتے ہیں؟ اپنے ہی خاندان والوں پر، وہی جن سے ہمارا گوشت پوست بنا ہے، جو ہم سے بچپنے سے محبت و شفقت کرتے رہے ہیں، جنھوں نے سوا اُن موقعوں کے جہاں پر ایسا ہی کرنا ہمارے لیے بہتر تھا، ہمیں کبھی دھوکا نہیں دیا! آخر مَیں اپنے آباء و اجداد پر اُسی طرح کا اعتماد کیوں نہ کروں جیسا کہ ظل اللہ اپنے اسلاف پر کرتے ہیں؟ یا کیا میں ظل اللہ سے یہ استدعا کرسکتا ہوں کہ جہاں پناہ اپنے آباء و اجداد کو محض اس لیے جھوٹا سمجھیں کہ میرے آباء و اجداد سچے ثابت ہوں؟ یہی بات عیسائیوں کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے!

صلاح الدین - رسول مقبولؐ کی قسم تو سچ کہتا ہے میں لاجواب ہوگیا!

نیتھن - اب ذرا انگوٹھی کے معاملے کی طرف ظل اللہ توجہ فرمائیں - یہ عرض کیا جاچکا تھا کہ لڑکوں نے آپس میں جھگڑا کیا، ہر ایک قاضی کے پاس گیا اور سچ سچ اس بات کی قسم کھائی کہ اُسنے اپنے باپ کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی پائی تھی اور اُسے یہ اُمید بھی

دلائی گئی تھی کہ انگوٹھی پر محول جائداد بھی اُسی کو ترکہ میں ملیگی۔ اس میں وہ مطلقاً جھوٹ نہیں بولے۔ ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ امر ناممکن ہے کہ اُس کے باپ نے اُس سے غلط بیانی کی ہو۔ ان میں سے ہر ایک اس بات پر مُصر تھا کہ اُسکا باپ اس طرح کی رکیک حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی خواہش کے خلاف اس نتیجے پر پہونچنے پر مجبور تھے کہ کہ انکے باپ کے مرنے کے بعد کوئی نہ کوئی بے ایمانی کی گئی!

صلاح الدین - ہاں تو قاضی صاحب نے کیا کہا؟ میں بھی اُن کا فیصلہ سننے کے لیے بیتاب ہوں۔ ذرا میں دیکھوں تو کہ تم اُن کے منہ سے کیا کہلاتے ہو؟ ہاں ہاں کہو چلو، پھر کیا ہوا؟

نیتھن - قاضی نے کہا اگر تم لوگوں کا باپ عدالت کے روبرو نہیں پیش کیا جا سکتا تو میں فیصلہ کرنے سے عاجز ہوں۔ میرا کام معمے حل کرنا نہیں ہے! کیا یہاں اصلی انگوٹھی کے زبان ہو جائیگی! ....
لیکن ہاں ذرا ٹھہرو، تم نے یہ بیان کیا ہے کہ اصلی انگوٹھی کا یہ اثر ہے کہ جو اُسے پہنتا ہے اُس سے خدا اور ساری دُنیا محبت کرنے لگتی ہے۔ اب بولو اور جواب دو کہ کیا اس محبت پیدا کرنے والی انگوٹھی کا اثر اندرونی اور نفقتہ ہے کہ وہ علانیہ طور پر نمایاں نہیں ہوتا؟ کیا تم میں سے ہر ایک اپنی ہی ذات سے محبت نہیں کرتا؟ تم سب کے سب فریب خوردہ فریبی ہو! یہ ساری انگوٹھیاں نقلی ہیں، غالباً وہ اصلی انگوٹھی غائب ہو گئی اور تمھارے باپ نے اُس ایک کی جگہ تین تین بنوا دیں!

صلاح الدین - واہ واہ، سبحان اللہ!

نیتھن - جہاں پناہ، قاضی نے یہ بھی کہا کہ اگر تم میرے فیصلے پر راضی نہیں ہو اور میری صلاح پر عمل نہیں کرنا چاہتے تو تمھاری خوشی! لیکن میں تم سے اس معاملے پر غور کرنے کی پُرزور سفارش کروں گا۔ دیکھو تو کہ تم میں سے ہر ایک کو تمھارے باپ نے ایک انگوٹھی دی، اور تم میں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ اصلی انگوٹھی اُسی کے پاس ہے۔ تمھارے باپ کا غالباً یہ منشا تھا کہ وہ ایک انگوٹھی کے اثر سے آزاد ہو جائے۔ وہ تم میں سے ہر ایک سے یکساں محبت کرتا تھا اور اُس کی یہ خواہش نہ تھی کہ ایک کے ساتھ محبت میں زیادتی کرکے دوسروں کے حقوق سلب کرلے۔ اس لیے تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ تم اُسی کی طرح محبت کرو اور خود غرضی سے علیحدہ ہو کر اس امر میں ہمہ تن مشغول ہو جاؤ کہ محبت اور نیکی کے کام انجام دے سکے اور خدا پر بھروسا کرکے اپنی انگوٹھی کے اثرات ثابت کر دکھاؤ ـــــ اگر کسی زمانے میں تمھارے بچوں کے بچوں میں بھی اس انگوٹھی کے اثرات پھر سے ظاہر ہو جائیں تو اس عدالت کے سامنے دوبارہ فیصلے کے لیے آنا، مجھ سے زیادہ کوئی قابل آدمی اس کرسی پر بیٹھا ہوگا، وہ اس جھگڑے کا فیصلہ کر دے گا!۔ ظل اللہ، یہ تھی اس منکسر مزاج قاضی کی تقریر!

صلاح الدین - سبحان اللہ! سبحان اللہ!

نیتھن - اب اگر جہاں پناہ کا یہ خیال ہو کہ جہاں پناہ ہی وہ قاضی .....

صلاح الدین (سلطان نے نیتھن کے قریب آکے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیلیا اور اس سین کے خاتمے تک یوں ہی لیے رہا) میں اور قاضی! خاک کا حقیر و ذلیل پُتلا! واللہ نہیں!

نیتھن - کیوں جہاں پناہ؟ کیوں نہیں؟

صلاح الدین - پیارے نیتھن، اُس قاضی کا زمانہ ابھی نہیں آیا، اُس کی کرسی عدالت میرے لیے نہیں ہے! ...... اچھا تم جاؤ .... لیکن دیکھو ہمیشہ میرے دوست رہنا -

نیتھن - کیا جہاں پناہ کو کچھ اور بھی ارشاد فرمانا ہے؟

صلاح الدین - نہیں -

نیتھن - کچھ بھی نہیں؟

صلاح الدین - مطلقاً نہیں، لیکن یہ آخر تم اتنے اصرار سے کیوں بار بار پوچھ رہے ہو؟

نیتھن - جہاں پناہ اس لیے کہ میری خواہش تھی کہ مجھے ایک استدعا کا موقع دیا جاتا -

صلاح الدین - تو موقع و محل کی جستجو کی ضرورت نہیں - ابھی کہہ ڈالو!

نیتھن - ظل اللہ، میں ایک دُور دراز سفر سے واپس آرہا ہوں اور بہت سی وہ رقمیں وصول کرکے لایا ہوں جو لوگوں پر باقی تھیں، آج کل کے پُرخطر زمانے میں نقد روپیہ اپنے پاس رکھنا مخدوش ہے، اور مجھے کوئی محفوظ مقام دکھائی نہیں دیتا .... اور ...... اور جہاں پناہ اس ہونیوالی جنگ میں روپیہ کی سلطنت کو ضرورت ہوگی، کیا ظل اللہ میری خاطر سے میری رقموں کا مصرف نہیں نکال سکتے؟

صلاح الدین (نیتھن کو بغور دیکھ کر) کیا تم سے وزیر سے ملاقات ہوئی تھی یا تم نے خود ہی بھانپ لیا ہے کہ تم اس طرح کی مجھ سے استدعا کر رہے ہو؟

نیتھن - کیا بھانپ لیا جہاں پناہ؟

صلاح الدین - بھئی معاف کرنا، اب بات بنانے سے کیا فائدہ، میں خود تم سے یہی .....

نیتھن - جہاں پناہ یہی طلب فرمانے والے تھے -

صلاح الدین - ہاں -

نیتھن - تب تو

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار!

مسیحی مصنفین کا یہ عام شیوہ ہے کہ اپنے افسانوں اور ڈراموں کے ذریعہ مسلمان تاجداروں کے خلاف زہر پھیلاتے رہتے ہیں اور سلطان صلاح الدین نے جنگ اے صلیبی میں عیسائیوں کی متحدہ فوجوں کو جو پے بہ پے شکستیں دیں انکی بنا پر اس نامور فاتح سے تو انہیں دلی بغض ہے جس کی بدولت کثیر التعداد تصانیف میں سلطان کی سیرت پر مختلف پہلوؤں سے حملے گئے ہیں - اس ڈرامہ میں بھی صوری کا یہ نقص موجود ہے، اگرچہ پوقلم بہت باریک ہے اور بڑی عیاری سے استعمال کیا گیا ہے - ایڈیٹر

اُردو ادب پر ایک خطبہ

(جناب مولوی مشیر احمد علوی صاحب قادری ناظر کاکوروی بی اے)

یہ مقالہ مرحوم صلاح الدین خدا بخش پروفیسر تاریخ اسلامی کلکتہ یونیورسٹی کا وہ خطبہ صدارت ہے جو انھوں نے آل انڈیا اورئینل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ ۲۱ دسمبر ۱۹۳۰ء میں شعبۂ اردو کی صدارت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔ یہ ترجمہ تو کہلانے کا کسی طریقے سے مستحق نہیں۔ لیکن ہاں اُس خطبہ کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔

مترجم

اُردو کے آغاز کی داستان ہو شر با بحیثیت ادبی زبان کے باوجود تحقیقات کے بھی اب تک پردۂ راز ہی میں ہے۔ اس کی ابتدا ۱۳۹۸ء سے بھی کرتے ہیں جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا، لیکن بعض اس سے بھی بہت قبل سے اسکی ابتدا کا سنہ مقرر کرتے ہیں۔ اور اس گروہ کا یہ دعویٰ ہے کہ مسعود بن سعد نے گیارہویں صدی عیسوی کے پہلے عشرہ میں ریختہ میں کچھ شعر کہے۔ اور تیرہویں صدی عیسوی میں تو سلطان العشاق حضرت امیر خسرو نے اس جدید زبان میں بہت کچھ لکھا ہے جو تذکرۂ عرفات کے باکمال مصنف (مولف؟) اوحدی کے خیال میں خسرو کے "موجودہ فارسی تصانیف سے دگنا تھا"۔ اس سے بھی زیادہ لطف کی بات ہے کہ مشہور مستشرق مسٹر گرہیم بیلی نے ایک جدید تحقیقات پیش کی ہے۔ اسکی رو سے تو اُردو کا دَور محمود کے حملہ سے ہندوستان میں شروع ہوتا ہے ——— بہرحال جو کچھ بھی ہو، ان تمام قیاسات و خیال آرائیوں کو علیحدہ کر دینے کے بعد بھی اس امر میں تو کوئی شبہ ہی نہیں رہتا کہ اسلامی عہد حکومت (کی ابتدائی صدیوں میں بھی) میں مسلمانوں نے اس جدید زبان کو ضرور استعمال کیا اور اس جدید زبان میں شعر بھی کہے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اُس دَور کی اُردو، فارسی سے علیحدہ چیز نہ تھی، بلکہ فارسی ہی کا دوسرا نام اُردو تھا۔ کیونکہ تعداد الفاظ فارسی کی غالب ہوتی تھی اور امراء و سلاطین کی ٹکسالی زبان فارسی ہی سمجھی جاتی تھی۔ اس فارسی یا عجمی لٹریچر کا یہ اثر تھا کہ کبیر و چند کا کلام بھی فارسی کے اثرات قبول کرنے سے انکار نہ کر سکا۔ اور یہ "اپنانے" کا عمل برابر عرصہ تک جاری رہا۔ حتیٰ کہ فارسی محاورات بھی زبان زد ہوتے گئے؛ اور اس طرح جدید زبان کے نشر و اشاعت میں بھی فارسی ممد و معاون ہوتی گئی۔ اکبر کی آزاد خیالی نے اس جدید زبان کے نشر و اشاعت میں بہت کافی حصہ لیا۔ اور جملہ مذاہب کے مقدس حروف بھی اُسی کے طفیل جدید زبان میں سموئے گئے۔ فارسی میں سنسکرت ادبیات کے ترجموں نے جدید زبان کی تحقیقات کے لیے راہیں کھول دیں۔ اور اس طرح

مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات کی کشادگی میں جدید زبان نے بھی حصہ رسدی ہاتھ بٹایا اور مجبوراً ہندوؤں اور مسلمانوں کو دونوں زبانیں پڑھنا پڑیں۔ یہ اثر دارالخلافت کی زبان پر بہت گہرا پڑا۔ دہلی میں اور ہمالیہ کے شمالی جانب جو ہندی بولی جاتی تھی اُس پر بھی عجمی رنگ چڑھا اور خوب چڑھا۔ دولت مغلیہ کی حدود میں وسعت ہوتی گئی۔ جنوبی حدود میں بھی اضافہ ہوا۔ اور اس طرح دارالسلطنت کے محاورات اور ٹکسالی زبان دکن تک پہونچی اور دکن میں بھی مسلمان شاہنشاہوں کی درباری زبان بننے کا اسکو شرف حاصل ہوا۔ چنانچہ یہ اسی کا تصرف کہا جا سکتا ہے کہ بجوہ آج سلطنت عثمانیہ میں ایک جامعہ محض اس جدید زبان (اُردو) کا قائم ہے، اور اس دارالعلوم کے منتہی کسی دوسری درسگاہ کے فارغ التحصیل سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

لیکن یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ ادبی تالیفات کا اہم کام سب سے پہلے گولکنڈہ اور بیجاپور کے اسلامی درباروں سے شروع ہوا اور مرکزی مقام دہلی اس سلسلہ میں یقیناً بہت پیچھے رہ گیا۔ نوطلوع ادب یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نہ تو عوام کے ادبی ذوق کا نتیجہ تھا اور نہ عوام کے خیالات کا آئینہ دار۔ کیونکہ گولکنڈہ والے تیلگو بولتے تھے اور بیجاپور والے کنڑی۔ یہ دونوں ڈراوڈین زبانیں تھیں۔ ان زبانوں کو شمالی آریائی زبان سے مطلقاً کچھ تعلق نہ تھا۔ اور اسی خیال سے اس جدید ادب کے لیے اپنا ماڈل عجمی بنانا پڑا۔ یقیناً اُس دور کا ادب تمام تر عجمی اثرات سے پُر تھا بلکہ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ وہ کلیۃً عجمی خیالات کا نقش ثانی تھا۔ چنانچہ قصائد، غزلیں، مرثیے، مثنویات، رباعیات اور ہجویات سب ہی کچھ عجمی تاثرات کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔

گولکنڈہ میں ادبی مرکز قائم ہوا۔ قلی قطب شاہ اور اُس کا جانشین عبداللہ قطب شاہ دونوں مشہور شاعر تھے۔ قطب شاہ کے دور میں ابن نشاطی نے دکنی زبان میں دو تصانیف پیش کیں۔ طوطی نامہ اور پھول بن۔ بیجاپور کا دربار بھی بہت شاندار ادبی مرکز تھا ابراہیم عادل شاہ (۱۵۹۹-۱۶۲۶ء) نے نورس مرتب کیا۔ علی عادل شاہ کا درباری شاعر برہمن جو نصرتی کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ اسکی مشہور مثنوی گلشن عشق اب بھی ادبی اعتبار سے بہت کافی مشہور ہے۔ یقیناً یہ لوگ ادبی ہیرا دل یا پیامبر تھے۔ اور یہ اعزاز قسام ازل نے دکنی اور نگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی کے لیے مخصوص رکھ چھوڑا تھا کہ صدیوں تک اُن کی زبان مستند تصور کی جائے۔ بہت سے مورخین اور اُدباء کی اب یہ رائے ہو گئی ہے کہ اُردو شاعری میں (تیرہویں صدی میں) شمالی ہندوستان میں جو انقلاب ہوا وہ یقیناً دکنی کے اثر اور خیال کا بڑی حد تک رہین منت تھا۔

اُس دَور کے بہت سے دوسرے مشاہیر کی طرح ولی کے سوانح حیات ہم کو زیادہ معلوم نہیں ہیں اب ہم اورنگ آباد سے دوبارہ دہلی واپس آتے ہیں اور یہاں ہم کو ظہور الدین حاتم کی بلند شخصیت نظر آتی ہے جن کے آفتاب کمال نے اُس مشہور لیکن بدنصیب شہر کی شہرت میں یقیناً اضافہ کیا —— لیکن یہ ضیا بھی ولی اورنگ آبادی سے اکتساب کی گئی تھی —— محمد شاہ کے دوسرے سن جلوس میں دار الخلافت دہلی میں دیوان ولی کی اشاعت ہوئی - رقابت اور رشک و حسد کی آگ بھڑکی - اور دہلی کی ادبی سبھا میں اس رقیبانہ جنگ سے آگ لگ گئی - حاتم نے جو اس دَور کے ہراول تھے اس جوش سے فائدہ اُٹھایا، ور ولی کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا - لیکن اس اہتمام بالشان مناقشہ کے باوجود حاتم کی زبان دکنی نہ تھی بلکہ شمالی (یا ہندوستانی؟) حاتم کی مساعی جلیلہ کی تقلید اُس کے احباب سنے کی اور تاجی، مضمون، اور آبرو نے دہلی کے ادبی وقار کو بڑھانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی - ایک جدید شاہراہ کھل گئی اور ایک جدید ستارہ مطلع ادب پر طلوع ہوا - حاتم اُس اسکول کا پرنسپل (اگر یہ کہنا جائز ہے؟) تھا جس کا سب سے بیش قیمت رکن رفیع السودا تھا - لیکن حاتم کے معاصر خانِ آرزو کی شہرت نے حاتم کو پس پشت ڈال دیا - گو خان آرزو کی شہرت زیادہ تر فارسی تحقیقات کی بنا پر ہے لیکن پھر بھی وہ اُردو کا ایک باکمال شاعر اور بے نظیر ادیب تھا - آرزو کا ایک تذکرہ بھی مسٹر صلاح الدین خدا بخش مرحوم کے کتبخانہ میں تھا جو اگر کبھی شایع ہوگیا تو اُس سے زیادہ قدیم اور مستند تذکرہ دوسرا نہیں ہو سکتا - میر جو سودا کے معاصر تھے وہ انھیں خانِ آرزو کے شاگرد تھے نادر شاہی حملہ کے بعد آرزو لکھنؤ چلے آئے اور یہیں اُن کا انتقال بھی ہوگیا - لیکن کس قدر افسوسناک واقعہ ہے کہ آج لکھنؤ میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ خان آرزو کس جگہ محو خواب ہے! یقین کا بھی تذکرہ کیا جا سکتا ہے جو بہت ہی نوعمری میں احمد شاہی دَور میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا - اور اس سلسلہ میں خواجہ میر درد کی غیر فانی شہرت کا تذکرہ ناگزیر ہے جو بیک وقت شاعر بھی تھے اور صوفی بھی، موسیقی کے ماہر تھے خود گاتے تھے اور قوالوں سے بھی بہترین کلام سنتے تھے - ان میں یاس و امید دونوں کا انتہائی جذبہ موجود تھا اور اُسی کے ساتھ نہایت آزاد خیال - لیکن سخت مذہبی انسان تھے - ہم انکے متعلق آیندہ چل کر پھر کچھ لکھیں گے جب عظیم آباد کی شاعری کا تذکرہ کریں گے -

---

خان آرزو کی سنت پر عمل پیرا ہو کر میر اور سودا بھی لکھنؤ چلے آئے اور آصف الدولہ کی عنایات سے مستفید ہوتے رہے —— میر - اس نام ہی سے مختلف اضداد و اشیا کا پتہ چلتا ہے - خیالات کی صفائی، تخیل کی بلند پروازی، شیرینی و حلاوت، یاس و حرماں، شام مصیبت کے نظارے، مصائب کے بادل، حرماں نصیب

سسکیاں، دبائی ہوئی آہیں اور چشمِ پُرنم۔ غرضکہ دنیا کی ہر شکل اس نام میں فطرت نے ودیعت کر دی تھی ——
اپنے پاک اور نزہت پرور مناظر کو دیکھتے ہوئے سودا کا میدانِ عمل شاعری میں میر سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے
بلکہ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ ایک بہت بڑی حد تک دونوں میں بعد المشرقین تھا۔ خیالات میں اختلاف،
الفاظ میں اختلاف، محاورات میں اختلاف۔ اس جنگ کا انجام کیا ہوا؟ شیرینی، حلاوت اور روشنی
کا تلخی، سختی، اور ظلمت سے مقابلہ تھا۔ لیکن جدید زبان کو اس جنگ سے بھی کچھ نہ کچھ نفع مل ہی گیا ——
اس موقعہ پر کون ہے جو غالب کے صداقت نامہ سے انکار کر سکتا ہے

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

سر سید اعظم کا فیصلہ بھی سننے کے قابل ہے :-

"میر کی زبان اس قدر صاف ہے اور اظہارِ خیال کے طریقے جو وہ استعمال کرتے ہیں اس قدر مناسب
اور فطری ہیں کہ آجتک اُن کی توصیف و تعریف میں سب لوگ متفق ہیں۔ گو سودا کی زبان بھی بے نظیر ہے
اور وہ تلمیحات میں میر سے یقیناً افضل ہیں لیکن طرزِ ادا اور اسالیب میں یقیناً میر سے کمتر ہیں"۔

سیاسی طوفان دارالخلافت دہلی میں آیا اس کی شان و شوکت میں فرق آ گیا لیکن شاعرانہ عظمت برقرار
رہی۔ مابعد کے مغل شہزادے خود شاعر تھے۔ شاہ عالم کا تخلص آفتاب تھا۔ اُنکی مثنوی اور دیوان منظوم اقدس
کے نام سے مشہور ہے۔ سلیمان شاہ کا بھی ایک دیوان ہے۔ غالب کی "شمع" بہادر شاہ جو دولِ مغلیہ کی طویل زنجیر

ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

کی آخری کڑی تھا، وہ ظفر تخلص کرتا تھا۔ لیکن یہ تخلص راس نہ آیا۔ کیونکہ تیموریہ جاہ و جلال کا مرثیہ پڑھنے
کے لیے فطرت نے ظفر کو منتخب کیا تھا۔ اور قسمت کی نیرنگیوں اور مقدرات کی کہانیوں کا سب سے غمناک
متن اور حرماں نصیب افسانہ گو رنگون میں ظفر ہی تھا　—— بہرحال ظفر کا نام اپنے اُستاد ذوق
کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ قصیدہ نگار کی حیثیت سے ذوق کا پایہ بہت ارفع ہے —— دہلی اپنی
جائے پیدایش سے علٰحدہ ہونے کے بعد بھی کوئی شے اُن تخیلات سے ظفر کو علٰحدہ نہیں کر سکتی تھی جنکی افسوسناک یاد
اور خواب کی سی دلچسپیاں رنگون میں ستایا کرتی تھیں۔ اور اُس دور کا جو سرمایہ ظفر کا اسوقت موجود ہے
وہ یقیناً دہلی کے شاہی سرمایہ سے زیادہ قابلِ وقعت ہے۔ کیونکہ ان میں واقعیت اور اصلیت کی جھلک
پائی جاتی ہے اور دہلی میں تصنع اور آورد کا پایہ بلند تھا —— اس حرمانی دور کی شاعری یقیناً اس
قابل ہے کہ اُسکو ہاتھی دانت کی نفیس اشیا کی طرح عزت و حرمت کی جگہ ادبِ اُردو میں دی جائے ——

اُستاد ذوقؔ کے علاوہ جب دہلی میں انحطاط کی تاریکی تھی تو ایک شہاب ثاقب کی روشنی مشعل کی شکل میں رونما ہوئی اور لافانی عظمت غالبؔ کے حصہ میں آئی۔ ؎ اس وجہ سے کہ وہ میرؔ کے مقابلہ میں زیادہ بہتر کہتے تھے، اُنکا اسلوب بیاں نادر تھا یا تخیل ارفع تھا، یا سوداؔ کی طرح وہ ہاجی تھے، یا دردؔ کا تصوف اُن میں تھا یا مومنؔ کی طرح اُن کے کلام میں نزاکت، رعنائی یا تنوع یا مزاح موجود تھا ——— بلکہ غالبؔ ان تمام باتوں سے بالکل علٰحدہ خود ایک مستقل اسکول ہے اور اُردو شاعری کا سب سے بلند شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے تو انتہائی فرطِ عقیدت سے اس اعلان میں بھی تامل نہ کیا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں[۲] دو ہیں وید مقدس اور کلامِ غالب۔ غالبؔ اصل میں نام ہے اُس عہد کے اسلامی سماج کے عطر کا جو کھنچکر اسد اللہ خاں کی ذات میں مجتمع ہوگیا تھا۔ اور یہ انھیں اوصاف و محامد کا نتیجہ تھا کہ جب فلکِ ادب پر غالبؔ کا آفتاب کمال طلوع ہوا تو اُس وقت کے تمام ادبی ستاروں کی روشنی ختم ہوگئی۔ اور فرطِ عقیدت سے جملہ شعرا نے اپنا اپنا سرِ نیاز اپنے دور کے سب سے بڑے صاحبقراں کے حضور میں خم کردیا۔ ابوالعلیٰ یا عمر خیام کی طرح غالبؔ اپنے عہد کا ایک نمایندہ ہے جو اپنی شاعری میں اپنے دور کی روح پھونک دیتا ہے۔ غالب یقینی اپنے عہد کا ایک باکمال مجتہد اور مجدد تھا اور اگر تشبیہ کفر نہیں ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ شریعتِ شاعری کا پیغمبر ہے — اس کی شاعری ایک مستقل پیام ہے اقوامِ عالم کے لیے ——— اُسکے صحیفے کے نمایاں ابواب یہ ہیں:——— تساہلی و بیکاری کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے — استبداد کے خلاف نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ مذاہب کی غلط تعبیر پر مضحکہ اُڑاتا ہے۔ مجتہدین و علما کے تقدس کا استہزا کرتا ہے۔ محبت کے فقدان پر نوحہ کرتا ہے۔ عدم مساوات پر اشکرہ و نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ عام خیرات وعفو کی وکالت کرتا ہے ——— اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ گل و بلبل کو بھی بھول نہیں جاتا۔ عاشق کے مصائب سے بھی باخبر ہے اور وصال کے لطائف کا بھی اُس کو علم ہے ——— یہی وہ زندگی کا اعلےٰ رُخ ہے جو غالبؔ نے اپنے صحیفہ میں پیش کیا ہے اور یہی وہ اعلیٰ شاعری کا نمونہ ہے جو اُس رنگا رنگ زندگی کا نقش ثانی کہلانے کا مستحق ہے ——— دوسرے شعرا فردوسی بادلوں پر سفر کرتے ہیں یا آسمانوں کے گرد و نواح میں خلا میں گھوما کرتے ہیں یا اپنے شہر خیال کو لاشئی کی تلاش میں اُڑایا کرتے ہیں یا اپنی خود اختراع کردہ کائنات کے کسی حصہ میں سکون حاصل کرتے ہیں۔ لیکن غالبؔ ارضی مخلوق سے دنیاوی باتیں کرتا ہے ——— اور انسانوں کے کھوئے ہوئے گرتے ہوئے اور کمزور نقوش پا کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور ظلمت میں شمع عرفانی سے لوگوں کے قلوب منور کرتا ہے۔

دہلی کے بعد اردو کا مرکز لکھنؤ ہوا۔ یہاں نخلِ اردو پھولا پھلا۔ آرزو، سودا و میر کے وطن ثانی کی شہرت میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ دہلی کی قدیم عظمت پر بھی لکھنؤ کی بڑھتی ہوئی شہرت کا اثر پڑا۔ ممتاز مہاجرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ میر حسن، میر سوز، اور قلندر بخش جرأت لکھنؤ میں آگئے۔ یہ اسکول دراصل دہلی شاعری کے عروجِ سلطنت تک قائم رہا۔ ایک شاعر نے اس اسکول کے متعلق خوب کہا تھا
"خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود"
یہاں امیروں کے شعرا میں آتش و ناسخ کا بہت زور رہا۔

لکھنؤ کے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی اس کی ادبی مرکزیت بھی رامپور منتقل ہو گئی۔ خانوادہ رامپور فیاضانہ ہنر بخشیوں میں مصروف تھا۔ اس خانوادہ نے قابل لائق افراد کو تمام اقطاع ملک سے اپنے دربار میں جمع کر لیا۔ نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں کے دربار میں ادبی نورتن کی سبھا قائم ہوئی۔ یہ وہ ادبی سبھا تھی جو سلطنت دہلی کے مٹنے کے بعد آخری بار رامپور میں منعقد ہوئی تھی۔ یہاں دہلی اور لکھنؤ اسکول کے اساتذہ ایک جدید اسکول قائم کرنے کے لیے مشورت پر جمع ہوئے۔ یہاں لکھنؤ معیار اور دہلی معیار سمویا گیا اور ایک جدید شاعرانہ معیار وضع کیا گیا۔ ناسخ کی لفاظی اور تصنع ٹکسال باہر کیا گیا۔ اسی طرح دہلی اسکول کی چند باتیں ٹکسال باہر کی گئیں۔ سادگی، واقعیت، اصلیت یہاں کا معیار قرار پایا۔ امیر و داغ اس دربار میں ممتاز نظر آتے تھے لیکن داغ کی قدر زیادہ ہوئی۔ اور وسیع میدان اور بہت شہرت انکے نصیب میں آئی کیونکہ وہ حیدرآباد چلے گئے اور نظام دکن کے استاد کی حیثیت سے دنیاوی جاہ و جلال سے بھی سرفراز کیے گئے۔ امیر عالم تھے، فاضل تھے، صوفی تھے، سب ہی کچھ تھے اور اسکے ساتھ شاعر بھی تھے لیکن داغ کے انداز بیان کے سامنے انکو وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جسکے فی الحقیقت امیر مستحق تھے ــــــ

اب تک ہم نے دکن، رامپور، دہلی اور لکھنؤ کا تذکرہ کیا ہے لیکن اب ہم کو عظیم آباد کا بھی ذکر خیر کرنا چاہیے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ علم و ادب کی مساعی جلیلہ میں ہمارے وطن پٹنہ کا کیا حصہ ہے۔ مشرقی شہروں میں چند ہی شہر ایسے ہونگے جنکا ماضی اس قدر شاندار ہوگا جس قدر کہ عظیم آباد کا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے عہد میں اس شہر نے باوجود بدنصیبی شامل حال رہنے کے ایک ممتاز حیثیت رکھی ہے اور عظمت و بزرگی اس پر نثار ہوتی رہی ہے وقت آئے گا جب اس کی مستور عظمت و جلال کا عوام کو اندازہ ہو سکے گا۔ اور انکشافات سے اسکے مدفون خزائن، شاہانہ اقتدار اور ماہا سال کی اہمیت اور ہر دلعزیزی کا پتہ چلے گا۔ اس وقت،

لوگ پٹنہ کی عزت کریں گے۔ عہد عالمگیری میں اسی شہر نے دہلوی شہزادوں کیلیے مرزا بیدل کا سا عدیم المثال اتالیق مہیا کیا۔ جن کا ادب و شاعری ہماری تحسین و توصیف سے مستغنی ہے ——— اور پٹنہ اس گوہر گراں مایہ کو عرصے تک فراموش نہ کر سکا۔

مرزا بیدل کے بعد ایک دوسرا سیارہ سپہر ادب پر ضوفشاں ہوا۔ ہمارا مطلب مرزا معتبر خاں سے ہے جو شاعر تھے اور فطرت تخلص کرتے تھے۔ فطرت نے ہمارے شہر کی عزت دوبالا کو بڑھایا۔ باہر سے تشریف لائے اور پٹنہ کو اپنا مسکن بنالیا۔ جس وقت بیدل و فطرت فلک ادب پر زہرہ و مشتری کی طرح جگمگا رہے تھے اور شہر پٹنہ کی عظمت و اقتدار میں اپنی لافانی شاعری سے اضافہ کر رہے تھے اس زمانے میں سیف خاں کی مسجد گنگا کے صاف و شفاف ساحل کے قریب اپنی تاریخی دیواروں کے دامن عاطفت میں تمدن و تہذیب کے نشر و اشاعت میں مشغول تھی۔ شاد مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

بیا مسجد سیف خاں را نظر کن صفا تر از سینۂ پاکبازے

پٹنہ جو زینت عصری کے دوش بدوش تھا، دودمان تیموریہ کے شاہزادوں، شاعروں، اور علما کا مسکن ہوگیا تھا۔ دہلی سے سیر و سیاحت کے لیے چلے، پٹنہ میں فروکش ہوے۔ یہاں کی فضا اور ماحول خالص ادبی ہوگیا تھا۔ ان مہاجرین کرام کی فہرست میں ہم کو شہزادہ عظیم الشان کا نام نامی بھی نظر آتا ہے جنھوں نے پٹنہ کو اس قدر پسند کیا کہ اس کا نام ہی بدل دیا اور اپنے نام پر عظیم آباد کر دیا۔ جو آج تک شرفا کی زبان پر ہے۔ فرخ سیر بھی پٹنہ کی غیر معمولی آب و ہوا سے مسحور ہو چکے تھے۔ نواب حسین علی خاں صوبہ دار کا محل اس عہد میں شرفاء کا مسکن تھا۔ وہ خود شاعر تھے اور شعر و شاعری کی بڑھتی ہوئی آگ کو ان کے دم سے بہت تقویت ہوئی۔ یہ خیال کہ شعر و شاعری کی فضا دلی و لکھنؤ کی تاراجی کے بعد یہاں پیدا ہوئی مغلطہ ہے، بلکہ ہمیشہ سے عظیم آباد میں ادب پرستی چلی آتی تھی۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اس وقت عظیم آباد نے اس تاراج شدہ قافلہ کی مہمانی سے دریغ نہ کیا تھا۔

اس عہد کے ایک باکمال شاعر میر غلام علی راسخ بہت ذی مرتبت تھے۔ وہ میر کے معاصر تھے اور انکی شاعرانہ اکلیل جہاں بانی کے متعلق راسخ کا حصہ تاریخ ادب میں یاد رہیگا۔ راسخ کی شاعری منتہائے کمال تک پہونچ چکی تھی۔ وہ صوفی ہونے کے باوجود نہایت درجہ مغموم و سنجیدہ تھے۔ انکی شاعری بشریت کی انجیل ہے۔ اور ایسی بشریت جسکی بنیاد ایں کسی مذہب و ملت کے فرقہ وارانہ تضاد سے علیحدہ نہیں کیجا سکتی

ہیں اور یہ ایسی غیر فانی پائدار شاعری ہے جو معاصر شعرا کے کلام میں مفقود ہے - ملاحظہ کیجیے

کدھر کعبہ کہاں کا عرش عظم   دلِ شکستہ ہے کاشانہ تیرا

امیری کیسی کیا یہ مرتبہ شاہی وزیری کا   تو اسے غافل شناسا سے مدارج ہو فقیری کا

غافل تو بھی تو رفتنی ہے   کب تک غم زندگاں کریگا

مجھے سونپ داغ فراق دے ہوئے یوں جدا کہ پھر ملے   مرے دل میں تا دم واپسیں وہ امانت اُنکی دھری رہی

یہ رنج غریبی سبب خستہ تنی ہے   جوں نقش قدم اپنا وطن بے وطنی ہے

نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد مجھے رشک ہے تو انھوں پہ ہے
جنھیں تیرے جلوہ کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

خدا جانے نہاں اس آشکارا میں ہے کیا کیا کچھ   خوشا وے اہل دل جن پر نہاں بھی آشکارا ہے

اگر شاہی سرپرستیوں نے دہلی کے ادیبوں اور شاعروں کی پشت پناہی کی، اور اودھ میں شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے دَورِ نوابی میں علم و ادب کی غیر معمولی قدر افزائی کی گئی تو پٹنہ بھی کسی سے کم نہ رہا۔ راجہ رام نرائن و راجہ شتاب رائے کی صوبہ داری کے زمانہ میں ہمارے ادبیات کی وہ عزت افزائی ہوئی کہ تاریخ ہند اس کے برابر کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ راجہ رام نرائن شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے، اور اُس دَور کے اساتذہ میں انکا شمار ہوتا تھا اور اُردو کے عاشق تھے۔ موزوں تخلص کرتے تھے۔ راجہ شتاب رائے بھی علم و ادب کے شیفتہ تھے۔ دہلی اور دوسرے مقامات سے شعرا و ادبا آتے اور گوہر مراد لیکر مالامال واپس جاتے۔ اور اس طرح اکنافِ ہند میں پٹنہ کا نام روز روشن کی طرح مشہور ہوگیا۔ اس دور میں بہت سے باکمال افراد دہلی سے آئے جن میں نواب اشرف علی فغاں جو احمد شاہ کے سوتیلے بھائی تھے انکی بہت ممتاز حیثیت تھی۔ وہ بڑی روایات کے حامل تھے اور انکا اسلوب بیان بہت ستھرا تھا۔ اُنھوں نے پٹنہ میں اُردو کے لیے جدید شاہراہ پیش کی۔ اُنکی ہدایات سے متاثر ہوکر اُردو بہت منزہ، موثر اور نقائص سے پاک ہوگئی۔ انکا دیوان دستہ (مضافات بہار) میں محفوظ ہے۔ راجہ شتاب رائے کے صاحبزادے راجہ کلیان سنگھ ... راجہ کو علم و ادب کے شوق و ذوق کا جذبہ اور داد و دہش کا احساس ورثہ میں ملا تھا۔ اُنکے دور امارت میں پٹنہ کی بڑی شہرت ہوئی اور شاعروں کی کثرت نے اُردو کا مرکز اب عظیم آباد کو بنا دیا تھا۔ اور دُور دُور سے تشنگان ادب اس خمخانہ میں اپنی پیاس بجھانے کے لیے جمع ہوگئے تھے۔ چنانچہ میر شیر علی افسوس اور میر امن اسی دور کے باکمال افراد تھے جو ہجرت کرکے راجہ کے دسترخوان کرم پر بیٹھے ہوسے مزید ترکیب

پیش کر رہے تھے۔ یہ لوگ اُردو نثر کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جب انکی خدمات ادب دُہرائی جائیں گی تو یقیناً کوئی شخص پٹنہ کو فراموش نہ کر سکے گا۔ جب ہم پٹنہ کے اوراق ماضی پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو اُن خاموش ہستیوں کو بھی چھوڑ نہیں سکتے جنکی خدمات علم و ادب میں کچھ کم نہیں رہی ہیں۔ آپ ہی بتلایئے کیا سید ہدایت علی اسد جنگ کا نام خاموشی سے چھوڑا جا سکتا ہے؟ اُنکا ادبی ذوق ہر آئینہ ممتاز ہے۔ اس ادب پرست ہستی کی وساطت سے ایام پاستاں کی عظمت و جلال کی صدائیں ہمارے کانوں میں سنائی دیتی ہیں۔ اُنکی ٹھمریاں، ساون، کبت، دوہے، آج ہمارے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔ اس سے زیادہ ہر دلعزیزی و مقبولیت کا معیار کیا ہو سکتا ہے۔ اُنکی غزلیں بھی بہت مشہور ہیں۔ بحیثیت اُستادِ فن کے اُنکی شہرت پٹنہ اور بیرون پٹنہ میں بہت کافی ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اُنکا یہ شعر نقل کیا ہے[1]

ہرگز یہ مرے عشق کا سر فاش نہ ہوتا کرتا نہ اگر آ کے مری پردہ دری رنگ

اُنکے باکمال اور ممتاز صاحبزادہ نواب غلام حسین خاں صاحب سیر المتاخرین کی شہرت بحیثیت ادیب و مورخ کے توصیف سے مستغنی ہے۔ دوسرے باکمال بزرگ نواب علی ابراہیم خاں خلیل صاحب گلزار ابراہیم[52] کی شہرت ادبی بھی کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح بے نظیر فرشتہ خصلت بزرگ لالہ پیارے لال الفتی کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُنکی اولوالعزمانہ سرپرستیاں ہر آئینہ شاعروں کے لیے مشہور ہیں۔ اور اسی سلسلہ میں شاہ الفت حسین فریاد اور شوق نیموی کو بھی کسی طرح بُھلایا نہیں جا سکتا۔ فریاد باکمال شاعر تھے۔ اُنکے چچا خواجہ درد کے شاگرد تھے۔ اور اسی سلسلہ سے تصوف کا حصہ باکمال اُستاد سے ملا تھا۔ اسی لیے اُنکی شاعری پر درد کا خارجی و داخلی اثر بہت گہرا ہے۔

---

[1] میری ایک قابل شاگرد شناسائی نے میری توجہ ایک موجودہ زندہ بہاری شاعر کی جانب منعطف کرائی ہے جو بہت امید افزا ہے۔ اور مطلع کمال پر روشن ہے:

چھپایا کے نالوں کو دل میں رکھا کہ لب تک آئیں نہ تنگ ہو کر
مگر نہ جانا کہ رازِ الفت کھُلے گا چہرے کا رنگ ہو کر

[52] علی ابراہیم خاں کا تذکرہ شعرائے اُردو جسکا ایک جزو بعد ترجمہ و اضافہ مرزا علی لطف نے مرتب کیا تھا اور جسکو عرصہ ہوا علامہ شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحق نے شایع کیا تھا اب تمام و کمال تذکرہ کو دکن کے مشہور ادیب ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی نے شایع کرایا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ گلزار ابراہیم کی زبان فارسی ہے اور مرزا علی لطف تذکرہ کی اُردو۔ اس لیے یہ تذکرہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ناظر

فریاد کی شاعری میں یہی رنگ بہت ممتاز نظر آتا ہے اور وہ بالواسطہ خانقاہِ درد کے حلقہ بگوش ہوگئے کیونکہ فریاد اپنے شاعرانہ تخیل کے لیے کسی گلاب، بلبل، یا محبوب کی نرگسی آنکھوں یا غیر معمولی او فوق الفطرت نازک کمر کے روبرو کاسۂ گدائی پیش نہ کرتے تھے بلکہ وہ تابِ انسانی سے تخیل حاصل کرتے تھے جو لافانی صابر و سنجیدہ اُمرنے والا شریفانہ و مقدس خیالات کا آماجگاہ ہے - فریاد کی شاعری نہایت اعلیٰ قسم کی ہے اور اسکی پذیرائی کائنات کے اعلیٰ طبقات ہی کرسکتے ہیں - میر درد کی طرح عشق، شانتی، مذہب، بے تعلقی کے اعلیٰ بنیادات وہ بھی مستور کائنات سے حاصل کرتے ہیں - انکا رنگ رنج و غم میں نمایاں ہے - وہ اپنے طرز میں نقائص سے معرّا اور اس خود تراشیدہ راہ پر بے خوف چلنے والے نظر آتے ہیں - اُنکا کلام قوتِ بیانیہ سے مملو نظر آتا ہے اور استعارات و تشبیہات سے بھی مالا مال ہے - انکی شاعری ہر قوم و ملت کی شاعری ہے - خاص قسم کی ہر دلعزیزی انکو حاصل ہے کیونکہ بالعموم وہ وہی خیالات پیش کرتے ہیں جن سے عام قلوب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے - [1]

شاد، جن کی موت کو ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے، وہ گزشتہ عظمت و جلال اور تمدن و تہذیب کی آخری کڑی تھے - وہ گزشتہ نسل بزرگ کے آخری رہبر تھے - اور افسوس یہ ہے کہ وہ اب نہیں ہیں جبکہ اُنکی سب سے زیادہ احتیاج تھی - آج سے ۴۰ سال پہلے میری اُنکی پہلی ملاقات ہوئی تھی - وہ سماں اب تک میری آنکھوں میں محفوظ ہے - اُسوقت وہ فلکِ ادب پر مشہور ہو رہے تھے - یقیناً وہ اُن متقدمین کے حلقہ میں سے تھے جنکو آسانی سے ایامِ پارینہ کے ادبی مراکز سے تعبیر کرسکتے ہیں - شاد کی قابلِ لحاظ ادبی صحبتوں میں اُنکی شاعری کا عنصر نمایاں ہوتا تھا اور اس دور میں بہت کامیاب نظمیں بھی شاد کی سننے میں آئی ہیں اور وہ لطیف نظمیں اب بھی میرے حافظہ میں محفوظ ہیں - شاد کا تخیل مجھ کو بہت دُور لے جاتا ہے - وہ اُنکا پستہ قد، تیز متجسس آنکھیں، اُنکی بدیہہ گوئی، اُنکی حاضر جوابی، اُنکی غیر معمولی بہادری، صداقت، اور اعلیٰ خود اعتمادی، اُنکی ظرافت، سنجیدگی کی خصوصیات اب بھی مجھ کو یاد ہیں - اور اُسی دور میں میں نے فرنگی محل کے مشہور عالم باعمل مولانا عبدالحی کی بھی زیارت کی تھی - اور خاتم المصنفین علامہ شبلی نعمانی کی بھی زیارت میں نے اسی احول میں کی تھی - کیونکہ اُس دور میں پٹنہ یادش بخیر سیاسی مرکز تو نہ تھا، لیکن ادبی حیثیت سے اس کا درجہ معاصر شہروں میں بہت ممتاز تھا - (باقی)

---

[1] فریاد کی شاعری کے متعلق مقالہ نگار کا یہ تبصرہ حسن ظن پر مبنی ہے - انکی شاعری کسی حد تک ضرور درد کے اتباع میں ہے لیکن جو تعریف مقالہ نگار نے کی ہے وہ بے خوف تردید مبالغہ کہی جاسکتی ہے - ممکن ہے صوبجاتی شاعر کی حیثیت سے فریاد ممتاز ہوں لیکن بین الہند حیثیت سے وہ طبقۂ سوم کے شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں - ناظر

سودیشی چائے کا ایک گھونٹ

(مسٹر غلام احمد علوی فرقت۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ حقیقت لکھنؤ)

نمائش ۴ بجے سے شروع ہوتی تھی لیکن ہم پہونچے کب ½۵ بجے۔ اس حساب سے ہم کو پورے ½۱ گھنٹے کی تاخیر ہوگئی اور ٹھیک چراغ جلے ہم نمائش گاہ میں داخل ہوئے۔ اس سے قبل کبھی سودیشی نمائش دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، پہلی بار ہر نئی چیز دیکھنے کا اشتیاق ایک فطری بات ہے مگر ہمیں ہماری فطرت سے زیادہ نمائش دیکھنے کا اشتیاق تھا۔

ٹکٹ خریدنے کے بعد جوں ہی ہم نے نمائش گاہ کے پھاٹک میں قدم رکھا دو گاڑھے کے پُلندوں نے بہ زبان سودیشی کہا "وہروانی کرکے دوسری طرف سے آئیے" ہم نے ان بولی بولنے والوں پر جو نظر ڈالی تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ پُلندوں میں سے یہ آواز کسی خاص قانون قدرت کے ماتحت باہر نکل رہی ہے جو خاص کھدر کے ہیں۔ بعد میں جب ان پُلندوں کی وجہ تسمیہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ یہ کانگریسی والنٹیر ہیں جو کھدر کے سردی پروف کوٹ زیب تن کیے ہیں۔ اس کوٹ کی جسکا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے قطع و برید اس طرح پر ہوئی تھی کہ ان میں صرف سانس لینے اور بولنے کے دو راستے بنا دیے گئے تھے۔ شاید ایک راستہ اوپر کی جانب اور تھا جس سے بوقت ضرورت دیکھ بھی لیا جاتا تھا۔ بہرحال "وہروانی" کرکے ہم دوسرے راستے سے جو چند بَلیوں کی مدد سے پھاٹک کے اندر ہی بنالیا گیا تھا، نمائش گاہ میں داخل ہوئے۔ یہاں پہونچکر ہمارے منہ سے نکلا سبحان تیری قدرت۔ اور ایسا معلوم ہوا جیسے سودیشی طریقہ پر بازار مصر میں ہم فروخت کرنے کی غرض سے لائے گئے ہیں، یا ہم اور ایک ہمارے کرم فرما جو غالباً اپنی بیکاری رفع کرنے کے لیے پھاٹک میں داخل ہوتے وقت ہمارے رفیق سیر بن گئے تھے ایک ایسے ملک میں پہونچ گئے ہیں جہاں صرف عورتوں کی حکومت ہے، اور مرد وہاں سوائے اُنکو گھورنے کے اور کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ غرض یہ دیکھ کر ہماری اور ہمارے کرم فرما کی باچھیں ایک ساتھ کھل کر دونوں کانوں سے جا ملیں۔ آگے بڑھے تو ایک صابن کی دکان سے آواز آئی "شودیشی شابن یہاں وکتا ہے" پچھلے تجربہ کے بعد جب ہم نے یہ سنا تو ہم کو خیال گزرا کہ اُردو زبان میں سودیشی طریقے پر کچھ قطع برید منظور ہوئی ہے اور گاندھی جی نے بڑے شین کی بزرگی کو برقرار رکھتے ہوئے 'س' اور 'ص' کو 'الف بے' کی فہرست سے خارج کرکے اور 'ب' کو 'و' سے بدل کر سودیشی زبان تیار کردی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر طرف سے شین شین کی پکار پڑی ہے۔ چنانچہ بعد کو جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے ہمارا

قیاس یقین کی حد تک پہونچ گیا۔ صابن اور "کھجلی" دور کرنے والے صابن کا دو چار جگہ معائنہ کرنے کے بعد ہم نے
دیکھا کہ ہر طرف زرق برق قسم کی عورتوں کی اس قدر کثرت ہے کہ خود جانا تو درکنار، نظر کو بہت سی رکاوٹوں کا
سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلے اخلاقاً کچھ توقف کیا، لیکن جب یہ معلوم
ہو گیا کہ یہاں اخلاق والے کچھ نہیں دیکھ پاتے تو مجبوراً بد اخلاقی کے زریں اصولوں پر کاربند ہونا پڑا۔
اور اس قیاس آرائی میں واقعی ہم بالکل ٹھیک اُترے۔ سب سے عجیب چیز جو نمائش گاہ میں ہم کو نظر
آئی وہ بقول ایک دوکاندار کے "سُودیشی سوئی میں دھاگا ڈالنے والا شین تھا" (سودیشی سوئی میں تاگا
ڈالنے والی مشین) یہ شین ہم کو بہت پسند آئی۔ ہم نے ٹکسال باہر والی کھوٹی اکنی جسکے چلانے کی ہم کو عرصے سے
فکر تھی، بیچنے والے کی گولک میں ڈال کر "سُودیشی سوئی میں دھاگا ڈالنے والا شین" خرید لیا اور آگے بڑھے۔
نمائش میں اشتہارات بلا وجہ بہت تقسیم ہو رہے تھے اس لیے ہمارے دونوں ہاتھ آدھ آدھ پاؤ ردی سے
گھرے تھے۔ دو چار دوکانوں کا معائنہ کرنے کے بعد اور مختلف دوکانوں سے سودیشی الائچی کے نمونے چکھنے
کے بعد ہم نے دیکھا کہ ایک جگہ بقول شخصے "سُودیشی" قسم کا سفوف بک رہا ہے۔ اس سفوف سے میلے سے
میلا کپڑا چشم زدن میں صاف ہو جاتا تھا۔ صاحبِ معاملہ کو اس بات کا دعویٰ تھا کہ وہ میلے سے میلا کپڑا
لیجانے پر سب کے سامنے محض تجربہ کے طور پر صاف کرکے حوالے کر دیتے تھے۔ ہم نے موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے
ہوئے اپنے کرم فرما کا کوٹ دکھایا جو اُتنا ہی کثیف تھا جتنا سڑک کوٹنے والے انجن ڈرائیور کا کوٹ ہو سکتا
ہے۔ اور کہا "کیوں جناب آپ اس کوٹ کو بھی صاف کر سکتے ہیں" اس پر صاحب معاملہ غصہ میں آکر
بولے "ارے صاحب اِس سے زیادہ گندے کوٹ ہم صاف کر چکے ہیں" اس سے ہمارے ساتھی کو کچھ
خفت تو ضرور ہوئی تاہم ہم نے ایک ادنیٰ سی جنبش سے وہ کوٹ اُتارا جو ہمارے کرم فرما کے جسم مبارک پر محض
ایک ٹوٹے بٹن کے سہارے لٹکا ہوا تھا، اور صاحب معاملہ کے طشت میں ڈال دیا، جس میں سفوف اور
گرم پانی ڈالا جا چکا تھا۔ اور کہا "اچھا اسکو صاف کیجیے"۔

ہماری خفت اور شرمندگی کی اُس وقت کوئی حد و انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ کوٹ اُترنے کے
بعد ہمارے کرم فرما نصف مادرزاد ہو کر رہ گئے۔ اور دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر سردی سے کٹکٹاتے ہوئے
دانتوں سے ہم سے کہہ رہے تھے "یہ ... کا ... کا ... یا ... کیا"؟ ہم نے اُنکے سوال کا کوئی جواب دیتے
ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں، کوٹ صاف ہو رہا ہے" یہ کہکر ہم اس طرح دوسری طرف چل دیئے جیسے کوئی ہم کو
بُلا رہا ہے۔ اور ایک بھیڑ میں مل کر دور سے تماشا دیکھنے لگے کہ اب کیا ہوتا ہے۔
انکا نیا سودا کہیے، ہمارے ملاقاتی غریب کو دسمبر کی شدید سردی میں مسلسل دس منٹ تک اس

دوکان پر عریانی کا مظاہرہ کرنا پڑا - کوٹ کئی بار سنوف میں ڈالنے کے بعد صاف ہو کر ہمارے کرمفرما کے حوالے کیا گیا تو وہ سُوسُو کرتے دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈالے ہماری جستجو میں آتے نظر آئے - یہ دیکھ کر ہم سخت پریشان ہوے کہ اب اس بلاے بے درماں کو نمایش میں لیے لیے ہم کہاں کہاں پھریں گے، اور ہم دوسری طرف چلدیے — کرمفرما کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اب ہم کو یہ فکر ہوئی کہ کوئی ساتھی ہوتا — ہم اسی فکر میں تھے کہ ہمارے چار کالج کے پرانے ساتھی مل گئے - اُنکے ساتھ ہم نے ایک طرف چلنے کا قصد کیا ہی تھا کہ دیکھا دُور پر ایک صاحب اشارہ سے بُلا رہے ہیں - قریب پہونچے تو کرسیوں پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا گیا چار پیالیاں چاے کی (جو خدا اب نہ پلائے) پیش کی گئیں - چاے پینے کے بعد ہم کو یقین ہوگیا کہ اس میں شکر کے بجاے برسوں کا پرانا شیرہ ملاکر دودھ کی جگہ چونا گھول دیا گیا ہے - ہم نے ایک گھونٹ پینے کے بعد بہت زور سے "آق تھو" کی کہ تمام چھینٹیں پلانے والے کے مُنہ پر پڑیں - اس پر فریق ثانی نے رومال سے اپنا مُنہ پونچھتے ہوے ہم سے دریافت کیا کہ طبیعت کیسی ہے؟ ہم نے دو چار متواتر چھینکیں لیکر کہا "بحمداللہ زندہ ہوں" اور اپنے چاروں ساتھیوں پر نظر کی کہ ان میں سے کوئی سودیشی چاے کی نذر تو نہیں ہوگیا - اس سے اطمینان کرنے کے بعد ہم نے ایک زور کی سانس لی اور اُٹھ کھڑے ہوے - البتہ اس سودیشی چاے کے ایک گھونٹ میں ہمارا قریب نصف گھنٹہ کے صرف ہوا اور جب ہم یہاں سے اُٹھے ہیں تو طبیعت کی بحالی اُس گھونٹ کی نذر ہوچکی تھی - آگے بڑھ کر کیا دیکھا کہ ایک سودیشی مادر زاد شاعر ایک دوکان پر بیٹھا سودیشی برتن فروخت کر رہا ہے - علیک سلیک کے بعد قیمت دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ایک معمولی سودیشی ٹین کی تشتری کی قیمت مبلغ چار روپیہ للعٰہ ہے - ہم نے متانت سے پوچھا "ٹکسال باہر والے سودیشی سکے نہ؟" جواب ملا کہ آپ "ہنشی" کرتے ہیں واہ "شاحب" واہ"- ادھر سے ہم نے دوسری طرف رُخ کیا تو ایک سودیشی کھمبا نظر آیا جس پر شروع سے آخر تک بہ زبان سودیشی کھمبے کی سوانحعمری لکھی ہوئی تھی کہ فلاں فلاں موقع پر فلاں فلاں دفعات کے ماتحت کھمبا فلاں جگہ سے فلاں جگہ اُکھاڑ کر لگایا گیا اور پھر فلاں دفعہ کے ماتحت فلاں فلاں جگہ پھرایا گیا - اسکے بعد دوسری چند دوکانیں جو دیکھنے کو رہ گئی تھیں اُن پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم ٹھیک دس بجے گھر واپس آئے - سودیشی چاے کا گھونٹ ہم کو اب تک یاد ہے -

---

جھٹپٹے کے تاثرات

(جناب منشی شبیر حسن خاں صاحب جوشؔ ملیح آبادی)

ہوائے شام جب بھرتی ہے ٹھنڈی سانس صحرا میں
مجھے ہر ایک پتّی نوحہ خواں معلوم ہوتی ہے

فضائے تیرہ پر جس وقت چھا جاتا ہے سنّاٹا
مجھے جنبش میں ذرّوں کی زباں معلوم ہوتی ہے

شفق کے ہر نفس اُڑتے ہوئے اوراقِ سوزاں میں
مجھے بیتابیِ عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

زمین و آسماں جب ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں
حیاتِ نوعِ انساں رائیگاں معلوم ہوتی ہے

بلند و پست و آب و رنگ، جب کچھ بھی نہیں رہتا
یہ دنیا صرف اک وہم و گماں معلوم ہوتی ہے

کھٹکتی ہے مزے سے جب گھنے جنگل کے سائے میں
ہوائے سرد میری ہم زباں معلوم ہوتی ہے

ٹپک پڑتا ہے آنسو کی طرح جب مہرِ گردوں سے
لبِ جاں پر صدائے الاماں معلوم ہوتی ہے

دلِ وادی سے اُٹھتا ہے دھواں جس وقت ہلکا سا
پہاڑوں کی بلندی سرگراں معلوم ہوتی ہے

چھپا لیتی ہے خشک و تر کو جب شام اپنے دامن میں
بشر سے روحِ عالم سرگراں معلوم ہوتی ہے

دِیا، کچھ فاصلے پر ٹمٹما اُٹھتا ہے جب بن میں
سیاہی، روشنی کی رازداں معلوم ہوتی ہے

جھلک اُٹھتا ہے جب پہلا ستارا بامِ گردوں پر
کلیجے پر مجھے نوکِ سناں معلوم ہوتی ہے

فلک کے ہات سے جب پرچمِ زر چھوٹ جاتا ہے
زمیں اک کشتیِ بے بادباں معلوم ہوتی ہے

فرازِ چرخ پر رہ رہ کے جب کوندا لپکتا ہے
اُداسی کارواں در کارواں معلوم ہوتی ہے

کلی کے مسکراتے ہی، حیات و موت میں مجھکو
فقط لے دے کے اک ترتیبِ میاں معلوم ہوتی ہے

سبک پودوں کی میداں میں لچک جاتی ہیں جب شاخیں
کسی کی یاد دل میں پرفشاں معلوم ہوتی ہے

گھنیرے باغ میں جس وقت دونوں وقت ملتے ہیں
کوئی شے مجھکو سینے میں تپاں معلوم ہوتی ہے

شفق کو دیکھتے ہی وہ محبت جسکو جُگ بیتا
مرے دُکھتے ہوئے دل میں جواں معلوم ہوتی ہے

رتیلی ڈھال پر انگڑائی لیتا ہے اک افسانہ
ندی کے موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے

یہ بیداری کہ جس پر ناز ہے اربابِ دانش کو
مجھے تو جوشؔ اک خوابِ گراں معلوم ہوتی ہے

اسلام ماضی و حال

(جناب آبر احسنی گنوری)

اسلام اولیں اے سرچشمۂ ہدایت
تو تھا خدا کی رحمت تجھ پر خدا کی رحمت

دنیا کو تھا سہارا صرف ایک تیرے دم کا
تاریک وادیوں میں تو نور بن کے چمکا

جب کفر کا جہاں میں دریا اُبل رہا تھا
حق آ کے صرف تیرے دامن میں پل رہا تھا

معجز بیانیوں سے لیٹی جہاں کی کایا
باطل کے خرمنوں پر تو برق بن کے چمکا

رنگینیوں نے تیری رنگ دوئی مٹا کر
جوڑے ذلیل بندے اللہ سے ملا کر

سادہ چٹائیوں پر سوتے تھے تیرے سلطاں
آرائشیں ہزاروں اس سادگی پہ قرباں

رنگیں نوائیوں پر بچھ بچھ گیا زمانہ
تو سرمدی ترنم تو قدرتی ترانہ

ظاہر ہوا تجھی سے انساں پہ زورِ انساں
دنیا تھی جن اُتوں پر تیری ہی لب بدنداں

گلشن سے بڑھ کے چھایا پُرخار جھاڑیوں پر
ترا جو وادیوں سے چمکا پہاڑیوں پر

تھی جنگ میں بھی طاعت وہ تیرے غازیوں کی
تکبیر گونجتی تھی صف سے نمازیوں کی

تاریکیوں سے سارا عالم ہوا تھا سونا
یعنی ہر ایک ذرہ تھا طور کا نمونا

ادیان کا سبق تھے بھولا ہوا فسانہ
نقشِ قدم پہ تیرے چلتا تھا سب زمانہ

جڑ رہ گئی تھی گویا ذموسیت کی کٹ کر
تجھ میں ہی آ گئی تھیں سب خوبیاں سمٹ کر

دعوے برابری کے رکھتا تھا ہر مسلماں
اک اونٹ پر رواں تھے باہم غلام و سلطاں

برپا کیا تغیر دنیا کی حالتوں میں
اک آگ سی لگا دی تو نے جہالتوں میں

تو نے ہی مسخ کی تھی حیوانیت کی صورت
سیکھی ہر آدمی نے تجھ سے ہی آدمیت

حق بات پر وہ تیرے شیدائیوں کا اڑنا
جانوں پہ کھیل جانا شعلوں میں کود پڑنا

باطل نوازیوں پر ڈٹ جائے غیر ممکن
راہوں سے تیری کوئی ہٹ جائے غیر ممکن

تیری پناہ میں سب رومی ہوں یا کہ شامی
تو بیکسوں کا والی تو غمزدوں کا حامی

قائم کیے وہ تو نے معصومیت کے رشتے
انسان رہ گئے تھے بن بن کے سب فرشتے

تو کام کر رہا تھا جس وقت فرشیوں میں
اُن کی ریاضتوں کے چرچے تھے عرشیوں میں

انصاف آ کے تیرے قدموں کو چومتا تھا
وہ لاش پر بھی ڈرتے۔ وہ لاڈلا عمرؓ کا

نظر دل میں گھومتی ہے تیری وہ پیاری صورت
تھا جا کے سرے پا اِک تو پیکرِ محبت

اللہ اب یہ عالمِ مسلم کی خودسری کا
جیسے کبھی جہاں میں اسلام ہی نہیں تھا

ذلت کی وادیوں میں غفلت سے سو گیا ہے
مرکز سے اپنے ہٹ کر ظلمت میں کھو گیا ہے

تا اہلِ مسلموں کے دل سے حجاب اُٹھا جا
اسلام پر اولیں آ مسلم انھیں بنا جا

نغموں کو تیرے سن کر سب جھوم جائے خلقت
پھر بج اُسی ادا سے بشدّ سازِ فطرت

سلام

(مسٹر علی رضا خاں رضا اٹاوی۔ غازی آباد)

بھری رن میں پڑی ہے لاش سرور دھوپ میں
ہائے یوں مرجھائے زہراؑ کا گلِ تر دھوپ میں

بے کفن دیکھا جو لاشہ سرورِ کونین کا
سایہ افگن ہو گئے جبریل کے پر دھوپ میں

خیمۂ آلِ محمدؐ میں قیامت آ گئی
نیزۂ خولی پہ چمکا شہ کا جب سر دھوپ میں

عصر کا ہنگام تھا مصروفِ سجدہ تھے حسینؑ
عین سجدے میں نمازی کا کٹا سر دھوپ میں

اے علی اکبرؑ اُٹھو زینبؑ کو پردے میں کرو
بنتِ حیدرؑ آ گئی خیمے سے باہر دھوپ میں

ڈھانپتی ہے خاک اُڑ اُڑ کر شہیدوں کے بدن
بیکسوں پر کون ڈالے آ کے چادر دھوپ میں

چھپ گیا پھر فلک تھرا گیا عرشِ بریں
سر سے جب کھینچی گئی زینب کے چادر دھوپ میں

پیاس سے یوں خشک تھی معصوم اصغرؑ کی زباں
سوکھ جائے جس طرح برگِ گلِ تر دھوپ میں

اے قیامت چھپ کے بیٹھی تھی کہاں عاشور کو
شمر نے چھینی تھی جب زینبؑ کی چادر دھوپ میں

پیاس کا سرور کی کتنا پاس تھا عباسؑ کو
آج تک لیٹے ہیں دریا کے برابر دھوپ میں

جذبۂ غیرت ترا کیا ہو گیا آبِ فرات
تین دن پیاسی رہی آلِ پیمبرؐ دھوپ میں

اے رضاؔ بے چین ہو جاتی تھیں بنتِ مصطفےٰ
جب نکلتے تھے کبھی شبیرؑ و شبرؑ دھوپ میں

حضرت عباسؓ

ساقی نامہ کا آخری ٹکڑا محل جنگ ہے

(از جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی)

یہ چند بند ایک نو تصنیف مرثیہ کے ہیں، جس میں ڈیڑھ سو سے زائد بند ہیں۔ مرثیہ کے متعدد اجزا لکھنؤ اور بیرون جات کی مختلف مجلسوں میں پڑھے جا چکے ہیں اور بقیہ کے لیے دور دراز مقامات سے حکیم صاحب مدعو ہیں۔ ہمارا یہ حصہ کسی مجلس میں پڑھنے کے بعد انشاء اللہ آیندہ نذر ناظرین ہوگا۔ ایڈیٹر

ساقی سمجھ لیا کہ یہ ہے کون گلعذار   زخمی لبِ فرات کھڑا ہے جو جاں نثار
کیا میں تجھے بتاؤں یہ کس کی ہے یادگار   تیرا ہی لختِ دل تو ہے عباسؑ نامدار
پہچان لے کہ دھوپ سے تو سنولا گیا ہے آج
وہ پیاس ہے کہ پیاس سے سوکھا گیا ہے آج

ذرہ جو دشت کا ہے وہ شرارہ ہے آگ کا   جو ڈھیر خاک کا ہے وہ تودا ہے آگ کا
سیلاب دوڑتا نظر آتا ہے آگ کا   صحرا تمام آگ کا دریا ہے آگ کا
چھٹکتی ہے برق آگ لگی ہے سحاب میں
شعلوں کی جا رہی ہے ایک آفتاب میں

تیور رہا ہے اپنے ہی شعلوں سے آفتاب   دیتا ہے اپنی آپ دہائی خود التہاب
اک آتشیں کرہ ہے کہ پانی پہ ہے حباب   ہے انقلابِ طبع سے عالم میں انقلاب
شعلے بھڑک کے دامن صحرا جلاتے ہیں
چاروں طرف سے آگ کے طوفان آتے ہیں

لو دے رہے ہیں زخم دھواں بن گیا ہے خون   جوشِ وغا میں غیظ سے کیا کیا جلا ہے خون
حدت وہ ہے کہ برق سے بھی کچھ سوا ہے خون   چہرہ سفید ہو گیا اتنا بہا ہے خون
دامن سے پاک اُس رخِ زیبا کی گرد کر
یہ آگ سلسبیل کے چھینٹوں سے سرد کر

اس کے سوا ہے کون سہارا حسینؑ کا بس اب یہی ہے چاہنے والا حسینؑ کا
کنبہ ہے تین دن سے جو پیاسا حسینؑ کا آیا ہے بن کے نہر پہ سقا حسینؑ کا
تیرے لیے بھرے ہوں جو ساغر انڈیل دے
بِلّہ اس کی مشک میں کوثر انڈیل دے

اب خونِ دل پیوں گا کہاں کی شراب ناب اب تو یہی خوشی ہے کہ ہو جائے دل کباب
مے ہو گی خاک باعثِ تسکین اضطراب طبقے پلٹ رہے ہیں وہ آیا ہے انقلاب
انصاف کے گلے پہ چھری پھرنے والی ہے
بجلی ستم کی ٹوٹ کے پھر گرنے والی ہے

پھر آ گئی سمٹ کے سپاہِ ستم شعار فوجوں سے پھر چھلک گیا میدان کارزار
پھر ہیں کہیں فرات پہ سو اور کہیں ہزار میکش نثار اے مرے عباسؑ ہوشیار
زخمی سمجھ کے برچھیوں والے نہ گھیر لیں
ڈرتا ہوں دشمنوں کے رسالے نہ گھیر لیں

پیکاں چلے ہیں جو رکے دنیا سے ہوشیار ہاتھوں سے سرے سینۂ زیبا سے ہوشیار
عباسؑ اپنے دل کی تمنا سے ہوشیار مشکِ سکینہؑ ساتھ ہے اعدا سے ہوشیار
تیغیں ہیں برچھیاں ہیں سنانیں ہیں ہر طرف
ہاتھوں میں دشمنوں کے کمانیں ہیں ہر طرف

دی خوب دادِ جنگ طبیعت سنبھل گئی دشمن سے نہر چھین لی حسرت نکل گئی
افسوس مشک بھرتے ہی قسمت بدل گئی پھر دشمنوں سے نہر پہ تلوار چل گئی
زخمی جو شیر ہے تو زمیں تھرتھراتی ہے
اُڑتا ہے خوں ہوا میں جو تلوار جاتی ہے

خوں سے زمیں ہے سرخ ہوا سرخ آب سرخ اک ایک موج سرخ ہے چترِ حباب سرخ
سب کائنات سرخ مہ و آفتاب سرخ یہ سب تو خیر، خود نظرِ احتساب سرخ
وہ بحرِ خوں رواں ہے کنارا نہیں کہیں
رن بولتا ہے آج سہارا نہیں کہیں

زخمی اسد کو چھیڑ دیا قہر ہو گیا رگ رگ میں تاؤ کھا کے لہو زہر ہو گیا

دریا رواں لہو کا لب نہر ہو گیا — وہ رن پڑا کہ نقش فنا دہر ہو گیا

دوش ہوا پہ سر بھی ہیں لاشے بھی خون بھی
ڈرے فضا کو ہے حرکت بھی سکون بھی

تلوار ہے کہ صاعقۂ برق طور ہے — جس سے ملی وہ جامۂ ہستی سے دور ہے
اللہ رے اقتدار یہ شانِ غرور ہے — اک اک سے کہہ رہی ہے کہ مرنا ضرور ہے

میں ہوں عدو ہے رن ہے ترائی ہے شیر ہے
ملتی ہے آسماں سے زمیں تھوڑی دیر ہے

تو شرط ہے کہ عرش کے تارے نہ توڑ دوں — اس چرخ نیلگوں کے کنارے نہ توڑ دوں
فوجوں کے دل یہ سارے کے سارے نہ توڑ دوں — تم پر تمہارے ظلم کے آرے نہ توڑ دوں

دشمن پہ آ چلی ہے تباہی ترے نثار
زخموں سے چور بانکے سپاہی ترے نثار

جتنا ادھر سوا نظر آتا ہے اہتمام — بڑھتا ہے اور دل میں ادھر جوش انتقام
دشمن نے خاندان رسالت کیا تمام — بس ایک میں ہوں اک علی اکبرؓ ہے اک امام

یہ بھیڑ کچھ تو چھانٹ دوں اکبرؓ کے واسطے
فوجیں کچھ اور کاٹ دوں اکبرؓ کے واسطے

اُن کو بڑا غرور ہے کثرت پہ ناز ہے — آپس میں مشورے ہیں ہم ساز باز ہے
یہ ان کو کیا خبر کہ خدا کا رساز ہے — اولاد مرتضیٰؓ کو بڑا امتیاز ہے

تو شرط ہے کہ جور کی دنیا الٹ نہ دوں
کوفہ پہ شام، شام پہ کوفہ الٹ نہ دوں

غزل شیخ بنّے میاں صاحب جوہر چاندوڑی

کہاں تیری جفا نے مار ڈالا — مجھے میری وفا نے مار ڈالا
عدو پر رات دن تیرا کرم ہے — تری طرز وفا نے مار ڈالا
زمانہ مٹ گیا تیری ادا پر — بہانا ہے قضا نے مار ڈالا
جدھر اٹھی کیا اک حشر برپا — نگاہ فتنہ زا نے مار ڈالا
کسی پہلو نہیں آرام دل کو — زمانے کی ہوا نے مار ڈالا

انتخاب مشاعرۂ غازی آباد

مصرعۂ طرح - تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

منشی کالی چرن صاحب اخگر دہلوی

تفس میں پھیر دیتا ہے چھری صیاد گردن پر — پھڑکتے ہیں کبھی اُڑنے کو جب سوئے نشیمن پر
نہ مرنا جیتے جی ہرگز نہ کرنا خونِ خودداری — نہ رکھنا بھول کر بھی بارِ احساں اپنی گردن پر
نگاہِ سیر بیں پہونچی نہیں اس راز تک ورنہ — بہارِ بوستاں بن کر خزاں چھائی ہے گلشن پر

جناب ارمان میرٹھی

ذرا سی بات ہے محشر میں جسکا ہو گیا چرچا — یہی دو چار دھبے خون کے ہیں اُنکے دامن پر
مٹاتے ہیں بگولے روز اُٹھ اُٹھ کر مری تربت — مری مٹی بھی شاید بار ہے صحرا کے دامن پر

جناب اظہر

نہ جانے کس بلا کی ہے کشش ان چار تنکوں میں — نظر صیاد کی ہر وقت رہتی ہے نشیمن پر
یہ کیا کم ہے کرم صیاد کا اتنی اجازت ہو — نگاہیں میں قفس سے ڈال لیتا ہوں نشیمن پر
قفس میں اور مجھ کو مری قسمت نہ سنوائے — یہ کیسی روشنی یارب ہوئی شاخِ نشیمن پر

عبد الرحمٰن صاحب برق غازی آبادی

جسے دامِ رگِ گل سے کیا تعبیر انساں نے — خطِ طغرا میں ہے حمدِ خدا ہر گُل کے دامن پر

ہرنام داس صاحب جوہر دہلوی

بہاریں چار دن کی چاندنی ہیں آتی جاتی ہیں — رہیں گی تا بکے اٹکھیلیاں بلبل کی گلشن پر

عبد الحمید صاحب حمید میرٹھی

یہی دو چار تنکے خانہ بربادی کا باعث ہیں — نہ یہ ہوتے نہ آتیں آفتیں میرے نشیمن پر

مشتاق احمد صاحب شائق صہبائی میرٹھی

نویدِ زندگی دے کوئی اجزائے پریشاں کو — وہ پھر فاتحہ آج آئے ہیں میرے مدفن پر

منشی چندی پرشاد صاحب شیدا دہلوی

نظر موسیٰ کی کیا پڑتی جمالِ برقِ ایمن پر — تجلی ریزیوں کی تھی نقاب اُس روئے روشن پر

پشیمانی سے اشکِ خوں نہیں نکلے سرِ محشر — سمٹ کر آ گیا گلزارِ جنت میرے دامن پر
سمجھ تو لے ذرا پہلے عقیدت کیشیاں اسکی — جہالت سے ہوا کیوں شیخ خندہ زن برہمن پر

جناب صافی میرٹھی

الٰہی خیر گلشن میں کہیں صیاد آ پہونچا — نظر پڑتی ہے کس کی برق بن بن کر نشیمن پر
فنا کے بعد چمکی ہے دلِ پر داغ کی قسمت — چڑھانے آئے وہ پھولوں کی چادر میرے مدفن پر

علی رضا صاحب رضا اٹاوی

نہ پوچھو حالِ دل اس سے جو ہنگام اسیری بھی — نگاہیں چپکے چپکے ڈال لیتا ہو نشیمن پر
جفاؤں پر وہ اپنی ڈالتے ہیں اس طرح پردہ — چڑھانے آتے ہیں پھولوں کی چادر میرے مدفن پر

بابو لال صاحب غافل سکندر آبادی

اُنھیں مشقِ ستم کا جب زمانہ یاد آتا ہے — گھڑی بھر کے لیے آ بیٹھتے ہیں میرے مدفن پر

جناب کامل

شفق تم جسکو کہتے ہو مرا خونِ تمنا ہے — رہیگا حشر تک یہ مدعی گردوں کی گردن پر

حکیم عبد الغنی صاحب مسیح غازی آباد

ہزاروں چاندنی راتوں کو رونے کا نتیجہ ہے — وہ آنسو جو ستارا بنکے چمکا اُنکے دامن پر
کہیں اشکِ ندامت زندہ کر سکتا ہے عاشق کو — کھڑے رویا کریں وہ عمر بھر اب میرے مدفن پر
زمیں ٹھرا رہی ہے جذبے سے گورِ غریباں کی — وہ جب سے نام اپنا لکھ گئے ہیں میرے مدفن پر

ڈاکٹر سرداری لال صاحب نشتر میرٹھی

یہ منظر کیا قیامت ڈھائیگا یارانِ گلشن پر — نشیمن میں ہوں میں بجلی چمکتی ہے نشیمن پر
کیا بعد فنا یہ اور اک اندھیر دنیا نے — مجھے مدفن میں رکھکر شمع رکھدی میرے مدفن پر
فلک بھی پھول برساتا ہے مجھپر لے تری قدرت — ستارے ٹوٹ کر گرتے ہیں اکثر میرے مدفن پر
جلائی شمع بھی تم نے تو مجھکو فائدہ کیا ہے — اُجالا شمع کا ہوتا ہے مدفن میں کہ مدفن پر

ہرلش چند مظاہری غازی آباد

بڑھایا دل کو قاتل کے ہری کہ کرکے یہ کہنے — "تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر"

لا اعلم

چمن والو ذرا تم یہ فریب برق تو دیکھو — کہ کوندے آسماں پر اور گرے میرے نشیمن پر

ہندو مسلمانوں میں اتحاد کیونکر ہو سکتا ہے؟

کانپور کی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشیں

(سلسلہ ماہ فروری)

از ظفر الملک

تیسری اختلافی یادداشت راقم الحروف کی تھی۔

رپورٹ کے حصۂ اول یعنی تاریخی بیان کے بعض اجزا کے متعلق اختلاف کا اظہار حواشی میں کر دیا گیا تھا جو اصل رپورٹ کے ساتھ ہی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ انشاءاللہ مناسب موقع پر اس تاریخی بیان کے وہ ضروری حصے بھی شایع کیے جا سکیں گے جو ملامت کی زد میں نہیں آتے۔

رپورٹ کے حصہ دوم یعنی حادثۂ کانپور کے حالات سے کسی قسم کا اختلاف کرنے کی ضرورت نہ تھی اگر ایک نہایت ہی ناگوار واقعہ نہ پیش آ جاتا۔ رپورٹ کی ترتیب بنارس میں ہوئی۔ اور اس سلسلہ میں چند بار وہاں جانا اور کئی کئی دن قیام کرنا پڑا۔ تقسیم کار کے اصول پر رپورٹ کے مختلف اجزا کی تسوید جدا جدا ارکین سے متعلق تھی۔ جب کامل مسودہ تیار ہو گیا تو کمیٹی کے جملہ اراکین نے بشمول صدر و معتمد سارے مسودہ پر غور و بحث کر کے مناسب ترمیمات و تغیرات کے بعد اُسے منظور کیا۔ جو اراکین کسی جزو سے اسکے بعد بھی اتفاق نہ کر سکے اُن کو اپنی یادداشتوں کے ذریعہ اختلاف کے اظہار کا موقع تھا۔

حادثۂ کانپور کے حالات کے باب میں عام طور سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ البتہ ایک جزو ایسا تھا جس کے متعلق ایک رکن کا خیال تھا کہ رپورٹ میں اس کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بات یہ تھی کہ جن اصحاب نے کمیٹی کے استفسارات کے تحریری جوابات ارسال کیے اور کمیٹی کے روبرو شہادتیں دیں عام طور پر اُن سب کی شہادتیں برسرعام لی گئی تھیں۔ صرف کانپور کی کانگرس کمیٹی کے اراکین کے بیانات علٰحدہ بصیغۂ راز لیے گئے۔ اور پنڈت گنیش شنکر ودیارتھی کے واقعہ قتل سے متعلق بھی بعض بیانات صیغۂ راز میں لینا پڑے تھے، اس لیے کہ شہادت دینے والے اجلاس عام میں بیان دینے کے لیے آمادہ نہ ہوے اور کمیٹی یہ چاہتی تھی کہ ملک کے اس مخلص اور بہادر خادم کی غمناک ہلاکت کے واقعات کی پوری طرح چھان بین کرے۔

کانپور کے کانگرسی اصحاب کے بیانات کے اقتباسات بغیر اُنکے نام ظاہر کیے ہوے رپورٹ میں

درج کیے گئے تھے۔ جنکے مطالعہ سے واضح ہوتا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے باب میں کانپور کے کانگریسی کارکنوں کے رجحانات کس قسم کے تھے۔ مگر جب ایک رکن نے اس جزو کے رپورٹ میں شامل کرنے سے اختلاف ظاہر کیا تو خیال ہوا کہ یہ حصہ خارج ہو جائے گا، لیکن جن صاحب نے یہ حصہ قلمبند کیا تھا انھوں نے باصرار کہا کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ چنانچہ جس وقت رپورٹ کا یہ حصہ زیر بحث آیا اُسوقت اختلاف کرنے والے رکن کی رائے کا احترام کرتے ہوے اُس میں مناسب ترمیمات کر دی گئیں لیکن اصل حصہ خارج نہیں ہونے پایا۔

کمیٹی کا کام ختم ہوگیا تو میں لکھنؤ چلا آیا۔ اور جن ارکین کے سپرد یہ خدمت کی گئی تھی کہ رپورٹ پر نظرثانی کر کے اُس کی عبارت کو اور چست بنادیں وہ الہ آباد تشریف لے گئے۔ الہ آباد میں جب رپورٹ مکمل طور پر تیار ہوئی تو اُس کی متعدد نقلیں کرا کے ایک نقل مجھے ارسال کی گئی اور ایک نقل جو صدر کانگرس کی خدمت میں بھیجنے کے لیے رکھی گئی تھی اس غرض کے لیے وصول ہوئی کہ اُس پر اپنے دستخط ثبت کروں۔ دستخط کرنے سے قبل اُسکی ورق گردانی کی گئی تو یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ رپورٹ سے یہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ احتجاج کرنے پر اصل مسودہ لکھنؤ آیا اور اُس میں سے یہ جزو نقل کرنے کے بعد اپنی اختلافی یادداشت میں اضافہ کرنا پڑا۔

اگر رپورٹ ضبط نہ ہو جاتی اور عام طور پر شایع ہوتی تو غالباً کانگرسی حلقوں میں میری یہ جسارت عدو روقابل سرزنش قرار پاتی۔ مگر جس کی ساری زندگی اس قسم کی غیر آئینی اور بے اصول کارروائیوں کے خلاف جنگ کرنے میں گزری ہو اُسکے لیے سوا اسکے چارہ نہ تھا کہ وہ لومتہ لائم سے بے پروا ہو کر اس ذمہ داری کو اپنے سر لے۔

رپورٹ کے حصہ سوم یعنی سفارشات سے زیادہ اختلاف کرنا پڑا۔ اختلاف کا بڑا سبب تو یہ تھا کہ حصۂ سفارشات کی تسوید اس مطمح نظر سے کی گئی تھی کہ ہندو مسلمان تمدنی حیثیت سے ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں در بظاہر میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ کہا جاتا ہے کہ ممالک متحدۂ یورپ و امریکہ میں عیسائیوں کے مختلف فرقے یا مسیحی اور یہودی باہم اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں کہ مذہبی عقائد میں اختلاف کے باوجود لباس، وضع قطع، طریقہ ماندو بود میں بظاہر کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا اور اسی کی تقلید کرنے کا خیال ہندوستان میں بھی انگریزی خواں طبقہ کے ایک گروہ میں پایا جاتا ہے۔ مگر یورپ و امریکہ میں مذہبی اختلاط جس درجہ پر پہونچ گیا اور نسل و رنگ کے امتیازات جس حد تک قائم ہوگئے ہیں اُن سے چشم پوشی کرنا قرین انصاف نہیں۔

جو لوگ اسلام کو دنیا کا آخری اور کامل ترین مذہب مانتے اور قرآن و سنت کے اتباع کو نجات اُخروی کا ذریعہ جانتے ہوں وہ کیسے اس کو قبول کر سکتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کو پس پشت ڈال دیں اور ہندو مسلمانوں کے کامل تمدنی ادغام کو منظور کر لیں۔

اس بنیادی اختلاف کا ذکر یادداشت کے شروع میں کرنے کے بعد، سفارشات ذیل سے کلاً یا جزواً

اختلاف کیا گیا :-

(۱) تمدنی و اقتصادی سفارشات کی دفعہ ۲ (صفحہ الناظر ماہ جنوری) میں مشورہ دیا گیا ہے کہ "ہولی، دیوالی، عید الفطر اور شب برات" کو "دونوں جماعتوں کے مشترک تہوار کی حیثیت دی جائے، اور نئے مشترک قومی تہوار رائج کیے جائیں"

چونکہ مذہبی امور میں "بدعت" شرعاً ممنوع ہے اس لیے اس سفارش کا جزو ابتدائی تو قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔ البتہ آخری جزو قابلِ قبول ہو سکتا ہے اگر نیا تہوار جو رائج کیا جائے اُس کے منانے کا طریقہ ایسا رکھا جائے کہ وہ ایک خالص معاشرتی تقریب رہے اور کوئی ایسی بات اُس میں داخل نہ کی جائے جو مذہبی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو۔ کیونکہ جس طور سے عموماً ہندو تہوار منائے جاتے ہیں مسلمان اُن کی پیروی سے معذور ہیں۔

بے شبہہ موجودہ طرزِ زندگی، یہاں ہندوستان میں نیز دوسرے ممالک اسلامیہ میں، عام طور پر اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہے۔ ٹھیک یہی حالت دوسرے اور پرانے مذاہب کے متبعین کی ہے کہ وہ اپنے مذاہب کی تعلیمات کے مطابق زندگی نہیں بسر کرتے۔ جسکے وجوہ ظاہر ہیں اور یہاں اُن پر بحث کی حاجت نہیں، لیکن یہ واقعہ کہ ہمارے ہاں اور انکے ہاں کا طریق کار درست نہیں ہے، غلط مشورہ دینے کی وجہ نہیں قرار پا سکتا۔

(۲) دوسرے مذاہب کی تعلیمات کے متعلق میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن اسلام کی تعلیم میرے عقیدہ میں ایسی جامع ہے کہ روزانہ زندگی کی ادنیٰ سے ادنیٰ تفصیلات پر ہمارے مذہبی احکام حاوی ہیں۔ لباس اور وضع جس کا ذکر دفعہ ۴ (صفحہ الناظر ماہ جنوری) میں ہے عام طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے —— کم سے کم آزاد خیال اصحاب تو یہی سمجھتے ہیں —— لیکن کوئی مسلمان ایسا لباس نہیں پہن سکتا اور نہ اُسے پہننا چاہیے جو اُسکے مذہبی اعمال مثلاً نماز کی ادائی میں حارج یا مانع ہو۔ اور ہر مسلمان کی وضع بھی اسلام کے پسندیدہ طریقہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس بنا پر یہ امتیاز، خواہ بدنما ہو یا نہ ہو، ترک نہیں کیا جا سکتا بلکہ قائم رکھنا لازمی ہے۔

(۳) دفعہ ۵ (صفحہ الناظر ماہ جنوری) پردہ موقوف کرنے کی سفارش کرتی ہے۔ پردہ کا جو طریقہ یہاں رائج ہے، میں جانتا ہوں کہ اُس میں بعض تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور میں خوشی کے ساتھ ایسی ترمیمات قبول کرلوں گا جو مذہبی اجازت کے حدود سے باہر نہ ہوں مگر پردہ کی موقوفی مذہب میں مداخلت کے مرادف ہوگی جسے مسلمان منظور نہیں کر سکتے اور نہ اُنھیں منظور کرنا چاہیے۔ دراصل یہ ایک خالص خانگی مسئلہ ہے جسے مسلمانوں پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اسے اپنے مذہبی و معاشرتی خیالات کے مطابق حل کر سکیں۔

(۴) میں دفعہ ۸ (صفحہ ۔ ماہ جنوری) سے عام طور پر متفق ہوں لیکن اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ اپنے گھر کے اندر چوپایوں کے ذبح کرنے کے حق میں قانون سازی یا انتظامی احکام کے ذریعہ مداخلت کی جائے گی تو مسلمانوں اور دوسرے گروہوں کو ہمیشہ بجا طور پر اس سے شکایت پیدا ہوگی اور مجھے امید ہے کہ اس دفعہ کے الفاظ خصوصاً یہ جملہ کہ "عام ملکی قوانین کے ماتحت ہونی چاہیے" اس امر کے لیے نہ بہانہ بنائے جائیں گے کہ ایسے قوانین بنائے یا نافذ کیے جائیں جو کسی شخص کے آزادانہ طور پر مذہبی احکام کی تعمیل کرنے یا شہری آزادی کے حق میں مزاحم ہوں۔

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جہاں وہ اپنے مذہبی فرائض کو آزادی سے اور بغیر کسی روک یا مزاحمت کے انجام دے وہیں اس باب میں پورا اہتمام کرے کہ اُسکے ہمسایوں کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔

(۵) مذہبی و تعلیمی سفارشات پر عموماً اتفاق ہے مگر امور ذیل کے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں:۔

(الف) دفعہ ۲ (صفحہ ۶۰ الناظر ماہ دسمبر) کی تمہید میں بیان کیا گیا ہے کہ غیر فرقہ وارانہ درسگاہوں کے ہندو مسلمان طلبہ زیادہ وسیع النظر ہوتے ہیں۔ جو میرے خیال میں صحت پر مبنی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں لوگوں کے نام لینا مناسب نہ ہوگا، لیکن میں بے خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ممتاز مسلمان وطن پروروں میں سے اکثر اصحاب مسلم یونیورسٹی (سابق ایم اے او کالج علیگڈھ) کے تعلیم یافتہ ہیں یا اُس سے وابستہ رہے ہیں ——— حالانکہ ہندو سنگھٹن کے ممتاز رہنماؤں کی بہت کثیر تعداد غیر فرقہ وارانہ درس گاہوں کے طلباء سابق میں سے ہے۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اس دفعہ کے تحت میں جو سفارشیں کی گئی ہیں وہ اُن درس گاہوں پر حاوی نہیں جو خاص طور پر مذہبی تعلیم دینے کے لیے ہیں۔

(ب) دفعہ ۷ (صفحہ ۶۲ الناظر ماہ دسمبر) میں ۱۸ سال سے کم عمر نابالغوں کے تبدیل مذہب کو ناجائز قرار دینے کی جو سفارش کی گئی ہے وہ اسلامی قانون کے خلاف ہے اور مسلمان اُسے قبول نہیں کر سکتے۔ فقہ اسلامی کی رو سے مسلمان فقہاء کی رائے میں تو اُن نابالغوں کو بھی مذہب تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے جو بالغ العقل ہوں۔ اور سن بلوغ کی مدت ۱۵ سال سے اوپر نہیں۔ گو بہت سے اشخاص علی الخصوص عورتیں تو اس سے بھی کم عمر میں بالغ ہو جاتی ہیں۔

میں اس رائے سے بھی متفق نہیں کہ گزشتہ دس سال کے اندر تبدیل مذہب کا کوئی سچا واقعہ پیش نہیں آیا۔ یا یہ کہ مذہبی تبلیغ کرنے والی جملہ مجالس کی کارروائیاں ایسی تھیں کہ اُن سب کو توڑ دیا جائے۔ کمیٹی صرف یہ چاہتی ہے کہ تبدیلی مذہب کے بارے میں نامناسب ذرائع اختیار نہ کیے جائیں اور جو مجالس اس اصول کی پابندی نہ کریں اُنکو توڑ دیا جائے۔

(۶) سیاسی و اقتصادی سفارشات کی دفعہ ۴ (صفحہ الناظر ماہ جنوری) کے اس مشورے سے میں اتفاق نہیں کرسکتا کہ مذہب کی بنیاد پر جداگانہ انتخاب کا طریقہ موقوف کر دیا جائے۔ میرے مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے احباب کا خیال جو کچھ بھی ہو مگر تمام حالات پر نظر کرتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ انتخابات جداگانہ کی موقوفی اقلیتوں کے حق میں مضرت رساں ہوگی اور تا وقتیکہ اعلیٰ ذات کے ہندو جو اس وقت ملکیت کے لائق تمام اشیاء کے واحد اجارہ دار ہیں اُن کا عام رویہ حقیقی طور پر تبدیل نہ ہو اور وہ اس پر رضامند نہ ہوں کہ اُن گروہوں یا فرقوں کے ساتھ جو اچھوت کہے جاتے ہیں کامل انصاف برتیں گے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اُنکو پورا حصہ دیں گے مخلوط انتخاب کے لیے اقلیتوں کو مجبور نہ کرنا چاہیے۔

کیا خود مہاتما گاندھی کا ارشاد نہیں کہ "اچھوتوں کی حالت سوراج کے ماتحت اب سے بھی زیادہ خراب ہو جائیگی اور یہ محض اس سبب سے کہ حاصل شدہ اقتدار ہماری کمزوریوں اور اقلیتوں کی پشت پناہی کا ذریعہ بنجائیگا۔"

اس لیے میرا ذاتی مشورہ یہ ہے کہ صوبجات میں اکثریت کو چاہیے کہ اپنے نمائندوں کو مخلوط انتخاب کے ذریعے منتخب کرائے تاکہ اقلیتوں کے حقوق سے بالکل تغافل نہ برتا جاسکے اور جو جماعت اقلیت میں ہو اُسکو اختیار دیا جائے کہ اپنے نمائندے جداگانہ انتخاب کے ذریعہ یا وہ پسند کرے تو مخلوط انتخاب کے ذریعہ منتخب کرے۔

ممکن ہے کہ دستور سازی میں یہ بات بے ڈھنگی سی معلوم ہو مگر مجھے اعتماد ہے کہ یہ صورت مفید ثابت ہوگی اور اقلیتوں کا کافی تحفظ کرے گی۔ اس ملک کے حالات یورپ سے اس قدر مختلف ہیں کہ ہمیں اپنے اہل ملک کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے نظام کار نیز نظم و نسق کے دستور میں تبدیلیاں کرنا ہونگی۔ ہمیں تمام جزئیات میں مغرب کی تقلید کرنے کی حاجت نہیں۔

میں کبھی اس رائے کو پسند نہیں کرسکتا کہ انتخاب جداگانہ ہندو مسلمانوں کے درمیان افتراق کا سبب ہوا ہے۔ ممکن ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے، یہ خیال حکام کا پیدا کردہ ہو مگر بہت سی دوسری چیزیں بھی تو ہیں جو اُن ہی نے رائج کی ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہمیں ہو چکا ہے۔ پھر اکیلا انتخاب جداگانہ ہی کیوں اس طرح مردود بنانے کے لیے تجویز ہوا ہے۔ انگریزی کی پرانی مثل ہے کہ "بھلے کتے کو بدنام کردو اور پھر اُسے ٹھوکریں مار کر نکال دو" اور میرے خیال میں اس بارے میں یہ مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔

اگر کسی اتفاق سے مسلمانوں کی حیثیت منقلب ہو جاتی اور اُنکی قومی اکثریت اُسی حالت تحفظ میں ہوتی جو اس وقت اکثریت کی جماعت کو حاصل ہے تو یہ امر بہت مشتبہ ہے کہ اُس وقت کی اقلیت مخلوط انتخاب کی اس شد و مد سے وکالت کرتی۔

(۷) دفعہ ۱۰ (صفحہ الناظر ماہ جنوری) میں مشورہ دیا گیا ہے کہ بنک اور بیمہ وغیرہ کے کاروبار دونوں جماعتں

کی متحدہ کوششوں سے قائم ہوں۔ روپیہ کا سود کسی نوع یا صورت میں ہو اسلامی تعلیم کی رو سے حرام ہے۔ اس لیے میں اپنے ہم مذہبوں سے بنک اور بیمہ کے کاروبار میں شرکت کی درخواست نہیں کر سکتا۔ برخلاف اس کے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اُن کو اس قسم کے تمام مخرب اخلاق کاروباروں سے الگ رہنے کی صلاح دوں۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر میں اپنے ہندو بھائیوں سے بھی یہ التجا کروں گا کہ وہ اس قسم کے کاروبار سے احتراز کریں جس سے نہ صرف اُن کی اخلاقی و روحانی ترقیوں میں رکاوٹ ہوتی ہے بلکہ سرمایہ داری کی پرورش میں مدد ملتی ہے جو نوع انسانی کے لیے بیشمار مصائب کا منبع ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو لوگ یہ مخرب اخلاق کاروبار کرتے ہیں وہ اپنی آئندہ نسلوں کی فلاح و بہبود کی تمام امیدوں کا خون کرتے ہیں، اور اُنکے خاندان بہت ہی قلیل مدت میں سطح ارض سے نابید ہو جاتے ہیں اور اس طرح ہماری (سوسائٹی) سماج کا وجود ہی بربادی کے خطرہ میں پڑجاتا ہے۔ صرف نکوکار اور متقی ہی فلاح پاتے اور اپنے بعد فلاح پانے والی اولاد چھوڑ جاتے ہیں۔

سفارشات کی بعض دفعات سے اختلاف کے بعد چند مزید تجاویز پیش کی گئی تھیں جو مع تمہیدی بیان کے درج ذیل ہیں:-

"بے شبہ وضع کی یکسانیت، باہمی خورونوش یا تعلیمی درسگاہوں میں ساتھ رہنے اور تہواروں میں شرکت کرنے یا کلبوں اور انجمنوں میں مجتمع ہونے سے ایک حد تک معاشرتی تعلقات بڑھتے ہیں۔ مگر ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو امید ہے کہ تمام غور کرنے والے اصحاب تسلیم کریں گے کہ حقیقی اتحاد اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب دل بدل جائیں کہ اُس سے خوش خیالی و خیر طلبی، ہمدردی و اعتماد کی فضا پیدا ہونا یقینی ہے اور چونکہ اعتماد خبث باطن کا بھی دافع ہے اس لیے ایسی فضا محض بیرونی اور سطحی تدابیر سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لیے مدت تک اور آہستہ آہستہ باطنی اصلاح کرنے کی ضرورت ہوگی۔ جذبات خصومت اور دوسروں پر اقتدار حاصل کرنے کی خواہشات کو قابو میں رکھنا پڑے گا اور اخوتِ انسانی اور محبت کے خیالات عام طور پر قلوب میں نصب کرنا ہوں گے۔

مسلمانوں کے عہدِ حکومتِ ہند کا صدہا سال کا تجربہ صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ قدرتی اسباب کی بنا پر دونوں قوموں میں ایک طرح کا اختلاط ہوتا رہا اور اسکے لیے نہ تو کسی قسم کا ڈھونگ کیا گیا اور نہ مصنوعی طریقوں سے اختلاط کی رفتار تیز کی گئی۔

میرے خیال میں ہماری تمام بیماریوں کا واحد علاج محبت ہے اور اگر ہم کسی طریقے سے دونوں جماعتوں کے رہنماؤں اور تعلیمیافتہ اصحاب میں اُسے داخل کر سکیں تو ہمارا مقصد حاصل ہو جائیگا۔ یہ کیسے کیا جائے، سخت مشکل سوال ہے۔

یورپ کی بڑی بڑی قومیں جو ۱۹۱۴ء–۱۸ء کی دردناک عالمگیر جنگ میں نبرد آزما رہیں عام طور سے اُنکی وضع، لباس، اطوار و رسوم قریب قریب مشترک تھے مگر سب کو معلوم ہے کہ کس درندگی سے، ایک قوم نے دوسری کے گلے کاٹے اور اپنے تباہ و برباد کرنیوالے خلاف انسانیت مساعی میں وہ کیسے باہم گرم سابقت کرتی رہیں۔

جو کچھ یورپ میں واقع ہو چکا ہے اغلب ہے کہ ہندوستان میں اُسی کا اعادہ ہوگا۔ اگر دلوں میں تبدیلی پیدا کیے بغیر ہم کمیٹی کی اُن تمام سفارشات پر عمل کرنے کے لیے رضامند بھی ہو جائیں جو تمدنی ادغام کے خیال پر مبنی ہیں۔

بہر حال اصلی اور مستقل اتحاد پیدا کرنے اور ہندو مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم رکھنے کے لیے میری ناچیز رائے میں ہمیں اپنے طریقوں میں حقیقی تبدیلی کرنا ہوگی اور انکا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:۔

(۱) ہندوؤں کو جو اکثریت میں ہیں اور دولت، جدید تعلیم، تنظیم، اور پرچار میں مسلمانوں سے بہت آگے ہیں چاہیے کہ مسلمان اقلیت کے قلوب پر تصرف حاصل کرنے کے لیے تذبذب و تامل کے بغیر اُس کو وہ ضمانتیں اور آسانیاں مہیا کریں جو وہ ملک کے دستور میں اپنی مناسب حیثیت قائم رکھنے کے لیے طلب کرتی ہے۔

(۲) ہم میں سے بہت سے لوگ تہذیب جدید کی مذمت کرتے ہیں مگر باوجود اسکے یورپ کی نقالی کی بہترین کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں صرف زبان سے اپنے اپنے مذاہب کی محبت کا دم بھرتے اور اپنی قدیم تہذیبوں کی عظمت اور خوبیوں پر اظہار تفاخر کیا کرتے ہیں اور کوئی اس بات کو محسوس نہیں کرتا کہ ہماری روزانہ زندگی کے طریقے روز بروز ایسے بدلتے جاتے ہیں کہ ہم اُس عہد سے بہت دُور ہوتے جاتے ہیں جسکو ہم اسلاف کا عہد زریں کہتے ہیں۔

اس تماشے کو ختم کرنا چاہیے اور اگر واقعۃً ہمیں سچا اور دیانتدار بننا منظور رہے اور ہم امن و اتحاد سے رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں مغربی تخیلات و عادات کا سارا شوق ترک کر دینا اور وید و قرآن کے ازمنۂ قدیم کی طرف واپس جانا چاہیے۔

(۳) خدائے واحد کا خیال نہ صرف مسلمانوں کے لیے جیسا کہ باب سفارشات کے صفحہ ۲ میں درج ہے ہندوؤں کے بھی بعض فرقوں کے عقیدہ کا مرکزی نقطہ ہے۔ اگر ہندوؤں کے تمام فرقوں میں اس عقیدہ کو پھیلانے کی مسلسل اور سرگرم کوششیں کی جائیں تو مذہبی تخیل میں ایک حد تک اتحاد ہو جائیگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موحدین اور مشرکین کے دلوں سے حقارت و نفرت کے جذبات دور ہو جائیں گے۔

(۴) اگرچہ یہ امر محال ہے کہ اقتدار و دولت کی ہوس انسانوں کے قلوب سے محو ہو جائے جو تمام تشکیلات اور مخاصمتوں کا اصل سبب ہے لیکن یہ ناممکن نہیں کہ اُسے ایک بڑی حد تک قابو میں رکھا جائے یا محدود کر دیا جائے

مگر یہ بات صرف روحانیت کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے جو خدا پرستی اور پرہیزگاری کا دوسرا نام ہے۔ حقیقی اور مخلصانہ کوششیں اس امر کی ہونا چاہیے کہ ہماری نوجوان نسلوں اور مفکرین کے خیالات اس نہایت اہم ضرورت کی طرف رجوع ہوں۔

جب ضعیف کو قوی سے کسی قسم کا اندیشہ نہ رہیگا، ہوس پر عام طور سے قابو ہو جائیگا اور لوگ خدا ترسی اور پاکیزگی کی زندگی بسر کرنا سیکھ جائیں گے تو ہندو اور مسلمان آسانی سے دوست بن جائیں گے، اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد کے مانند باہم گر محبت کرنے لگیں گے۔

آپ کبیر کی، صوفیا کی، اولیا کی، انبیا کی مدح سرائی کرتے ہیں مگر جب عمل کا وقت آتا ہے اور آپ سے اُن کے نقش قدم پر چلنے کو کہا جاتا ہے تو آپ فوراً مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ اقوام کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے بلکہ اسکے برخلاف اُن کا انتشار بڑھے گا اور اُنکے اختلافات اس حد تک بڑھ جائیں گے کہ آپ اُسکا اسوقت اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اس طرز عمل کے بدولت وہ اُسی طرح بربادی سے ہمکنار ہونگی جس طرح یورپین قومیں خود اپنی ساختہ و پرداختہ مغربی تہذیب کے بوجھ کے تلے پسی جا رہی ہیں۔

مولانا محمد علی (مرحوم) نے اس باب میں کیا خوب لکھا ہے اور قوم سازی کے نئے تجربات کے خلاف کیسا متنبہ کیا ہے:

"ہر زمانہ کے مصلحین مذہب نے اس معاملہ میں ہلاکت کمزوری دکھائی ہے کہ اُنھوں نے مختلف سرچشموں سے کچھ اجزا نکال کر ایک مذہب کا معجون مرکب تیار کرانا چاہا — اُنھیں یہ اُمید تھی کہ شمولیت کے اس طریقے سے وہ ایسے مذہب کی تحدید کر سکیں گے جس میں تمام مذاہب کے بہترین اصول ہونگے اور ہر ملت کے افراد اس مذہب کو آسانی سے قبول کریں گے — لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ خلاصۃ المذاہب سے امن و اتحاد میں کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ البتہ ان مصلحین نے اکثر اوقات اُنکے مختلف مذاہب و ملل میں ایک اور اضافہ کر دیا جو پہلے سے موجود تھے اور اختلافات کو بڑھاتے جا رہے تھے۔ ایسی کوششوں کی ناکامیوں نے جن کا مقصد نیک تھا لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ رواداری کے طریقے اختیار کریں۔"

(اُردو ترجمۂ خطبۂ صدارت کوکناڈا کانگریس ص ۸۴)

ہندو تیوہاروں کی اصلیت

نظرے خوش گزرے

یہ پرچہ امید ہے کہ سابقہ پرچوں سے کچھ پہلے شایع ہو سکے گا۔ اور اگر کوئی نئی افتاد پیش نہ آئی تو اس ششماہی کے ختم تک انشاء اللہ وسط ماہ میں رسالہ کی اشاعت کا انتظام ہو جائے گا۔

الناظر کا حجم ۳ جزو سے شروع ہو کر ۴½ جزو تک پہونچ گیا ہے اور قلمی معاونین کی عنایت سے لب آسانی ۵ جزو کیا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ ۵ جزو کا پرچہ ایک پیسہ کے ٹکٹ میں نہ جا سکے گا اس لیے ۸ صفحوں کے اضافہ سے خرچ بہت بڑھ جائے گا۔ اگر آیندہ دو ماہ کے اندر قسم اول کے خریداروں میں کافی اضافہ ہو جائے تو جولائی سے حجم ۸۰ صفحے کیا جا سکتا ہے۔

ناظرین کرام کو یہ معلوم رہنا چاہیے کہ دوسرے جرائد کی طرح الناظر کو یہ آسانی حاصل نہیں کہ عمال سرکاری یا ریاستوں کی سرپرستی سے فائدہ اٹھائے۔ اسکے لیے جس اہلیت کی ضرورت ہے وہ اگر کبھی تھی بھی تو اب باقی نہیں۔ اس لیے الناظر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے یا بالفاظ دیگر اپنے مداخل و مصارف میں توازن قائم رکھنے کے واسطے تمامتر عام ناظرین ہی کی امداد کا طالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقتاً فوقتاً الناظر کے قدردانوں کو توجہ دلائی جاتی ہے اور اس وقت بھی یہ درخواست کی جاتی ہے کہ احباب خاص کے علاوہ جو ہمیشہ الناظر کی توسیع اشاعت میں ساعی رہتے ہیں، عام خریدار بھی توجہ فرمائیں، تاکہ الناظر زیادہ مفید خدمات انجام دینے کے لایق ہو جائے۔

الناظر کے موجودہ خریدار اگر تہیہ کر لیں کہ جون کے اختتام سے پہلے پہلے قسم اول کا ایک ایک خریدار ضرور بنائیں گے، تو اضافۂ حجم میں پھر کوئی امر مانع نہ رہے۔

کانپور کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کا حصۂ سفارشات مع اختلافی یادداشتوں کے اس نمبر میں ختم ہے۔ تاریخی تبصرہ اور بعض دیگر ضروری اجزا بعد کو جستہ جستہ پیش کیے جا سکیں گے۔

"اصطلاحات فلسفہ پر تنقید" کے اوراق گزشتہ مہینوں میں قلت گنجایش کے سبب شامل نہ ہو سکے۔ اس پرچہ سے پھر سلسلہ شروع ہوتا ہے اور امید ہے کہ آیندہ نمبر میں تمام ہو جائیگا۔ جن احباب کو اس بحث سے دلچسپی ہے یا جنھوں نے اپنی رائے ظاہر فرمانے کے وعدے کیے ہیں انشاء اللہ مضمون کی تکمیل کے بعد اُن اصحاب کے مضامین حاصل کر کے شایع کیے جائیں گے۔ یہ بحث عام پسند نہیں مگر جو لوگ انگریزی زبان سے علمی مضامین

کتب کا ترجمہ کرنا چاہتے یا اُردو میں علمی کتابیں لکھنے کا شوق رکھتے ہوں اُنکے لیے اصطلاحات کا تصفیہ بسیا ضروری ہے۔

مارچ نمبر میں افسانہ کی فنی ترتیب پر وقار عظیم صاحب کا جو مضمون شایع کیا گیا اُس کے مطالعہ سے غیر انگریزی داں طبقہ کو عجب نہیں جو بھی خاصی اُلجھن ہوئی ہو کیونکہ Setting - Spirit اور Mood وغیرہ کے ترجمے درج نہ تھے۔ مسٹر اجمل خاں یا دوسرے اصحاب جو اصطلاح سازی کے کام سے دلچسپی رکھتے ہیں، اگر توجہ فرمائیں اور اُن اصطلاحات کے ترجمے تجویز فرما دیں تو نوجوان اہل قلم کو اُن کی عنایت سے بہت فائدہ ہوسکیگا۔

Setting کے معنی، افسانہ نویسی کی اصطلاح سے قطع نظر کرکے، نگینہ جڑنے کے ہیں۔ اصطلاح قرار پا جانے کے بعد معنًا اگرچہ بہت وسعت پیدا ہوگئی ہے لیکن غور کیا جائے تو ماحصل کلام یہ نکلتا ہے کہ افسانہ کے تمام ضروری اجزا کو باہم مربوط کرکے اُس کو فنی حیثیت سے مکمل بنا دینے کا نام Setting ہے جسے ہمارے نگینہ ساز سجاوٹ یا سجائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی دوسرا بہتر اور موزوں لفظ نہ ملے تو یہی الفاظ Setting کے مرادف قرار دیے جا سکتے ہیں اور کچھ دنوں کے استعمال کے بعد رفتہ رفتہ اُن تمام معانی پر حاوی ہوجائیں گے جو اس وقت Setting سے وابستہ ہیں۔

Spirit کا ترجمہ عام طور پر "روح" کیا جاتا ہے اور افسانہ کے تعلق سے یہی لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ Mood کے معنی حالت، کیفیت، انداز کے ہیں۔ افسانہ کے سلسلہ میں غالبًا آخری لفظ زیادہ موزوں ہوگا۔

گزشتہ مہینے میں تصدق احمد خاں شروانی جیسے باہمت، مخلص، سرگرم اور قابل کارکُن کے انتقال سے جو جگہ قومی خدمتگزاروں کی صف میں خالی ہوئی ہے اُس کا پُر ہونا محال اگر نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ صوبۂ متحدہ کے، انگریزی تعلیم یافتہ دوستوں میں مولانا محمد علی مرحوم کے جو چند مخصوص رفقاء کار تھے اُن میں شروانی صاحب اپنی آزاد خیالی و اپنا رپختگی کی بنا پر بہت نمایاں تھے۔ اور کانگریسی مسلمانوں میں تو اُن کے بعد میدان بالکل خالی نظر آتا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حجم کی قلت اور مشاغل کی کثرت کے باعث ریویو کے لیے جو کتابیں وصول ہوئی ہیں ابھی تک اُن پر توجہ نہیں کی جا سکی۔ خدا نے چاہا تو آیندہ مہینے سے اس کا التزام کیا جائے گا کہ صفحۂ تعارف سے کوئی پرچہ خالی نہ رہے۔

یادگار نسیم ۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی شاعری پر بسیط تبصرہ
اور مثنوی گلزار نسیم مع حواشی کثیرہ ۔ آخر میں دیوان نسیم کا انتخاب
مرتبہ مولانا اصغر گونڈوی ۔ قیمت ۱۲؍

روح انیس ۔ میر انیس کے بہترین مرثیوں، سلاموں،
اور رباعیوں کا مجموعہ ۔ مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ۔
مقدمہ میں انیس کے حالات، انکے کلام پر مختصر تبصرہ ۔
شہادت امام حسینؑ کا اجمالی بیان اور مرثیہ واجزاے
مرثیہ و اشخاص مرثیہ کے متعلق قابل قدر معلومات ۔ متعدد
تصاویر اور دیدہ زیب طباعت ۔ قیمت ۳؍

ادبی خطوط غالب ۔ مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی
بی اے نے غالب کے اُن خطوط کو مرتب کیا ہے جنمیں
ادبی نکتے، اشعار کے معنی یا کلام پر اصلاح دی گئی ہے ۔
باضافہ دیباچہ مفیدہ و حالات مکتوب الیہم ۔ قیمت ۱۲؍

شاعری کی چار کتابیں ۔ خواجہ عشرت لکھنوی نے
نو آموزوں کو فن شعر سکھانے کیلیے یہ چار کتابیں لکھی ہیں
پہلی کتاب میں فن عروض کے عام فہم قاعدے ہیں ۸؍ دوسری
کتاب میں بحور کا بیان اور اختلافی قواعد کا قول فیصل ۸؍ تیسری
کتاب میں قافیہ اور عیوب قافیہ کا بیان ۸؍ چوتھی کتاب
میں شعر کے معائب و محاسن، تاریخگوئی کے قواعد ۸؍

نظام اردو ۔ جس میں زبان کے اجزاے ترکیبی
کی تحقیق و تشریح، مترادفات کے اصول استعمال اور ہر لفظ
کے برمحل و بے محل ہونے کا معیار بتایا گیا ہے مصنفہ جناب
آرزو لکھنوی مع حواشی از پروفیسر سید مسعود حسن رضوی عہ

فکر بلیغ ۔ خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی مرحوم کی
قابل قدر کتاب فصاحت و بلاغت اور رموز و نکات
شاعری کے بیان میں ۔ قیمت عہ

تحقیق سخن ۔ مولانا شفق عماد پوری نے عیوب سخن قیود سخن
اور صنائع سخن کو اس رسالہ میں بیان کیا ہے ۔ ۸؍

رکن عروض ۔ عروض و قافیہ پر آسان فہم رسالہ از
مولانا شفق عماد پوری ۔ ۸؍

نوادر ۔ ہر طبقہ کے اکابر کے لطائف و ظرائف کا قابل قدر
مجموعہ ۔ مرتبہ مرزا محمد عسکری صاحب بی اے مع شگفتہ
از ایڈیٹر صاحب اودھ پنچ ۔ قیمت عہ

غالب اور اُس کی شاعری ۔ مرزا غالب کے کلام پر
ایک دلچسپ تنقیدی مضمون از مسٹر احمد الدین مارہروی ۶؍

اصلاح سخن ۔ جناب شوق سندیلوی نے چند غزلیات
کی نقول مختلف شعرائے نامدار کے پاس بغرض اصلاح بھیجیں
اُن سب کی اصلاحوں کا مجموعہ، اُن شعرا کے خطوط، نیاز
فتحپوری کی تقریب، مولانا اثر کا دیباچہ، سلطان حیدر جوش
کا مقدمہ اور ڈاکٹر عبد الستار صدیقی و منشی امیر احمد علوی کے
تبصرے اس کتاب میں جمع ہیں ۔ قیمت ۳؍

دیوان تاباں ۔ معاصر میر و سودا میر عبد الحی تاباں کا
قابل قدر کلام مع مقدمہ از سید بادشاہ حسین حیدرآبادی عہ

دیوان اثر ۔ خواجہ میر درد کے بھائی سید محمد میر اثر کا نایاب
و نادر کلام مع مقدمہ از مولوی تقی الدین احمد حیدرآبادی عہ

فیضان شوق ۔ منشی احمد علی شوق قدوائی مرحوم کا دیوان
جس میں غزلیات، قطعات، اور رباعیات ہیں مع مقدمہ از
مسٹر معین الدین انصاری بیرسٹر ایٹ لا ۔ قیمت ۱۲؍

رنگ زمانہ ۔ حضرت اکبر الہ آبادی کے رنگ میں جناب
محب دریابادی کا دیوان ۔ قیمت ۱۰؍

اثرستان ۔ مرزا جعفر علیخاں اثر لکھنوی کا دیوان غزلیات
مع مقدمہ از جناب عزیز لکھنوی ۔ قیمت عہ

جذبات بسمل ۔ منشی سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی کا
کلام قدیم و جدید رنگ میں ۔ مع مقدمہ از سر عبد القادر ۔
۱۲ تصاویر ۔ اور طباعت و جلد اعلیٰ درجے کی ۔
قیمت للعہ

الناظر بک ایجنسی ۔ لکھنؤ

تابشِ خیال۔ حضرت افسر امروہوی کا دیدہ زیب مجموعۂ کلام مع مقدمہ از اسرار احمد صاحب کریوی۔ عہ

گہرستان۔ مشہور مزاحیہ نگار شوکت تھانوی کا مجموعہ کلام جسمیں غزلیات کے علاوہ چند نعتیہ و ادبی نظمیں بھی ہیں۔ ۱۲ر

کلام الملوک۔ پروفیسر حمید اللہ خاں نے تقریباً اسی شہزادوں کے اردو کلام کا یہ انتخاب مرتب کیا ہے۔ ۱۰ر

معراجِ سخن۔ میر انیس کے پوتے اور جانشین دولہا صاحب عروج کے چند لائق دید مراثی۔ جن پر ہندوستانی اکیڈمی نے پانچ سو روپیہ انعام دیا۔ قیمت ۸ر

تنظیم الحیات۔ مولانا فصیح لکھنوی نے مثنوی کی بحر میں انگریزی کی ایک مشہور اخلاقی کتاب کو لباس اردو سے آراستہ کیا ہے۔ جس پر ہندوستانی اکیڈمی سے پانچ سو روپیہ انعام ملا۔ قیمت ۶ر

عالمِ خیال۔ شوق قدوائی کی مقبول عام نظم جسمیں شوہر کے متعلق ہندی عورتوں کے حقیقی جذبات کی ترجمانی ہے۔ کئی بار کتابی صورت میں چھپی مگر ایک بڑے سقم کی وجہ سے مصنف نے آخری حصہ بالکل بدل دیا اور ساری نظم کو مناسب ترمیمات کے بعد زبان و بیان دونوں حیثیتوں سے مکمل کر دیا اور اب یہ بالکل نئی چیز ہے۔ جنکے پاس پرانا ایڈیشن ہو وہ بھی اسے منگائیں۔ قیمت ۸ر و ۶ر

صبحِ وطن۔ پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کی قابل قدر نظموں کا مجموعہ (طبع ثانی) قیمت ۱۲ر

نغمہ زار۔ حضرت حفیظ جالندھری کی مترنم غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔ (طبع ثانی) ۱۲ر

پیامِ روح۔ مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی بی اے کی نظموں کا باتصویر مجموعہ۔ قیمت سے

ہفت گلچین۔ منشی افضل علی فہر کاکوروی کی سات نظمیں جنمیں مغربی شاعری کو مشرقی لباس سے آراستہ کیا ہے۔

خیاباں۔ حضرت ثمر کاکوروی کی سات اخلاقی نظموں کا گلدستہ۔ قیمت ۱۲ر

سبدِ گل۔ سید اولاد حسین شاعر کی بارہ نظموں کا مجموعہ۔ عہ

مطلع انوار۔ منشی مہاراج بہادر برق دہلوی کی نظموں کا مجموعہ مع مقدمہ از منشی جگت موہن لال رواں و دیباچہ از اصغر گونڈوی۔ قیمت عہ

نقش و نگار۔ حضرت جلیل قدوائی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ

امارتِ اختر۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ۸ر

دنیائے راز۔ جناب راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی مختصر نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ۱۰ر

شاہنامہ اسلام۔ حضرت حفیظ جالندھری فردوسی کے تتبع میں تاریخ اسلام کے عظیم الشان واقعات کو نظم کر رہے ہیں۔ جلد اول میں جنگ بدر سے پیشتر تک کے حالات ہیں۔ قیمت ۲ تقطیع خورد۔ قیمت ۱۲ر

زنگاری بیگم۔ حضرت آثر لکھنوی نے انگریزی کے واسطہ سے مشہور فرانسیسی مزاحیہ ڈرامے "لیڈی ازیور" کے لطف کو اردو نظم کے لباس سے آراستہ کیا ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ ۱۰ر

سی پارۂ دل۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی غزلیات کا مجموعہ۔ قیمت ۱۲ر

بابِ رحمت۔ اس مجموعہ کی مناجاتیں اور نظمیں سیدہ ضیاء النبی کی صاحبزادی اور مولانا حکیم سید عبد الحی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء و مصنف تذکرہ گل رعنا کی بیوہ بہتر صاحبہ کی تصنیف ہیں ۱۲ر

دل سی پارہ۔ مولانا شفق عمادپوری کی ۳۰ رباعیاں دلی مضامین پر جنمیں سے بعض ایسی ہیں کہ انکا مثل ناممکن ہے۔ ۱۲ر

صبحِ پیری کا ستارہ۔ پیری کے مضمون کی ۵۰ رباعیوں کا مجموعہ جنمیں ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ از مولانا شفق عمادپوری

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بنام خداوند جاں آفریں

رجسٹرڈ نمبر اے ۳۷۸

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجرائے الناظر) سنہ ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

نمبر ۵	مئی سنہ ۱۹۳۵ء	جلد ۳۹

فہرست

قسم عام (رنگین سرورق چکنا کاغذ)	عہ ر	سالانہ مع محصول ڈاک	فی پرچہ	۵ر
ارزاں ایڈیشن (بادامی سرورق کھرا کاغذ)	عہ ر	" "	"	۳ر

تاریخ

تاریخ ابن خلدون - علامہ ابن خلدون مغربی کو اہل یورپ بھی فن تاریخ کا امام مانتے ہیں - یہ انھیں کی مشہور و معروف مستند تاریخ عہد اسلامی کا ترجمہ ہے

مقدمہ (۳ جلد) جس میں مصنف نے اپنا فلسفۂ تاریخ اور وہ اصول تاریخ نویسی لکھے ہیں جو آج یورپ کے مورخین کے لیے شمع ہدایت بنے ہوئے ہیں - قیمت عہ ر

جلد اول - حضرت نوح کے زمانہ سے حضرت مسیح عیسیٰ تک کے حالات - قیمت عہ ر

جلد دوم - ملوک فارس، یونان، روم اور سلاطین قسطنطنیہ کے حالات - قیمت عہ ر

جلد سوم - حضور خاتم المرسلین کی ولادت سے عہد خلافت حضرت صدیق تک - قیمت عہ ر

جلد چہارم - حضرت فاروق اعظم کے زمانہ سے امام حسنؓ کے تفویض خلافت تک - قیمت عہ ر

جلد پنجم - حضرت معاویہ کی خلافت سے حضرت عمر بن عبد العزیز تک - قیمت ے ر

جلد ششم - خلفائے بنو امیہ کے آخری تاجداروں سے مہدی عباسی تک - قیمت عہ ر

جلد ہفتم - مشہور خلفائے عباسیہ ہارون الرشید امین و مامون، معتصم و واثق کا عہد - قیمت ے ر

جلد ہشتم - زمانۂ انحطاطِ دولت عباسیہ کے تاجداروں کا عہد - قیمت ے ر

جلد نہم - خلفائے عباسیہ کا آخری دَور اور دولتہائے مصریہ و عبیدیہ - قیمت ے ر

جلد دہم - اندلس میں ابتدائے اسلامی حکومت کے ابتدائی حالات - قیمت ے ر

جلد یازدہم - اندلس کا آخری دور - کامل حکومت اسلامی کا قیام - قیمت ے ر

جلد دوازدہم - سلجوقیوں، سامانیوں اور غزنویوں کا دَورِ حکومت - قیمت ے ر

جلد سیزدہم - غوریوں، دیلمیوں اور تاتاریوں کا عہد حکومت - قیمت ے ر

جلد چہاردہم - چنگیز خاں کا خروج - ممالک اسلامیہ کی تباہی و بربادی - قیمت ے ر

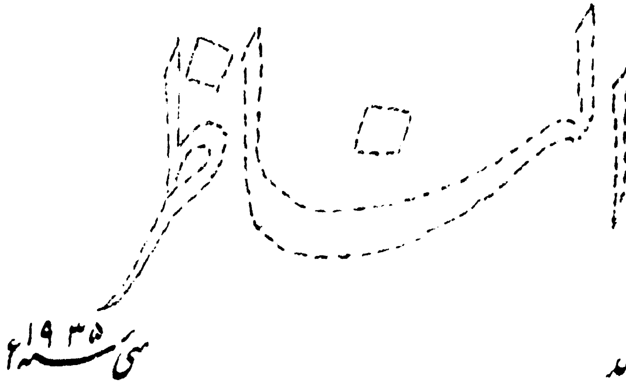
اخبار الاندلس (۳ جلد) اندلس کی اسلامی حکومت کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ یورپ کی موجودہ تمام ترقیوں کی بنیاد وہیں پڑی - اس عہد کی تاریخ پر چھوٹی بڑی مستند کتابیں اردو میں نکلیں مگر امریکہ کے مشہور مورخ اسکاٹ کی تاریخ سب سے زیادہ مفصل ہے جسے اندلس کے شیدائی مولوی خلیل الرحمن صاحب نے بڑی عرق ریزی و جاں فشانی کے بعد اردو میں منتقل کیا ہے - حجم ڈھائی ہزار صفحات سے اوپر - قیمت عہ ر

مختصر تاریخ اسلامی - یعنی علامہ محی الدین خیاط مصری کی دروس التاریخ اسلامی کا خلاصہ و ترجمہ - جسکے مطالعہ سے اجمالی حالات معلوم ہو جائیں گے -

جلد (۱) رسول کریم - رسول مقبول صلعم کی سیرت پاک ۸ ر
" (۲) خلافت راشدہ - حضرات خلفائے راشدین کے حالات ۹ ر
" (۳) خلافت بنو امیہ - خلفائے بنو امیہ " ۱۰ ر
" (۴) خلافت بنو عباس - خلفائے بنو عباس " ۱۱ ر

مرآۃ محمدی - مسلمان سلاطین گجرات کے مستند حالات مصنفہ شیخ غلام محمد مصنف مرآۃ عالمگیری - قیمت عہ ر

بنام خداوند جاں آفریں



نمبر ۵ جلد ۳۹ — مئی سنہ ۱۹۳۵ء

امیر خسرو اودھ میں

(جناب مولوی سید حسن صاحب برنی بی اے ایل ایل بی (علیگ) ایڈوکیٹ بلند شہر)

مولانا حالی کی حیات سعدی اور یادگار غالب دیکھ کر مختلف اہل قلم کو اور شعرا و مصنفین کی سوانحعمریاں مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا - اور اس سلسلہ میں متعدد کتابیں لکھی گئیں - حیات خسرو کی تدوین منشی سعید احمد صاحب مارہروی کے حصہ میں آئی - مگر جب نواب اسحٰق خاں مرحوم نے تصانیف خسرو کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور حضرت امیر خسرو کی متعدد مثنویاں جدید طرز پر ترتیب پاکر شائع ہوئیں تو ضرورت اسکی محسوس کی گئی کہ ایک مفصل و مبسوط سوانحعمری از سر نو ترتیب دی جائے - انجمن ترقی اردو کی جانب سے مرحوم سید افتخار عالم مارہروی مصنف حیات النذیر اس کام پر متعین کیے گئے - مگر انکی وفات کے باعث تاج خسروی کی اشاعت نہ ہو سکی - ممکن ہے کہ اسکا مسودہ انکے ورثا کے پاس یا انجمن ترقی اردو کے دفتر میں محفوظ ہو - برنی صاحب بھی کچھ عرصہ سے سوانح خسروی کی تدوین میں مصروف ہیں اور اسکے بعض اجزا وقتاً فوقتاً شائع کراتے رہتے ہیں - مضمون ذیل بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے - امید ہے کہ انکی پہلی کتاب البیرونی کی طرح انکی سوانحعمری خسرو بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی - ایڈیٹر

اسلامی سلطنت کے پچھلے دور میں دربار اودھ کی علمی و ادبی قدردانیاں عام طور پر زبان زد ہیں لیکن بہت

کم لوگ جانتے ہونگے کہ اسلامی سلطنت کے ابتدائی دور میں بھی اس سرزمین کے بعض صوبہ دار بڑے علم دوست ہوئے ہیں۔ اُن میں سے ایک کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کے اسلامی عہد کے سب سے بڑے شاعر امیر خسرو کے سرپرستوں میں شمار ہوتا ہے۔

اُس کا نام ملک امیر علی تھا۔ وہ سلطان بلبن کے غلام کا لڑکا تھا۔ اور بلبن کے زمانہ میں سرجاندار کے عہدہ پر فائز تھا۔

اسلامی غلامی کی رسم دوسری قوموں کی رسم غلامی سے کچھ الگ چیز تھی۔ مسلمانوں میں بھی غلام خدمت کا ذمہ دار ہوتا تھا لیکن اُن میں اچھا غلام مخدوم بھی بن سکتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات مسلمان غلام اپنی قابلیتوں سے بادشاہی تک پہونچے۔

امیر علی بڑا فیاض دل لیکر آیا تھا۔ فیاضی کی رسم مشرق کی پرانی خصوصیت ہے۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں کی پچھلی روایتیں یکساں ہیں۔ اُس زمانہ کے مسلمان امیر بھی بڑے حوصلے والے تھے۔ اُس دور کے مستند مورخ ضیاے برنی نے اپنے نانا سپہ سالار حسام الدین کی سند سے لکھا ہے کہ وہ اُمرا آپس میں عداوت کرنا نہ جانتے تھے۔ لیکن عالی ہمتی اور فیاضی میں ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی امیر سُن لیتا کہ فلاں امیر کے دسترخوان پر پانسو آدمی کھانا کھاتے ہیں، یا فلاں امیر سواری کے وقت دوسو ٹنکہ لُٹا دیتا ہے، تو وہ چاہتا کہ اُسکے یہاں ہزار آدمی کھانا کھائیں، اور سواری میں چار سو ٹنکہ صدقہ ہوں۔ اگر کوئی امیر مجلس نشاط میں پچاس گھوڑے انعام دیتا، اور دوسو آدمیوں کو کپڑے۔ تو دوسرا اُس کی کوشش کرتا کہ سو گھوڑے بخشدے اور پانسو آدمیوں کو کپڑے دے ڈالے۔

اُس عہد کے امیر اپنی فیاضیوں اور خیراتوں کی وجہ سے ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ اُن کے گھروں میں سونا چاندی جمع نہ ہوتا تھا۔ سلطنت دہلی کے امراء سے لین دین کرنے والے ملتانی اور ساہوکار مالا مال ہوگئے تھے۔ اُنھیں زر قرضہ کے علاوہ انعام بھی ملتے رہتے تھے۔ ادھر کسی امیر کی مجلس یا دعوت مقرر ہوتی اُدھر اُس کے نوکر چاکر اُن ملتانیوں اور ساہوکاروں کے پاس دوڑے جاتے اور سودی تمسک لکھ کر روپیہ لے آتے۔ (فیروز شاہی ص ۱۱۹-۱۲۰)

ہندوستان کی دولت میں کچھ کمی نہ آتی تھی۔ ان فیاضیوں سے نہ امیر ہی کنگال ہوتے تھے، نہ ملک کا کچھ بگڑتا تھا۔ روپیہ ہیر پھیر کے ملک والوں ہی میں لوٹتا پلٹتا رہتا تھا۔ یہ زمانہ نہ تھا کہ سب طبقے معاشی تنگدستی میں گھرے دکھائی دیتے ہیں اور ہمارے ملک میں سخاوت کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔

وہی مورخ لکھتا ہے :-

"کیسا کریم، نفیس، غریب و عجیب غلام زادہ تھا کہ جسے شاہ عہد اور حاتم خاں کہتے تھے، اور اس بادشاہ کی کیسی عظمت و بزرگی تھی کہ جس کا غلام زادہ اُس زمانہ اور عہد ما بعد میں "شاہ" کہلاتا تھا اور "حاتم خاں" مشہور تھا۔ سونکہ سے کم بخشش میں بہت کم دیتا تھا، اور جسے انعام میں گھوڑا اور کپڑا دیتا تو بغیر تھیلی روپیہ کے نہ دیتا۔ معمولی گوچہ گرد فقیروں کو اشرفی اور روپیہ سے کم نہ دیتا تھا۔ اور جیتل (پیسہ) کا تو اُس کے یہاں ذکر ہی زبان پر نہ آتا تھا" (ص ۱۱۹)

بلبن اُس کی فیاضیوں سے بہت خوش ہوتا اور خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ غلام زادہ ایسا فیاض ہے۔ ایک دن سلطان نے کہا "مجلس شراب اور عالم مستی میں ایسی بخششیں کر بیٹھتے ہو، تمہاری فیاضی کو جب مانوں کہ ہوشیاری میں ایسا کرو"۔ اُس نے اُسی دن سے شراب سے توبہ کرلی اور ہوشیاری میں اُس سے زیادہ فیاضیاں دکھائیں۔

بلبن بھی اُس کی روز بروز ترقی کرتا رہا۔ اخیر عہد بلبن اور کیقباد کے زمانہ میں یہی حاتم ثانی سرزمین اودھ کا اقطاع دار تھا۔ (ص ۱۱۸-۱۱۹)

امیر خسرو کی شاعری کا شہرہ عہد بلبن کے عہد میں پھیل چکا تھا۔ وہ بلبن کے دونوں بیٹوں محمد سلطان خاں شہید اور بغرا خاں کے ندیم رہ چکے تھے۔ ۶۸۴ھ میں جب ہونہار ولیعہد (محمد سلطان) تاتاریوں کی لڑائی میں مارا گیا تو ایک مدت تک اپنے وطن پٹیالی میں گوشہ نشیں رہے، اور پھر حاتم خاں کے یہاں تعلق ہوگیا۔ وہ دو برس تک اس تعلق سے اَودھ میں رہے۔ ضیاے برنی لکھتا ہے:۔

"امیر خسرو کے دیوان میں حاتم خاں کی بہت سی مدائح موجود ہیں۔ امیر خسرو بھی اُسکے یہاں ملازم تھے اور ایک اسپ نامہ اُس کے نام پر لکھا ہے، جس میں لکھتے ہیں:۔

شاہ عہد اختیار دولت و دیں — آفتابِ شرف بخانۂ زیں
ہم علی نام ہم بہ شیر دلی — شیرِ دُلدل سوار ہم چو علی

اُس کی فیاضی کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

بہ بحر گفتم مانی بدست خاں بکرم — رواں بلرزہ درآمد کہ ایں محل نہ مراست
گہ سخا دُر و یاقوت پائے کفِ اوست — گہ عطا خس و خاشاک پائے کفِ ماست! (ص ۱۱۹)

امیر خسرو کے دوسرے تیسرے دیوانوں وسط الحیوٰۃ اور غرۃ الکمال، مثنوی قران السعدین اور اُن کے مجموعۂ رسائل اعجاز خسروی میں قیام اودھ کے بعض جزئیات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں ہے کہ ان دونوں دیوانوں وسط الحیوٰۃ اور غرۃ الکمال میں اُن کا بہت سا کلام بھی ایسا ہے، جو اودھ میں بیٹھ کر

لکھا گیا تھا، اگرچہ اُس سب کا چھانٹنا ناممکن ہے۔

یہ زمانہ امیر خسرو کی شاعری کا نصف النہار سمجھنا چاہیئے - بالخصوص اُن کی غزل سرائی کا۔

بلبن کے انتقال کے بعد غالباً وہ اپنے مربی حاتم خاں کے ساتھ دہلی چلے آئے تھے - پھر کیقباد کے ساتھ ہی دو مہینے کے سفر کے بعد اودھ پہونچے، جہاں بغرا خاں اور کیقباد کی ملاقات ہوئی جس کا مفصل تذکرہ مثنوی قران السعدین میں ملتا ہے - اسکے بعد وہیں رہنے لگے - جہاں تک کہ ۶۸۶ھ کے اخیر میں وہ دہلی واپس ہو کر سلطان کیقباد کے ملازم ہو گئے۔

قیام اودھ کی یادگاروں میں ایک دلچسپ منظوم خط سہ شنبہ ۶ ارجب ۶۸۶ھ کا لکھا ہوا غرۃ الکمال میں ملتا ہے۔ اُن کی ماں اور دیگر اعزہ دہلی میں موجود تھے، اور میر کی طرح خسرو بھی دہلی کے عاشق تھے۔

تا بعد دو ماہ از رہ دور آمد بہ اودھ سپاہ منصور

سلطان نظرے بلطف بکشاد و اقطاع اودھ بحاتم داد

شد شہر اودھ حوالۂ خاں شد دہر ابر نوالۂ خاں

با آں کہ نداشتم صبوری افتاد سکونتم ضروری

لیکن فراق کی درد بھری داستان سننے کے قابل ہے

شبہا من و دل بغم نوازی با یاد تو در خیال بازی

درد ے وہزار آہ جاں سوز آہے بہزار تیر دل دوز

دل رفتہ و من بخاک ماندہ جاں بر شرف ہلاک ماندہ

اس دوران میں کچھ نئے دوست بھی اُس ملک میں پیدا ہو گئے تھے۔

با آں کہ ازیں ولایت خوش یارے دو سہ اند نغز و دلکش

از حالت من در آرزو یست عاشق شدہ ہمچو من بر ویست

با من بود انست شب و روز دل سوختہ را قناعت آموز

مگر دہلی کی صحبتیں رہ رہ کر یاد آتی تھیں:-

کو آں بہ وفا ہم نشستن دل در طرب و نشاط بستن

گاہے بہ بدیہۂ دل آویز سفتن گہر بخامۂ تیز

گہ جام نشاط نوش کردن گہ زمزمہ تر بگوش کردن

گہ کردن گشت سوے بستاں گاہے بہ طواف حوض سلطان[*]

---

* دہلی کا حوض شمسی جو التمش نے بنوایا تھا۔

مفارقت کا حال:-

هر شب منم و دلے و دردے　　غم را بدو چشم آب خوردے
شب در روز کنم آہ جاں سوز　　زیں گونہ بود شب را روز
یکشب من و دل - چراغ در پیش　　جانے بہ ہزار داغ در پیش
بودیم ہمہ بہ گفت و گویت　　محرم نہ کسے بجز آرزویت
گفتم کہ ازیں اسیر بیداد　　یاد آیدت یا نیاید یاد

اُس زمانہ میں برسات کا موسم تھا - اودھ کی برسات کا منظر خسرو کے قلم نے اس طرح کھینچا ہے:-

عین بنگال وقت باراں　　خیمہ زدہ ابر را سواداں
می گفت ترانہ ابر سرمست　　بود آب برقص و برق می جست
باراں بہ ہوا بقطرہ سازی　　قطرہ بہ زمیں بحلقہ بازی
گریہ ز من و ز ابر ہم باد　　بیرون و درون خانہ نم باد
تا وقت سحر قلم در انگشت　　در تاریکی ہمی زد انگشت

امیر خسرو کا درد و سوز مشہور ہے - اُنکے شیخ اُنکے دردِ سینہ کو وسیلۂ مغفرت بتاتے ہیں - اس خط میں بھی اُس درد کا جا بجا نشان ملتا ہے -

ایک دوسرا خط نثر میں رجب ۶۸۶ھ میں اودھ سے بھیجا ہے - اُس میں کیقباد اور بغرا خاں کے باہمی میل اور اپنے مدتوں کے بچھڑے دوستوں سے ملاقات کا ذکر کیا ہے - ان میں سے شمس الدین دبیر اور اثیر الدین بھی ہیں[۱] - جب سلطان بلبن نے اپنے بیٹے بغرا خاں کو بنگال کا صوبہ دار بنا کر بھیجا تھا تو یہ دونوں اُسکے ساتھ تھے - اب بعد مدت اُن سے ملنا ہوا تو خوب لطف سے وقت کٹا - جدائی کا شکوہ ہوتا رہا -

"لختے شکایت از دورانِ روزگار درمیاں آورد کہ شیوۂ آبائے علوی و امہات سفلی ہست کہ ابنائے جنس و اخوان انس را چوں بنات النعش از ہمدگر متفرق می دارد .... ہر یکے از ہمہ سبب را یاد کردے علی العموم می کرد علی الخصوص آں نجم ما را"

دریا پار جہاں بنگال کا لشکر ٹھہرا تھا، اثیر الدین سے ملاقات ہوئی - رات کو عشا کے قریب پہونچے تو وہ ان سے مل کر بڑا متعجب ہوا،

---

[۱] یہ دونوں اُس دور کے مشہور اہل قلم اور منشی تھے -

این تو ئی یا بخواب می بینم که بشب آفتاب می بینم!

شبا روزے بر یادآں عزیز شب را بروز و روز را بشب آوردہ شد"

تیسرے دن اپنے دوست شمس الدین کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر کنارے پہونچے اور وداع کہکر رخصت ہوئے۔ راستہ میں حاتم خاں کو اودھ کا صوبہ ملا۔

یہ مختصر مجلس ختم ہوئی اور عین برسات میں سرجو ندی کے کناروں سے جہاں دونوں لشکروں کے پڑاؤ تھے وہ شہر اودھ کو روانہ ہوئے۔

"ہم در اثناے راہ مخدوم بندہ بمنزلت اقطاع اودھ شرف دست بوسی یافت بندہ کہ چوں عطارد در شعاع آں آفتاب است نتوانست کہ بخانۂ خویش راجع شود ضرورت باستقامت آں طرف رضا داد۔ ملک بے مثال بہ طلب مثال ولایت برسر رفقت رکاب فرقد ساے اعلیٰ منطقۂ جوزا بمیان بست .... موسم باراں بود ..... درعین باراں در باران عین چوں آب سرد بجانب اودھ رواں کردہ شد۔

ابر می بارد و من می شدم از یار جدا | چوں کنم دل بچنیں وقت ز دلدار جدا
ابر و باران و من و یار ستادہ بوداع | من جدا گریہ کناں ابر جدا یار جدا

.... مردم چشمم از شرح فراق دوستاں رشح می ترادید۔ و ابر چوں ہوا خواہاں می گریست۔ پاے مرکبم در آب چشمہا می لغزید و برق چوں سحرگاں می خندید۔

بگو نہ برق نخندد کہ ژالہ سنگ انداز | حباب شیشہ گری را کشادہ کردہ دکاں

"تا بدیں طریق ایں خراب از معمورۂ اودھ آمد ...." (اعجاز خسروی رسالۂ پنجم)

اودھ پہونچنے کے واقعات قران السعدین میں یوں بیان کیے ہیں:-

با علم فتح دراں راہ دور | سایہ فشاں شد بجہ کیقباد پور
خاں جہاں حاتم مفلس نواز | گشت با قطاع اودھ سرفراز
من کہ بدم جاکر او پیش ازاں | کرد کرم آنچہ کہ بد بیش ازاں
تا زچناں بخشش جاکر قریب | بندہ شدم لازمۂ آں رکیب
در اودھم برد بلطفے چناں | کیست کہ از لطف بتابد عناں
غربتم از احسانش چنانم گذشت | کم وطن اصل فراموش گشت
در اودھ از بخشش او تا دو سال | ہیچ غم دنیا نبود از منال (ص ۲۲)

اگرچہ وہ اودھ میں بہت آرام سے تھے، لیکن ماں دہلی میں انکی جدائی میں تڑپ رہی اور بلانے کے لیے

پر خط بھیج رہی تھی - آخر اُن کی محبت نے انھیں اودھ میں نہ بیٹھنے دیا - اور وہ حاتم خاں سے اجازت لیکر دہلی چلے آئے :-

من ز پئے شرم جدا از خویش | رفتہ زجائے خود و پیوند خویش
مادرِ من پیر زن سیجہ سنج | ماندہ بہ دہلی ز فراقم برنج
روز و شب از دوری من بیقرار | سوختۂ داغ من ناکام کار
در غم و زاری ز جدا ماندنم | نامہ نویساں زپے خواندنم
چوں کشش سینہ زغایت گزشت | باعثۂ دل ز نہایت گزشت
حالِ خود و نامۂ امیدوار | باز نمودم بخداوندگار
داد اجازت برضائے تمام | تا ہم اندر رہِ مقصود گام
خرچ رہم زاں کفِ دریا اثر | گرم رواں کرد بہ کشتی زر
تا ز چناں بخشش مفلس پناہ | شکر کناں پائے نہادم براہ (ص ۱۲۱-۱۲۲)

اسکے بعد وہ دربار شاہی میں پہونچے اور اخیر عمر تک دربار دہلی کے ملک الشعراء رہے - پھر امیر خسرو کا اودھ میں رہنا نہیں ہوا -

کلامِ محمود

(جناب محمود اسرائیلی)

شبِ فرقت مجھے کتنی بڑی معلوم ہوتی ہے! | قیامت کی گھڑی اک اک گھڑی معلوم ہوتی ہے!!
مجھے تدبیر میں قسمت بڑی معلوم ہوتی ہے | اسی حلقے کی یہ بھی اک کڑی معلوم ہوتی ہے
لبِ گلگوں میں اُنکی تابشِ دنداں کو کیا کہیے | کلی کے منہ میں موتی کی لڑی معلوم ہوتی ہے
لبِ دریا حبابوں کی چمک کیا لطف دیتی ہے | زمیں نیلم کی ہیروں سے جڑی معلوم ہوتی ہے
وہ بھلا وہ رندِ مشرب اور آئیں خانقاہوں میں! | ان حضرت کی کوئی مشکل اڑی معلوم ہوتی ہے!!
گنہ کیا، جب تصور بھی گنہ کا دل میں آتا ہے | اجل مجھکو مرے سر پہ کھڑی معلوم ہوتی ہے
ہر انساں زندگی میں موت کو آساں سمجھتا ہے | یہ منزل سب کو مرنے پر کڑی معلوم ہوتی ہے

بہشت آباد ہے محمود کے جس گوشۂ دل میں
اُسی کے پیچھے یہ دُنیا پڑی معلوم ہوتی ہے

ہنگامۂ عالم

(جناب مسٹر مظفر علی قدوائی)

سبحان اللہ۔ ذرا خیال فرمائیے۔ ایک کاہل آدمی اور یہ موضوع۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ تماشے کا سب سے زیادہ لطف اُنھیں کو آتا ہے جو دُوسرے دیکھا کرتے ہیں۔ اب مجھے دیکھیے۔ میں ہوں، اور میرا گھر۔ ایک بڑے بازار میں جہاں ہر وقت آمدورفت کا ہنگامہ رہتا ہے' ایک آباد سڑک کے کنارے اپنے ٹوٹے برآمدے میں بیٹھا ہوں۔ "قناعت اور کاہلی کا حقہ" میرے مُنہ سے لگا ہے۔ شہد کا مرتبان اور "چنیا بیگم" سے معروفِ اختلاط ہوں۔ اس قدر اہم اور خود فراموش مصروفیتوں میں بجز اسکے اور کیا ممکن ہے کہ "ہنگامہ عالم" کی دلچسپیوں کا بس دُور ہی سے مشاہدہ کروں۔

جن ہستیوں کو اس ہنگامہ سے تھوڑا سا بھی تعلق ہے وہ ہمیشہ عدیم الفرصت ہی نظر آتی ہیں۔ اسکی قید نہیں کہ وہ ہستی خود بھی اس ہنگامہ میں شریک ہو۔ میرے سامنے آنے جانے والوں کا ایک بے سروپا اژدہام ہے جس کی نہ تو ابتدا ہی معلوم ہوتی ہے اور نہ انتہا۔ رات دن کانوں میں بے شمار قدموں کی تیز آوازیں آیا کرتی ہیں۔ بعض دوڑتے ہیں تو بعض قدم اُٹھائے گردن جھکائے تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ بعض تھک کر رُک گئے ہیں تو بعض ناہموار قدم ڈال رہے ہیں۔ غرضکہ ہر شخص مصروف جدوجہد ہے۔ ہر انسان اس بے ترتیب و منتشر تگ و دو میں شریک ہے اور اپنی تمام سعی سے اُس اُفق کامیابی تک پہونچ جانا چاہتا ہے جو ہر ہر قدم پر اُس سے دُور ہوتا جاتا ہے۔

اس ہجوم کو ——— جس میں مرد، عورت، جوان اور بوڑھے، خوش خو، سادہ لوح، نیک نہاد اور بدطینت، امیر، غریب، پُر مذاق اور مغموم، ہر قسم کے انسان شریک ہیں۔ طاقت ور کمزوروں کو ایک طرف ڈھکیلے دیتے ہیں، چالاک احمقوں کے پاس سے ہنستے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ جو پیچھے رہ گئے ہیں آگے جانے والوں کو ڈھکیل رہے ہیں اور جو آگے نکل گئے ہیں پیچھے والوں کو لاتیں مار رہے ہیں ——— غور سے دیکھیے اور اس انسانی تمدن کے جزر و مد سے لطف اُٹھائیے۔

یہاں ایک ضعیف آدمی تھک کر ہانپ رہا ہے تو وہاں ایک کمزور، خستہ، معصوم دوشیزہ ایک سخت گیر خاتون کی دہشت سے سہمی جا رہی ہے۔ کہیں ایک شوقین طالب علم دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کتاب پر نظر جمائے، جھکے کھاتا ہوا گزر رہا ہے' تو کہیں ایک تھکا ہوا انسان ایک عمدہ لباس والی خاتون کو

"گلستاں بکنار" لیے جا رہا ہے — یہاں ایک نوعمر لڑکا نگاہ یاس سے اُس دلفریب بستی کو دیکھ رہا ہے جو اسکا وطن ہے اور جسے شاید اب زندگی میں وہ دوبارہ نہ دیکھ سکے گا، تو وہاں ایک قوی اور کشیدہ قامت انسان لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ کہیں ایک کمزور دُبلا پتلا آدمی بھیڑ سے بچتا ہوا ناتوانی کے باعث لڑکھڑا کر رک جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ آگے بڑھ رہا ہے تو کہیں ایک مکار بدمعاش زمین کی طرف سر جھکائے اور مجمع پر ترچھی نظریں ڈالتا ہوا سڑک کے اس رُخ سے اُس رُخ تک چلا جاتا ہے۔ یہاں ایک شریف صورت نوجوان کبھی اپنے گرد آلود پیروں کو دیکھتا ہے اور کبھی اُس "دُور از نگاہ" مقام کو جو اس کی منزل مقصود ہے، تو وہاں ایک فلسفی، ایک شاعر، اپنے خیالات میں محو، شعر کی رنگینیوں میں غرق "سرود گریاں" اور "انگشت در حرکت بے معنی" اپنے سے باتیں کرتے ہوئے سرگرم جادہ پیمائی ہے — بے وقوفوں کا ایک بے سروپا مجمع، ناوانوں کا ایک جم غفیر — شہزادہ و فقیر، گناہگار و پارسا، قصائی اور نانبائی، درزی اور موچی، کسان اور ملاح — غرض کہ تمام ہستیاں ایک ہی موج میں ادھر سے اُدھر تھپیڑے کھا رہی ہیں —

کہیں ایک منصف "کلاہ انصاف" سر پر رکھے، داڑھی ہلاتا ہوا دھونس جما رہا ہے تو کہیں ایک پارچہ فروش "سراگی" اپنے نیلے کپڑوں میں مست ہے — کہیں ایک سپاہی سُرخ وردی پہنے اور سینہ تانے اکڑا ہوا ہے تو کہیں بیچارہ خاموش اور پراگندہ خیال درزی لمبے ڈورے والی سوئی کو ٹوپی میں لگائے، گردن جھکائے، کپڑے کے گز کو کھولتا اور لپیٹتا چلا جا رہا ہے — کہیں ایک طالب علم اپنی کتاب کی ورق گردانی کر رہا ہے تو کہیں ایک "عطر بیز" دکاندار اپنے چمکدار کپڑوں کی جگمگاہٹ دکھا رہا ہے — کہیں ایک دماغ "سیاست داں" اپنی قانون سازی کے غلغلہ کو عرش بریں تک پہنچا دینے کی کوشش کر رہا ہے تو کہیں ایک اشتہاری حکیم "نادر الوجود مرکبات" کی تبلیغ میں سرگرم ہے — کہیں مکار سرمایہ دار اپنا جال بچھا رہا ہے تو کہیں غریب "سوکھا مزدور" اپنی سعی لاحاصل پر گریہ و زاری کر رہا ہے — کہیں ماہر کیمیا ہے تو کہیں "بوٹ پالش" — کہیں شاہ ہے تو کہیں "خواہ مخواہ مرد آدمی" — کہیں ایک وزیر مجلس عاملہ ہے تو کہیں ایک "معنوی تو عمر" رقاصہ — کہیں "لیڈر" تمام دنیا کو اپنے نظریہ کا نشان بنانا چاہتا ہے تو کہیں ایک حکومت پرست ہے جو "پچاس روپیہ یومیہ" لیکر سفید کو سیاہ کر دکھانا چاہتا ہے اور ذاتی مفاد کے لیے "محبت قومی" کو فروخت کیے دیتا ہے — کہیں ایک "مقدس آدمی" ہے تو کہیں ایک جواری — کہیں محتسب ہے تو کہیں رند ناداں — غرضکہ ہمہ کائنات بیک وقت ہنگامۂ عالم میں شریک ہے — پنجوں، گالیوں، دعاؤں، کوسنوں، گانوں،

قہقہوں اور گریۂ غم کا ایک ہنگامہ ہے اور پھر بھی سب "میدانِ ہستی" میں ایک دوسرے کے "ہم رکاب" ہیں ان کی رفتار کبھی کم نہیں ہوتی - اس دوڑ کا اختتام کہیں ہے ہی نہیں - نہ تو اس راہ میں سرائیں ہیں کہ آرام کر لیں اور نہ ایسے پُرلطف مناظر جن سے روح میں تازگی پیدا ہو سکے - نہ تو سکون ہے اور نہ سایہ دار درخت کہ تھک کر اُن کے "تلے" بیٹھ جائیں —— موسم کیسا ہی کیوں نہ ہو ان لوگوں کے نصیب میں شرکتِ ہنگامہ ہی ہے - مبادا کہ پیچھے آنے والے ان کو روندتے ہوئے نکل جائیں -

ان کے دماغوں میں ارتعاش ہے، اور اعضا میں کپکپی - لیکن اُس وقت تک یہ "اس ہنگامہ" سے علیحدہ نہیں ہو سکتے جب تک دل دھڑکنا نہ چھوڑ دے - آنکھیں "حسن کے پاؤڈر" کی طرح سفید اور بے رونق نہ ہو جائیں، اور ایک یہ "اقساط" آنے والی آواز اس کا اعلان نہ کر دے کہ پیچھا کرنے والوں کو ایک قدم آگے بڑھنے کا موقع مل گیا ہے —— اس "مردم کش" رفتار اور "ہنگامۂ آرزو" میں شامل ہو کر بھی ایک "کاہل آدمی" کے سوا کون یہ کر سکے گا کہ اس سے لطف اندوز ہو سکے - بجز "کاہل" کے کون ایک دیر میں ہوشیار ہونے والے مسافر کی طرح مُنہ کھولے، آنکھیں پھاڑے، کارروانوں کو گزرتا دیکھا کرے گا اور دوڑ کر ان میں سے کسی میں شریک نہ ہو جائے گا —— کم سے کم مجھے تو اس کا اعتراف ہے کہ "سرِ راہ ٹوٹا سا ایک برآمدہ" —— "قناعت اور کاہلی کا حقہ" —— "شہد کا مرتبان" —— اور "چڑیا بیگم کا خرامِ ناز" —— ایسے استعارے ہیں جو میری فطرت کو صحیح معنوں میں پیش کر رہے ہیں —— میں جانتا ہوں کہ بہت سے پڑھنے والے اس میں فلسفہ کا رنگ دیں گے —— کوئی اسے "اپنے رنگ میں مستی سے" تعبیر دے گا اور کوئی اسے "قناعت" سمجھے گا —— لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس دُور سے دیکھنے پر بھی میں "ہنگامہ عالم" سے لطف اندوزی کا دعویٰ نہیں کر سکتا - اور پھر ایسی حالت میں جبکہ چاروں طرف پُرکیف مظاہرات ہوں —— سچ کہوں! میں فطرتاً تو ایسا "افغانی" ہوں جو کسی جگہ مجمع دیکھ کر اپنے بچے کو اس لیے بھیج دیتا ہے "نہ وہ کیفیت سے آگاہ کر دے" اور خود اس کا منتظر رہتا ہے کہ کہیں جھگڑا فساد ہو رہا ہو تو پہلے موقع پر "سعادتِ شرکت" حاصل کر لے - اب اسے کیا کروں کہ موقع ہی نہیں ملتا اور اگر ملے گا تو اُس وقت ملے گا جبکہ ہستی کی آگ دَب گیا تو ختم ہو جائے یا "چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے" —— اس میں میرا کیا قصور ہے یہ تو قسمت کا پھیر ہے -

میں "سعی خطرناک" کا "پُر زور حامی" ہوں اور اُس میں شرکت کا متمنی، لیکن دُور سے - جب میں یہ سنتا ہوں کہ تمام دُنیا اس میں شریک ہے اور ایمان داری و جوان مردی سے اپنے لیے راہ نکال رہی ہے تو میں بہت خوش ہوتا ہوں - کیونکہ ایسے مشاہدات انسان کے خون کے "بہادر عناصر" کو مشتعل کر دیتے ہیں۔

زندگی کی جدوجہد میں شریک ہونا، نامساعدات زمانہ سے طاقت آزمائی کرنا اصلی لطفِ حیات ہے - ہر دور میں دیو اور اژدر پیدا ہوتے رہے ہیں - اور اُس سونے کے صندوق کو حاصل کرنا جس کے یہ نگراں ہیں عملاً اتنا آسان نہیں جتنا کہ کاغذ پر لکھ دینا - کتابوں میں اکثر یہ لکھا ہوتا ہے کہ ایک شہزادہ اپنی "جوانمردی کی نمایش کے لیے" اپنے والد کے دربار سے کسی اہم کام کو انجام دینے کے لیے" بتقریب سفر محمل باندھ لیتا ہے" ---- اور دو تین سال محنت کرنے کے بعد [اب اس کی اصلیت کو خدا ہی جانتا ہے!] دولت دنیا سے چھکڑے لاد کرلے آتا ہے اور ایک حسین پریوش شہزادی "مزید برآں" ---- لیکن کسی نے یہ بھی غور کیا ہے کہ ان افسانوں کے مصنف کوئی ایسے ذرائع نہیں بتلاتے ہیں جس سے یہ ہر کس و ناکس کے لیے "ممکن الحصول" ہو جائے ---- اور اسی پر مجھے بڑا غصہ آتا ہے - کیونکہ اگر کوئی ایسے طریقے واقعی ہیں تو ان پر عملی جدوجہد واقعی بڑی پُر لطف ہوگی -

ہزاروں میں ایک ناول نویس بھی ایسا نہیں ہوتا جو اپنے "ہیرو" کا سچا قصہ لکھ دیتا ہو - دس بارہ صفحوں میں چائے کی دعوت کا ذکر ہوتا ہے پچیس سائٹھ صفحوں میں ناچوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور باقی کتاب میں ایسا ہی "اٹم غلم" چلیے "ناول قریب الختم" ہوگیا - آخر میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اب وہ ہمارے ملک کا ایک بڑا بھاری تاجر ہے اور عظیم الشان میر - یا ایک بڑا ماہر فن ہے - غرضکہ دنیا بھر میں کیا ہے اور تمام دنیا اس طرح اُس کے آگے سرنگوں ہے جس طرح ایک کمزور درخت تیز ہوا کے سامنے یا ایک ضعیف انسان گردش روزگار کے روبرو - مختصر یہ کہ جیسی خدا نے اُس کی پھیری ویسی ہی سب کی پھیرے - سچ پوچھیے تو یہ چھوٹے چھوٹے "دل بہلاؤ" اور "وقت گزار" افسانے اُن بڑے بڑے ناولوں سے کہیں زیادہ مبنی بہ حقیقت ہوتے ہیں کیونکہ ان میں بتایا جاتا ہے کہ کس طرح ایک "دفتری بچہ" ایک بڑی مالہ کی تجارتی افواج کا افسر اعلیٰ بن گیا - یہ قصے ہمارے ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ کیونکر ایک "دو آنے کا بیرسٹر" عدالت عالیہ کا جج بن گیا - دراصل وجود کی دلچسپیاں چھوٹی چھوٹی تفصیلات میں ہوتی ہیں "محیر العقول نتائج" میں نہیں ----

فی زمانہ ہم کو ایسے ناولوں کی ضرورت ہے جو ذی حوصلہ انسانوں کی دماغی الجھنوں کا خاکہ ہوں - انکی سعی و پریشانی، امید و ناامیدی، کامیابی اور ناکامی، اچھی طرح واضح کر دیتے ہوں مجھے یقین ہے کہ "دوشیزۂ بخت" سے اظہارِ عشق کا افسانہ اتنا ہی پُر کیف ہوگا جتنا کہ ایک "حورِ بہشتی کی گرویدگی" کا ذکر ---- اگرچہ دونوں کا نفس مطلب ایک ہی ہوگا - کیونکہ گزشتہ حکما کے بہ قول قسمت بھی "عورتوں" ہی سے ملتی جلتی ہے گو کہ وہ "عورت" کی طرح "بے وجہ غیر مستقل مزاج" نہیں ہوتی ---- اس لیے اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک کی جستجو دوسری کی تلاش ہے - "بن جانسن" Johnson کہتا ہے کہ

ایک عورت کو چاہو، وہ تم سے نفرت کرنے لگیگی۔ اُس کی تلاش کرو وہ
تم سے بھاگیگی، لیکن اُسکی طرف سے بے توجہ ہو کر اُسے تنہا چھوڑ دو تو وہ تم کو
چاہنے لگیگی، اور تمھاری تلاش شروع کر دیگی۔

اور یہ مقولہ قسمت اور عورت دونوں کے باب میں صادق آتا ہے۔ ایک عورت اُس وقت تک اپنے عاشق کی قدر نہیں کرتی جب تک کہ وہ "یوسفِ بے کارواں" نہ ہو جائے۔ اسی طرح جب تک تم "لاتوں سے قسمت کی تواضع نہ کرو" اور اس کی طرف سے مُنہ نہ موڑ لو وہ ہرگز تم پر لطائفِ حیات کی بارش نہیں کرتی۔ لیکن ہمیشہ اُس کی مسکراہٹ بالکل یہ شعر ہوتی ہے

کی مرے قتل کے بعد اُسنے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اور اس تبسمِ بے محل کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہے کہ اس عالم میں کوئی عطیہ کبھی بروقت نہیں ملتا اور بس——

خیر! —— اچھے آدمی آج تک کبھی "صحیح قسم کے" ہوتے ہی نہیں۔ ورنہ میرے اور اُنکے خیالات کا مطابقت نہ کرنا کیا معنی؟ —— میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر دُنیا سے حوصلہ مند انسان غائب ہو جائیں تو دُنیا "سُنسان" ہو جائیگی —— دراصل حوصلہ مندانہ "آزادیٔ حیات" میں ایسا نہیں ہے جو زندگی کو مزہ دار بنا دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر دنیا ترقی کر ہی نہیں سکتی۔

"فلسفی کہتا ہے کہ حوصلہ مندی "سکون" کے لطف کو تباہ کر دیتی ہے۔ لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر وہ لوگ کیسے "گم کردہ راہ" ہو سکتے ہیں جو صبح سے شام تک اپنی کوششوں کو تم کیے ایسی راہیں بنایا کرتے ہیں جن پر بنی نوع انسان کو آگے بڑھنے کا موقع مل سکتا ہے —— وہ کیونکر غلطی پر ہو سکتے ہیں جو اپنی ذہنیت کو ایسے وقت بھی صرف کرتے ہیں جبکہ کائنات کھیل کود میں مصروف ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی محنتوں کا صلہ "ریاستوں کی تنخواہ" نہیں ہونے دیتے، جو کبھی پوری طرح ملتی ہی نہیں۔ لیکن اپنے مقاصد کے لیے کام کر کے وہ ہم کو بھی نفع پہونچاتے ہی ہیں۔ انسان کو وہ جذبۂ ایثار ودیعت نہیں ہوا ہے جو "دیوتاؤں" کو ہوا کرتا تھا۔ بنی نوع انسان ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ کوئی فرد صرف اپنے کو فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔ اپنی بہتری میں جو قدم آگے بڑھایا جاتا ہے اُس سے خود بخود تمام عالم کی بہتری ہو جاتی ہے۔ ایک چشمہ بہنے کی سعی میں پن چکی کو چلاتا ہے۔ گھونگھے نے کیڑے اپنا گھر بنانے کی جد و جہد میں ایک ملک کو دوسرے سے ملا دیتے ہیں، اور حوصلہ مند انسان اپنی طمع

لبند کرنے کی کوشش میں ایک معیار رفعت چھوڑ جاتا ہے۔ اسکندر (Alexander) اور قیصر (Caesar) اپنے حوصلوں کو پورا کرنے کے لیے جنگ آزما ہوئے لیکن انھوں نے نصف عالم کو مہذب بھی بنا دیا۔ اسٹیفنسن (Stephenson) نے اپنی شہرت اور دولت کمانے کے لیے ریل کا انجن ایجاد کیا، لیکن آج لاکھوں بلکہ کروڑوں آدمی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ آغا حشر اور شکسپیر (Shakespeare) نے اس لیے ڈرامے لکھے کہ ان کی آمدنی سے انکے بیوی بچے آرام اٹھا سکیں۔ لیکن ہزاروں آدمی ان سے لطف اٹھاتے ہیں اور سبق بھی حاصل کرتے ہیں۔

ایک حد تک تو "کم حوصلہ" اور "قانع انسان" بھی بجا ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ مصوری کے لیے ایک اعلیٰ معیار قائم کر جاتے ہیں۔ اور دراصل حوصلہ مندوں کی جد وجہد کے قدر شناس ناظر ایسے ہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ جب تک قانع لوگ اپنے خیالات کی تبلیغ نہ کریں۔ میں انکے خلاف ایک لفظ بھی کہنے کا مجاز نہیں۔ لیکن خدا کے لیے اُن کو یہ موقع نہ دیجیے کہ وہ تمام دنیا میں مارے مارے پھریں اور اس کی تبلیغ کریں کہ وہ خدا کی صناعی کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ کیونکہ درحقیقت وہ لکھیوں کے جھتے میں ناکارہ "بڑے مکھے" ہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو سڑکوں پر ٹخنوں سے اونچے پاجامے پہنے، منہ کھولے، بال بکھرائے، اور بے شمار پان کھائے صرف اس لیے سرگشت کیا کرتے ہیں کہ دنیا کی مشغولیت کا اپنے نقطۂ نظر سے مشاہدہ کریں۔ اس لیے اُن کو یہ سوچنے کا موقع بھی نہ دیجیے کہ وہ بے حد دانشمند اور فلسفی ہیں اور قناعت ایک نعمت ہے۔ کیونکہ اُن کو ایسا سوچنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ سچ ہو کہ ایک قانع آدمی ہر کہیں خوش رہ سکتا ہے۔ لیکن بالکل یہی حال "خر خراسانی" کا بھی ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے جہاں دنیا چاہتی ہے اُن کو دھکیل دیتی ہے اور جس طرح چاہتی ہے اُن سے سلوک کرتی ہے۔ اکثر اُن کی بابت یہی کہا جاتا ہے کہ "انھو، وہ اپنی حالت پر قانع اور خوش ہیں۔ اُن کو کیوں گڑبڑاؤ"۔ آخرکار یہ ہوتا ہے کہ قانع انسان جہاں ہوتا ہے وہیں رہ جاتا ہے اور دوسرے بڑھ جاتے ہیں ———

اگر تم اپنی حماقت سے قانع واقع ہوئے ہو تو سر اٹھاؤ اور ہرگز قناعت کو ظاہر نہ ہونے دو۔ بلکہ دوسروں کے ساتھ ہنگامے میں شریک ہو جاؤ۔ اگر تم کو تھوڑی چیز درکار ہو تو بہت مانگو۔ کیونکہ اگر تم ایسا نہ کروگے تو تم کو کچھ نہ ملے گا۔ اس دنیا میں "دعی کا طریقہ طلب" اختیار کرنا زیادہ سودمند ہے۔ اور مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک کی ضرورت پڑے تو دس مانگو۔ سو کی ضرورت ہو تو ہمیشہ ہزار مانگو کیونکہ اگر تم سو مانگوگے تو صرف دس ملیں گے۔ اس مشہور کلیہ پر عمل نہ کرنے ہی سے "عمر خیام" کو اتنی

دشواریاں اٹھانا پڑیں۔ اُس نے اپنی دنیاوی بہشت کے لیے "ایک جھونپڑا، ایک حسین کم عمر نازنیں اور شراب ناب ہی کو کافی تصور کیا"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جھونپڑا اور شراب تو خیر جوں توں مل گئے لیکن دنیا کو جنت کر دینے والی نازنین اس کے مقدر سے یک قلم نابود ہو گئی ——

اس کے برخلاف اگر وہ ایوان شاہی، پرستان، اور شراب سے بھرے ہوئے سمندر مانگتا تو اسکے حوصلوں کی بلندی دیکھ کر اُسے یہ تینوں چیزیں ایک حد تک ضرور عطا کر دی جاتیں —— فارغ انسان کے لیے زندگی بھی کس قدر غیر دلچسپ مسئلہ ہو جاتی ہے —— آخر ان کا وقت کیسے گزرتا ہے۔ اور کون سی تمنا ان کے خیالات کو مشغول رکھتی ہے —— ہستی کا مفہوم صرف شکر گزاری اور عبادت ہی تو نہیں — اخبار بینی اور "حقہ بازی" تو شغلۂ عوام ہے اس میں اب وہ لطف کہاں سچ یہ ہے کہ فارغ اشخاص تو توقعات کی دلچسپیوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور نہ کوششوں کی سرتوں سے آشنا —— ایک عالی ہمت انسان کے لیے زندگی ایک پُر لطف بازی گاہ ہے جہاں ہوشیاری اور ہنرمندی کا امتحان ہوتا ہے —— اور اس بازی کو جیتنے کے لیے ایک کھلاڑی اور چابکدست انسان اور نہ چوکنے والی نظر کی ضرورت ہے —— ایسے لوگ اس میدان میں سراسیمگی کو بھی نشاط بے حد خیال کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ایک غواص غوطے لگانے کو اور ایک کھلاڑی اپنی تیز رفتاری کو —— اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات غوطہ لگانے والے غوطے کھانے لگتے ہیں۔ لیکن "سعی فتح" کے ناکام ہونے پر صرف "آپ مقابلہ ہی مسرور کر دیتی ہے اور اس خیال سے تشفی ہو جاتی ہے کہ کم سے کم وہ بیکار تو نہ تھا ——

محنت کی ناکامی میں بھی وہ کیف ہے جو چارپائی پر لیٹ کر وقت گزارنے میں ہرگز نہیں ہوتا —— اس بازی گاہ کے ہر کھلاڑی کے لیے انعامات ہیں اور اس میں شرکت کرنے کے لیے "ملکی و غیر ملکی" کی کوئی شرط نہیں۔ عمر رسیدہ تجربہ کار آدمی کے لیے یہاں دولت ہے اور نوجوانوں کے لیے شہرت —— عورت کے لیے آبرو اور حسن ہے، احمقوں کے لیے دلچسپیاں اور کاہلوں کے لیے قہقہے ——

پس اے معزز ناظرین (بلا امتیاز جنس) اُٹھیے اور اس ہنگامہ میں سعادت شرکت حاصل کیجیے۔ کیونکہ جو کوئی اس سے واپس آیا ہے کبھی خالی ہاتھ نہیں آیا —— جو کامیاب ہوتا ہے اُسے انعام ملتا ہے اور جو ہار جاتا ہے وہ یہ کہہ کر خوش ہو لیتا ہے کہ:—

"مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا"

(ترجمہ)

بابا افضل الدین کاشانی مرقی

شعر کے حسن و عیب کی تمیز بڑی حد تک ذوق سے متعلق سہی لیکن بعض اوقات شاعر کی زندگی اور اسکا ماحول محاسن کلام میں اس قدر اضافہ کر دیتے ہیں کہ انکے جانے بغیر ذوق انسانی شعر کی حقیقی خوبی تک نہیں پہونچ سکتا۔ کبھی شعر میں تلمیح ہوتی ہے اور وہ تلمیح بھی شاعر کی شخصیت سے تعلق رکھتی ہے لہذا جب تک شاعر کی حیثیت اور اُس کی ذات کے متعلق ہم کو واقفیت نہ ہو شعر کی داد تحسین ناشناس سے زائد مرتبہ نہیں رکھتی۔ شعرا کے حالات بیشتر تو انکی سوانحعمریوں اور تذکروں سے معلوم کیے جاتے ہیں لیکن فی الجملہ شاعر کا کلام بھی اُس کی ذات اور شخصیت کا ترجمان بن جاتا ہے اور اُس کی تربیت دماغی کے مدارج، اُسکے جذبات و حسیات کا عکس اُسکی تحریروں سے نظر آتا ہے تاہم اگر تفصیلی طور پر معلوم کرنا ہو کہ فلاں شاعر کو شاعر بنانے میں کون احول معین و مددگار تھا اُسکے دور میں کیا فضا تھی اور اُسکے اردگرد کن کن دماغوں کا ہجوم تھا جس نے اُسکے ارتقاء روحانی اور ذہنی نشو و نما میں اعانت کی تو پھر اس کے سوانح حیات پڑھنا ضروری ہیں جن سے پتہ چل جائے گا کہ شاعری میں جو روحانیت اور تصوف کا رنگ ہے یا تغزل اور مدح سرائی کا لہجہ ہے یا فلسفہ اور اخلاقیات کا پرتو ہے، تو انکے اسباب کیا تھے۔ دیکھیے جب تاتار کا طوفان شیرازۂ عالم کو درہم برہم کر رہا تھا، خانماں برباد اور خانوادے اُجڑ گئے تھے، سر بفلک عمارتیں سطح زمین بن گئی تھیں، مساجد اور معابد کی اینٹ سے اینٹ بجی، عبادت خانے ویران اور خانقاہیں مسمار کر دی گئیں، بڑی بڑی مقتدر اور ذی رتبہ ہستیاں کاسۂ گدائی لیے نان شبینہ کو محتاج نظر آنے لگیں۔ غرض انقلاب دوراں نے دنیا کی ناپائداری اور جاہ و جلال کی غیر استواری کا منظر آنکھوں کے سامنے کر دیا تو شیخ سعدی، ابن یمین، خواجہ حافظ جنھوں نے بے ثباتی کے نقوش کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔۔۔۔ اپنے اپنے تاثرات کو کلام میں ظاہر کرنے لگے اور دیکھنے اور پڑھنے والے اسے سوز اور تڑپ کی تصویر سمجھے اور اب بھی سمجھتے ہیں۔ فارسی شعرا سے قطع نظر ہر زبان کے حقیقی شاعر کا کلام اُسکے حالات اور ماحول کا ایک حد تک ترجمان ہوتا ہے۔ اس کے زمانہ کی فضا اور بیرونی حالات جس طرح کے ہوتے ہیں اُسکی شاعری میں اس کا پرتو نظر آتا ہے۔ میر تقی کے کلام کا غالب عنصر یاس و حرماں سے پُر ہے۔ یہ اس لئے کہ انکے واقعات زندگی ہی یاس انگیز اور حرماں نصیب تھے۔ انشا کی ابتدائی شاعری میں رعنائیوں اور شوخیوں کی بھرمار ہے لیکن آخری کلام میں درد و بےچینی کی بہتات۔ اسی طرح ذوق کے دیوان کو مطالعہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ

شاعری بادشاہوں اور درباروں میں رسائی تھی، قدر و منزلت بڑھی ہوئی، اور اس نے مرفہ الحال او رمستغنی ہو کر زندگی بسر کی۔

جب کسی شاعر کا کلام مختلف حیثیات کی وجہ سے جاذب توجہ اور دلکش ہو تو فطرۃً ضرورت ہوتی ہے کہ اسکی ذات و حالات کے متعلق جستجو کی جائے۔ اسکے احوال سے کلیۃً ہمیں واقفیت ہو اور وہ اسباب تفصیل کے ساتھ معلوم ہوں جنھوں نے اُسکے کلام میں دلچسپی کے سامان بہم پہونچا دیے اور بڑی مایوسی اور دشلنی اُسوقت ہوتی ہے کہ جب ان امور تک ہماری دسترس نہ ہو۔ اللہ بھلا کرے پچھلوں کا کہ جہاں تک اُن سے بن پڑا اُنھوں نے بڑی حد تک اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ اور جہاں اُنکی طاقت نے جواب دیا تو تفصیل نہ سہی اشارہ ہی کر گئے۔ منجملہ ان اہل سخن کے جن کے کلام میں فی الجملہ جذب و کشش ہے اور جنکے مکمل حالات ہم تک نہیں پہونچے، ایک بابا افضل الدین کاشانی مرقی بھی ہیں جنکے متعلق عام طور پر متداول تذکروں اور تاریخوں سے مختصر حالات کا ہم کو علم ہوتا ہے اور بالخصوص اُردو تذکرہ نویس تو صفحات کتب کو اُنکے ذکرسے گویا خالی ہی چھوڑ گئے۔ حالانکہ یہ وہ بزرگ ہیں کہ اُنکے عہد کے بڑے بڑے دانشمند اور حکما اُنکی اُستادی اور عظمت[1] کے قائل رہے، اور اُنکے کلام کو قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور کیوں نہ ہوتا، اُنکے کلام میں حسن بیان، دقت معانی، دردانگیزی، طراوت اور روانی سب ہی باتیں پائی جاتی ہیں۔ بالخصوص اُن کی رباعیاں جن کی تعداد کافی ہے ہر عہد کے لوگوں کی زبانوں پر ہیں، اور ہر دور کے لوگوں نے اُن سے خاص دلچسپی حاصل کی۔

خواجہ حکیم افضل الدین کاشانی کا تذکرہ کتابوں میں تو "افضل الدین کاشانی" کے نام سے کیا گیا ہے، لیکن عام طور پر فارسی میں "بابا افضل" کے عرف سے مشہور ہیں۔ 'بابا' کا لقب زمانہ سابق میں اُن لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا جو اپنے عہد میں پیشوائی کا مرتبہ حاصل کر چکے ہوں۔ چنانچہ بابا طاہر عریاں، باباکوہی، بابا رکن الدین وغیرہم کے ساتھ بھی بابا کا لقب شامل ہے کیونکہ اپنے اپنے عہد میں یہ لوگ مرشد ابنائے زمانہ تھے۔ تذکرۂ عرفات العاشقین اور ہفت قلزم نے "افضل الدین محمد کاشانی" کے نام سے انکا ذکر کیا ہے۔ نصیرالدین طوسی جو بابا افضل کے معاصر تھے اُنھوں نے اپنی کتاب مبادی موجودات میں "شیخ افضل الدین محمد بن حسن المرقی المعروف بالنقاشی" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اسکے علاوہ انکے رسالہ منہاج المبین کے ترجمہ میں بھی جو علم منطق میں ہے یوں لکھتے ہیں

"تمت ترجمۃ منہاج المبین لاصابۃ الیقین فی المنطق للمولی وقطب العالم قدوۃ الحکما، افضل الدین محمد بن الحسن بن محمد بن خوزہ"

نصیرالدین طوسی نے اُنکے نام کے بعد مرقی لکھا ہے۔ انکی وفات مرق میں ہوئی اور انکا مزار بھی مرق میں ہے لہذا ممکن ہے کہ اُن کا مولد بھی مرق ہو جو کاشان کے مضافات میں ایک چھوٹے سے قصبہ کا نام

[1] دیباچۂ رباعیات بابا۔

ہے اور جس کا انتظام و انصرام ساوہ سے متعلق تھا۔ چنانچہ حمد اللہ مستوفی نزہۃ القلوب میں لکھتے ہیں
"آں ایالت چہار ناحیت ست ناحیہ چہارم" بوسین چیل و دو پارہ دیہ است و رودان وازنادہ و دشمیرم
و مراق ... معظم قرائے آں"
بابا افضل کا مزار اسی مرق میں ہے اور وہاں اطراف و اکناف کے لوگ اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں "تفاحہ"
اور "پیرایۂ شاہاں" جو بابا افضل کے تصانیف میں سے ہیں اور جن کا تذکرہ آگے چل کر ہم کریں گے۔ ان کے
مقدمہ میں میرزا حسین خاں مصیر السلطنۃ ایران کاشانی نے لکھا ہے
"مدفنش در کوہستان سرو سیر سمت جنوب غربی مدینۂ کاشان در بالائے قریہ معروف بمرق در دامنۂ کوہ مدفون
است نزہت گاہ غریب است ... و زیارت گاہ خاص و عام است بقعۂ عالی دارد و از تمام اطراف
کاشان و ولایات دیگر بزیارت تربتش می آیند و حکایات و خوارق عادات غریبہ ازو نقل می کنند
مرقدے دیگر از سلاطین آنجا است کہ در ایام سیر و جہاں گردی جناب بابا مجذوب بابا شدہ ... و از
سلطنت کنارہ نمودہ ... بعد از وفات بابا متکلف مزار او بودہ"
بابا افضل نے ایک چھوٹا سا رسالہ چند سوالات کے جواب میں لکھا اُس میں یوں لکھا ہے
"ایں جوابہا آخر سخن خواجہ بود چوں بہ جوارحق پیوست از مرق الخ
ہر حال سطور بالا سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بابا افضل کا مولد ہی اُن کا مدفن تھا۔
بابا افضل کے سوانح نگار کو جس سب سے بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ اُنکی تاریخ ولادت
و رحلت کی تعیین نہیں ہو سکتی۔ سب سے پہلے جس نے ان بزرگ کا تذکرہ کیا۔ وہ نصیر الدین طوسی ہیں جو ساتویں
صدی کے ارباب دانش میں شمار ہوتے تھے اُنھوں نے سیر و سلوک[1] میں جو غالباً ۶۵۳ھ یا ۶۵۴ھ میں لکھا گیا
اپنے حالات کے ضمن میں لکھا ہے
"اما پدر بندہ کہ مرد ے جہاندیدہ بود ... بندہ کمترین را بتحصیل فنون علم و استماع سخن ارباب مذاہب ..
ترغیب کردے تا اتفاق را شخصے از شاگردان افضل الدین کاشی رحمہ اللہ کہ او را کمال الدین محمد حاسب
گفتندے .. خصوصاً در فن ریاضی تقدمے حاصل کردہ بود با پدر بندہ .. سابقۂ دوستی .. داشت
بداں دیار افتاد .... و بندہ در پیش او بتعلیم ریاضی مشغول شد"
سطور بالا میں اس امر کی کوئی تصریح نہیں کہ یہ کس زمانہ یا سال کا واقعہ ہے لیکن اس کے آگے کی سطروں سے
پتہ چلتا ہے کہ یہ ۶۱۲ھ یا اسکے قریب کا واقعہ ہوگا۔ چنانچہ لکھا ہے
"ہر وقت در اثنائے سخن اہل ظاہر انکسری کردے ... و بندہ را دلپذیر آمدے و چوں خواستے بنور حق

---

[1] سیر و سلوک۔ ص ۹-۱۱

برسد از اں انتاع نودے دگفتہ انچہ لب و خلاصہ سخن ست ہنوز با تو گفتنی نیست کہ تو کودکی و روزگار ندیدہ"

ان سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن اور کودکی کا زمانہ تھا جب نصیر الدین طوسی نے کمال الدین صاحب کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیے تھے۔ اور چونکہ اس زمانہ میں لوگ عام طور پر ۱۴۔۱۵ سال کی عمر میں علم ریاضی کی تحصیل کیا کرتے تھے لہذا اس قرینہ سے پتہ چلتا ہے کہ طوسی نے کمال الدین صاحب کی شاگردی ۶۱۲ھ کے قریب اختیار کی تھی اور جب موخر الذکر بابا افضل کے شاگرد تھے تو انکا سن بھی غالباً ۳۰ سے تو متجاوز ہی ہوگا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بابا افضل اور کمال الدین استاد و شاگرد دونوں ہمعمر ہی تھے تب بھی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بابا افضل کی ولادت ۵۸۲ھ میں ہوئی ہوگی۔ شرح اشارات کے قیاس خلعت کے بیان میں طوسی لکھتا ہے

"ان الشیخ افضل الدین محمد بن حسن المرقی المعروف بالقاشی ذہب الی ان ہذا القیاس ہو قیاس استثنائی"

بابا افضل کا اس قیاس کے قیاس استثنائی ہونے کا قائل ہونا منہاج المبین سے طوسی نے نقل کیا ہے اور شرح اشارات کی تکمیل ۶۴۴ھ میں ہوئی ہے لہذا قرینہ سابق کو پیش نظر رکھتے ہوئے بابا کی عمر اسوقت ۶۲ سال ہوگی۔

بابا کی تحریریں یا مکاتیب جو دست برد زمانہ سے محفوظ رہے ان میں بھی بابا نے اپنے معاصرین کا کہیں صراحتاً ذکر نہیں کیا ہے جس سے تعیین عہد میں سہولت حاصل ہو جاتی، ہاں اشارے کیے ہیں جن سے فی الجملہ انکے عصر کا پتہ چل سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں

"صباح بر مسا مجلس عالی صاحب کبیرے ... صدر الصدور ی مجد الدین ظہیر الاسلام .. سعادت ابدی را ... آرام جائے باد"

یہ مجد الدین غالباً مجد الدین تبریزی وزیر ہوں گے جن کو ۶۶۱ھ میں ہلاکو نے قتل کرا ڈالا تھا اور ان کے بعد وزارت خواجہ شمس الدین صاحب دیوان کی طرف منتقل ہو گئی تھی بنا بریں اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ۶۴۰ھ میں یہ خط لکھا گیا تو اس نتیجہ پر پہونچنا آسان ہے کہ اس وقت بابا کی عمر کوئی ۶۰ سال کے قریب ہوگی۔ چنانچہ اس مکتوب کے آخر میں خود ہی لکھتے ہیں

"دانائے نہاں و آشکارا آگاہ و دانا است کہ ایں بندہ ناتواں شصت سال است تا در ظلمات حیات الخ"

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں

"کلماتے کہ از اقلام مبارک آں خلاصہ احیاء عصر و نوبادہ بستان خرد ... شمس الدین ایدہ اللہ ... برسید دیدہ از دیدن آں رقوم ... مایہ تمام از سرور ... برداشت و دل از خدائے تعالی سپاس فراواں پذیرفت"

اسکے علاوہ ایک خط میں شمس الدین کا نام آیا ہے۔

"آں رآفرینی کہ از جانب مجلس اعلاے شمس الدین مجد الاسلامی بر داعی مخلص رسید"

۱؎ شرح اشارات ص۸۲ ۲؎ حبیب السیر جلد ۲ ص۵۹

اگر اس بات کے قرائن موجود نہ ہوتے کہ شمس الدین جنکا ذکر بار بار آتا ہے وہ صاحب دیوان جوینی ہی ہیں تب البتہ اشکال تھا اس لیے کہ شمس الدین کے لقب سے تاریخ ایران کے ہر عصر میں کوئی نہ کوئی ملقب ہوا ہے لیکن یہاں قرینہ تو یہ شمس الدین سے صاحب دیوان جوینی ہی مراد لینے کا یہ ہے کہ اولاً تو یہی ۶۶۱ھ سے لیکر ۶۸۳ھ تک شاہان مغلیہ (ہلاکو خانی) کی وزارت کے عہدہ پر فائز رہے اور یہی صرف یہی فضلا اور حکما کی پرورش اور ان پر التفات کریمانہ کے ساتھ ممتاز و مشہور ہوے اور یہی تھے وہ کہ شعرا کا ایک گروہ ان کے خوان کرم کا زلہ رُبا تھا۔ لہذا ممکن ہے کہ بابا افضل بھی انھیں میں کے ایک فرد ہوں جو اس وزیر کے الطاف و انعام سے محظوظ اور بہرہ مند رہے۔ اسکے علاوہ ایک قرینہ شمس الدین سے مراد صاحب دیوان جوینی لینے کا یہ بھی ہے کہ ۶۸۳ھ میں جب شمس الدین کے قتل کا وقت قریب آیا تو اُس نے قرآن شریف سے جو اس کے پاس موجود تھا، فال نکالنے کے بعد ایک تحریر بطور وصیت نامہ کے اپنے بیٹوں کو لکھی اور ایک خط اپنے زمانہ کے علما و حکما کے نام لکھا۔ صاحب وصاف اس خط سے قبل لکھتے ہیں "ایں رقعہ با فاضل تبریز نوشت" اس کے بعد سطور ذیل نقل کی ہیں:

"چوں[۱] بقرآں تفاول کردم برآمد ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون' باری تعالی چوں بندۂ خویش را دریں جہان فانی نیکو داشت وہیچ مرادے ازو دریغ نخواست کہ دریں جہاں بشارت جہاں باقی بدو رساند چوں چنیں بود مولانا محی الدین و مولانا افضل الدین و مولانا شمس الدین ... ومشائخ کبار را کہ ذکر ہر یک تطویلی می انجامد ... بشارت رسانیدن واجب نمود تا دانند کہ قطع علائق کردہ روانہ گشتیم ایشاں نیز بدعائے خیر مدد دہند"

اسکے علاوہ بابا افضل کے بھی چند مکاتیب ہیں جن میں صراحت تو نہیں لیکن احتمال قوی ضرور ہے کہ اُنھوں نے صاحب دیوان ہی کے نام لکھے تھے۔ مثلاً ایک خط لکھا اور مکتوب الیہ کو مخدومی سے مخاطب بناکر اسکے ایک عزیز دلبند کی وفات پر دلداری کی ہے اور جستہ جستہ نصائح بھی ہیں۔ قرینہ یہ ہے کہ غالباً یہ خط صاحب دیوان ہی کو ۶۷۸ھ[۲] میں اُسکے بیٹے بہاء الدین محمد کے واقعہ قتل کے بعد لکھا تھا۔

جیسا کہ اوراق ماضیہ میں میں نے لکھا ہے کہ بابا افضل کا مستقل اور مفصل کوئی تذکرہ اسوقت تک موجود نہیں ہے اور اگر ہے تو اس طرح کہ امین احمد رازی نے تذکرۂ ہفت اقلیم میں شعراے کاشان کے ضمن میں انکا بھی ذکر کردیا ہے۔ وہ لکھتا ہے

"افضل الدین محمد افضل زماں و اکمل دوراں بود و چنانچہ اعلم العلما خواجہ نصیر الدین ایں قطعہ در حق وے گفتہ

---

[۱] لٹریری ہسٹری آف پرشیا براؤن جلد ۲ صفحہ ۲۷ [۲] تاریخ ادبیات ایران براؤن جلد ۳ صفحہ ۲۷ [۳] الیناً صفحہ ۲۰ جلد ۲

گر عرش کند بر ملائک — فضل فضلاء فضل افضل
از ہر ملکے بجائے تسبیح — آواز آید کہ افضل افضل

عوفی لباب الالباب میں لکھتا ہے کہ جب یمین الدولہ محمود غزنوی کا پرچم ولایات ایران وعراق پر لہرانے لگا تو شاہ نے خواجہ افضل الدین جیسے صدر اجل اور یکتائے روزگار کی معیت میں غزنین کا ارادہ کیا لیکن فلک شعبدہ باز نے اس معیت کو قائم نہ رکھا۔ حاسدوں نے نمامی کی اور بدخواہوں نے برائی چاہی تا آنکہ محمود کا دل انکی طرف سے مکدر ہوگیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انکو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ ایاز بابا افضل کا شاگرد تھا، لہذا آپ نے ایک قصیدہ بادشاہ کی شان میں لکھا اور ایاز کے توسط سے پیش کردیا۔ شاگرد نے شاگردی کا حق ادا کرتے ہوئے بادشاہ سے آپ کی براءت چاہی اور اس لعل بے بہا کو معدن سے نکال لانے میں کامیاب ہوگیا۔ جب بابا کو آزادی ملی اور جلاد فلک کے ہاتھوں سے رہائی تو آپ نے ایاز سے وطن واپس جانے کے لیے استصواب رائے کرکے معاودت اختیار کی اور تا حیات کمال معنوی اور سعادات اخروی کے حصول میں مصروف رہے۔[۵۵]

اس قدر تو ان تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے لیکن ان کے بعد کے مورخین اور سوانح نگاروں نے کوئی صحیح معلومات بہم نہیں پہونچائے۔ تقی الدین کاشانی کی خلاصۃ الافکار، علی قلی خاں کی ریاض الشعرا، مخزن الغرائب، عرفات العاشقین ان کے متعلق صحیح اور معتدبہ حالات سے گویا خالی ہی ہیں۔ صاحب خلاصۃ افکار نے اپنی عادت کے مطابق اتنا ضرور کیا کہ انکے عشق و محبت کا ایک قصہ لکھدیا ہے اور تعجب یہ ہے کہ لطف علی بیگ نے تذکرہ آتشکدہ میں اور رضا قلی خاں نے ریاض العارفین میں بھی اسی کا تتبع کیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بابا افضل کو ایک درزی کے لڑکے سے محبت تھی۔ مسلسل تین برس تک بیشتر اوقات درزی کی دوکان کے مقابل مسجد میں بیٹھ کر گزارتے رہے اس لیے کہ وہی ایک جگہ بے روک ٹوک اپنے منظور نظر کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھنے کے لیے مصئون و محفوظ ہو سکتی تھی۔ باوجود اس سہ سالہ ریاضت اور مشقت کے کبھی بات کرنے کا موقع ہاتھ نہ آیا۔ اتفاقاً ایک روز معشوق دوکان پر نہیں آیا۔ بیتاب ہوگئے۔ جوئندہ یابندہ پتہ چلا کہ چند سرخوش نوجوانوں کے جھرمٹ کے ساتھ کسی باغ کی گلگشت کو نکل گیا ہے۔ باغ کا پتہ لگاکر آپ بھی پہونچے۔ دیکھا کہ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھے ہیں۔ پہلے تو ادھر ادھر منڈلاتے رہے پھر کچھ بہانہ پاکر پاس پہونچے تو کیا سنتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے عاشقوں کا تذکرہ کر رہا ہے۔ جب درزی کے لڑکے کی باری آئی تو اس نے کہا کہ تین سال ہوگئے کہ ہر روز ایک شخص کو اپنی دوکان کے سامنے والی مسجد میں بیٹھے

---

[۵۵] یہ حکایت انکے بارے میں یقیناً غلط معلوم ہوتی ہے اسلیے کہ لباب الالباب تقریباً ۶۱۸ھ میں تالیف ہوئی۔ مقالات نزودی ص ۹۵

دیکھتا ہوں حالانکہ اس کی نظر میری طرف سے کبھی پھرتی نہیں لیکن آج تک میں نے اس کو منہ نہیں لگایا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جب میں دوکان پر کپڑا پھاڑتا ہوں تو جیسے الفراق الفراق کی آواز پھاڑنے میں سنائی دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وصال کا انجام فراق ہے اور فراق جیسا کچھ جاں کاہ اور دلدوز ہوتا ہے ظاہر ہے۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ اس درد کو وہ اٹھائے اور اسکی کلفتیں جھیلے۔ لہذا اس ظاہری اور چند روزہ صحبت کے دروازے بند ہی رہیں تو اچھا ہے۔ معشوق کے منہ سے یہ سننا تھا کہ بابانے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہوگئے۔ یہ منظر دیکھتے ہی سب نے آکر گھیر لیا۔ دیکھا تو بابا افضل تھے۔ اللہ ری باطنی محبت کہ معشوق سے رہا نہ گیا پاؤں پر گر پڑا اور مرید ہوگیا۔ جب بابا کو ہوش آیا تو یہ منظر سامنے تھا۔ دنیا اور مافیہا کو لات ماری اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گوشۂ تنہائی اختیار کرلیا۔

صاحب آتشکدہ نے یہ بھی لکھا ہے[۱] کہ بابا افضل کے معاصرین میں سے اکثر لوگ ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ ان آنے جانے والوں میں چھوٹے بھی تھے اور بڑے بھی۔ مثلاً سعدی اور نصیر الدین طوسی جو اس عصر کے سرآمد فضلا میں گنے جاتے تھے وہ بھی اکثر آئے گئے ہیں۔ طوسی نے ایک بار بابا کے پاس یہ ایک رباعی بھی لکھکر بھیجی تھی۔

اجزائے پیالہ اے کہ درہم پیوست　　بشکستن آں روا نمی دارد مست
چندیں سر و پائے نازنین و سر و دست　　از مہر چہ ساخت واز برائے چہ شکست

بابا نے اس کا جواب بھی دیا؛

تا گوہر جاں در صدف تن پیوست　　از آب حیوٰۃ صورت مردم بست
گوہر چو تمام شد صدف را بشکست　　برطرف کلہ گوشۂ سلطاں بنشست۔

ان دونوں رباعیوں کو مولف ریاض العارفین نیز محمد حسین شوستری نے مختار الجوامع[۲] میں بھی نقل کیا ہے۔

صاحب مجمع الفصحا[۳] لکھتا ہے کہ بابا افضل محقق طوسی کے ماموں تھے۔ اس پر دوسرے تذکروں میں یہاں تک منقول ہے کہ جب طوسی ہلاکو خاں کا وزیر ہوا اور مہمات درپیش ہوئیں تو اسی قرابت و یگانگی کی وجہ سے کاشان نہب و غارت اور قتل عام سے محفوظ رہا۔ لیکن صاحب عرفات العاشقین وغیرہ کے بیان کے مطابق دونوں میں استادی اور شاگردی کے تعلقات تھے۔

بابا کے سنہ وفات کے متعلق بہت کچھ اختلافات ہیں۔ اس چھوٹے سے رسالہ میں جسمیں انکے مختصر حالات لکھے ہیں اور جس کی ایک کاپی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود بھی ہے۔ انکی رحلت کا

[۱] مطبوعہ طہران ص۲۲۰ [۲] ص۵۲ ۱۸۹۴ مطبوعہ بمبئی [۳] جلد ا ص۲۰۶

سال ۶۶۶ درج ہے۔ محمد حسن خاں اعتماد السلطنۃ نے مختصر ناصری میں ۶۶۸ھ درج کیا ہے اور تقی الدین نے تذکرۂ خلاصۃ الافکار میں ان کا سالِ رحلت ۷۰۷ھ لکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک شعر جس سے مادۂ تاریخ نکلتا ہے اُس کو بھی نقل کیا ہے

تاریخ وفات خواجہ افضل — از عقل بجوے وعقل اول

اگر صاحب دیوان کے مکتوب کو پیش نظر رکھا جائے کہ جس میں افضل الدین کا نام بھی آتا ہے اور جس کو ہم مختصراً اوپر نقل کر چکے ہیں تو صاحب خلاصۃ الافکار کا سالِ رحلت ۷۰۷ھ قرار دینا یقینی غلط اور بدیہی البطلان ہے اس لیے کہ صاحب دیوان جیسا کہ گزرچکا ۶۸۳ھ میں قتل کیا گیا تھا۔ لہذا اس مادۂ تاریخ کی تاویل یوں ممکن ہوسکتی ہے کہ اس سے دوسرے افضل الدین مراد ہوں جو تیس یا چالیس سال بابا افضل کی وفات کے بعد تک زندہ رہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس دور کے بعد والے مورخین نے غلط تاریخی اشاعت پر بھروسہ کرکے اس کا مورد انھیں کو قرار دے لیا ہو۔ اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں، اکثر ہوا ہے کہ ایک غلط تاریخ نے شہرت پائی ہے اُسی پر مورخین اور مابعد کے شعرا نے اعتماد کرکے کچھ نہ کچھ لکھ دیا۔ اور جب حدسیات اور ظنیات ہی پر مدار بحث ٹھہرا تو یہ بھی کہنا کچھ بیجا نہیں ہے کہ افضل الدین جنکا اشارہ صاحب دیوان کے مکتوب میں پایا جاتا ہے اس سے مراد یہ بابا افضل ہی نہ ہوں بلکہ وہ افضل الدین ہوں جو اس لقب لیکن محمد کے نام سے ایران میں موجود تھے اور جو علمائے منطق میں شمار کیے جاتے تھے اور جن کی طب اور منطق میں بہت سی تالیفات موجود تھیں یعنی افضل الدین سے مراد ابو محمد بن نامور بن عبد الملک خونجی شافعی ہوں جن کا سنہ وفات کشف الظنون میں حاجی خلیفہ نے ایک[1] مقام پر ۶۴۴ لکھا ہے اور دوسری جگہ[2] ۶۴۶ درج کیا ہے۔ بعض جگہوں پر ۶۴۹ اور ۶۴۶ بھی لکھا ہے یہ صاحب تالیفات ہوئے ہیں کشف[3] الاسرار عن غوامض الافکار موجز اور جمل القواعد یا کتاب الجمل علم منطق میں ان کی مشہور و معروف کتابیں بھی ہیں

(وللہا بقیۃ)

---

[1] جلد ا صفحہ ۲۰۰ [2] صفحہ [illegible] [3] کشف الظنون

غزل جناب قمر سہسرامی از الہ آباد

بحر و بر میں جو ترا حسن نمایاں ہو جائے — ذرہ سورج بنے قطرہ دُرِ غلطاں ہو جائے
پھول نرگس کے کھلیں خاکِ لحد سے میری — مر کے بھی حسرتِ دیدار نمایاں ہو جائے
تو وہ داتا ہے کہ جو دستِ نگر ہو تیرا — خود وہ شرمندۂ کوتاہیِ داماں ہو جائے
وہ دل اُس کو نہیں کہتے محبت والے — چارہ سازوں کا جو منت کشِ درماں ہو جائے
دل سے میرے وہ محبت کے ترانے نکلیں — تارِ مضراب قمر تارِ رگِ جاں ہو جائے

پریم مدھ کے متوالے

(جناب پروفیسر محمد مسلم صاحب عظیم آبادی ایم اے)

سید کبیر الدین احمد کو لوگ کبیر داس کہتے تھے۔ اس نے ہندوستان کی اجتماعی اور سیاسی کشمکش کے دور میں پرورش پائی تھی جبکہ مدرسہ کا بچہ بچہ سیاسیات سے کچھ نہ کچھ دلچسپی رکھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا۔ گھر کی اسلامی تعلیم، اسکول میں ہندو ذہنیت کے مطالعہ اور برہمو ہیڈ ماسٹر کے اثر صحبت نے اس کے دل و دماغ میں کمسنی ہی سے ایک ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ اس کے شعور کے ساتھ ساتھ اس کا ذوق مطالعہ و فکر بڑھتا گیا۔ ایک طرف اس کے قابل باپ نے قرآن مجید کو رسمی ترجمہ و تفسیر کے بغیر آزادانہ لغوی، تاریخی و نفسیاتی روشنی میں ذہن نشیں کیا، جس سے اس نے اسلام کی ہمہ گیری اور وسعتِ مشرب کو سمجھا، اور ایسا سمجھا کہ ایک مولوی نہیں سمجھتا۔ دوسری طرف اس کی غیر معمولی دماغی ترقی اور شائستگی نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی توجہ اپنی طرف کھینچی، وہ ایسی کھینچی کہ اسکے اسکول کے تمام اسباق خانگی طور پر اپنے ذمہ لے لیے۔ ان کی توجہ صرف یہی نہیں کہ وہ اپنی جماعت میں اوّل رہنے لگا بلکہ مذاہب عالم سے روشناس کر کے ہر مذہب کے خالص اور بہترین اجزاء کھول کر دکھا دیے۔ اس سلسلہ میں زرتشت، کنفیوشس، سری کرشن، گوتم بدھ، مسیح علیہم السلام اور معلمان مابعد شنکر آچارج، گرو نانک، دیانند، ویویکانند، رامانند، چیتنیہ، بابا تلسی داس، بابا کبیر، راجہ رام موہن رائے، اور کیشب چندر سین کے سوانح زندگی اور تعلیمات سے آشنا کر دیا۔ اور وید، ویدانت، بھاگوت گیتا کے مقامات سمجھائے۔ یہ رنگ دیکھ کر باپ نے بھی متکلمینِ اسلام معتزلہ، ابن حزم، غزالی، رومی، ابن تیمیہ، ابن قیم، شاہ ولی اللہ، اسمٰعیل شہید، سید احمد خاں، مرزا غلام احمد نیز بابی و بہائی متنبیوں کے سوانح حیات، افکار و تصوفِ عرب و عجم سے آگاہ کر کے عقائد متقابلہ کے معلومات کی تکمیل کی۔

کبیر کے دماغ پر اس متنوع معلومات کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ وہ توحید خالص، وحدت خلق (وحدت وجود نہیں) وحدت ادیان اور مساوات بنی نوع انسان کا معتقد ہو گیا۔ نمازیں بلا قید جماعت سہی، اس نے جاری رکھیں، رمضان کے روزے بھی ناغہ نہیں کیے، مگر فروعی مسائل میں اس نے کبھی سنت و اجماع و قیاس کی طرف زیادہ اعتنا نہ کی۔ اس لیے نہ سنی نے اسے سنی جانا، نہ شیعہ نے شیعہ مانا، نہ اہل حدیث نے اسے موحد فی النبوت گردانا۔ قرآن شریف پر اپنے عقائد کا انحصار رکھنے اور بات بات پر آیات قرآنی و تواریخ سے استدلال و استشہاد کرنے کے سبب سے کوئی اسے کھلم کھلا کافر کہنے کی جرأت تو نہ کر سکا مگر پیٹھ پیچھے مختلف مذاہب بلکہ دہریت و کفر سے بھی

منسوب کیا جانے لگا۔

کبیر جب پریسیڈنسی کالج کے پہلے سال میں تھا، سیاسیاتِ ہند نے ہندو مسلم اتحاد کے جوش و خروش کی صورت اختیار کی اور عام جلسے ہونے لگے تو کبیر کے دوستوں نے اسے پکڑ کر مصطبۂ عام (پبلک اسٹیج) پر کھڑا کر دیا۔ ایک سیلابِ خیالات اس کے دل و دماغ میں جوش مارتا رہتا تھا اور کالج یونین کی محدود وسعت اس کے بہ نکلنے کو کافی نہ تھی۔ اسٹیج پر، جیسے یک بیک ندی کا بند ٹوٹ جائے، اُس نے محبت وطنی اور ہندو مسلم اتحاد پر فصاحت کا طوفان برپا کر دیا۔ ایک دم میں وہ ویدانتی پنڈت تھا، دوسری سانس میں قرآنی مُلّا، تیسرے لحظہ میں صوفی، چوتھے میں محب وطن مدبّر۔ مجمع پر طلسم خاموشی چھایا ہوا تھا، تالیاں بھی فراموش تھیں۔ سامعین کے اصرار پر صدر نے اسے بہت زیادہ وقت دے دیا۔ آخر رات کے ساڑھے دس بجے اس نے تقریر ختم کی۔ ہر طرف سے مبارکباد، زندہ باد۔ کبیر داس کی جے! کے نعروں، معانقوں، مصافحوں، دست بوسیوں کے نرغے سے بمشکل فراغت پائی۔ دوسرے اتوار کے دن اس کی مخصوص و مبسوط تقریر کا وعدہ اور اعلان کیا گیا تو مجمع نے کہیں پیچھا چھوڑا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب بابو ستیش چندر بنرجی اپنی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنے کلکتہ کے مکان واقع بھوانی پور میں اقامت گزیں تھے۔ بقول خود کبیر اُن کا شاگرد نہ تھا، بیٹا یا اس سے بھی کچھ بڑھ کر۔ حسب معمول اتوار کی سہ پہر کو جب وہ ان کے مکان پر پہنچا تو وہ اسے گلے لگا کر آبدیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے عزیزم تم نے میرا ایک دیرینہ ارمان ایک حد تک پورا کر دیا۔ اور اس سے زیادہ کی توقعات پیدا کر دیں۔ کاش میں اپنی زندگی میں اُنکو بھی پورا ہوتے دیکھ لوں۔

"تارا دوڑی آئی اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی" دادا (بھائی) تم تو بڑے مقرر ہو گئے ہو۔ میں سبھا میں تمھاری تقریر سُن کر حیرت زدہ ہو گئی۔ کاش تم بنگلہ بھی اُسی روانی سے بول سکتے تو میں اپنی بہت سی عزیزوں اور سہیلیوں کو سناتی۔ ان میں مسلمانوں سے بغض بہت ہے۔ ان کے سایہ سے بھاگتی ہیں۔ مگر میری بیتھوں کالج کی سہیلیاں تمھاری بہت تعریف کرتی ہیں۔ اب مانتی ہیں کہ میں اسلام کی سچائی پر اُن سے لڑتی تھی تو حق پر تھی۔"

کبیر "کاش اُنکو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ میرے ہمخیال مسلمان بہت کم ہیں اور وہ مجھے پکا مسلمان نہیں سمجھتے۔"

تارا "تو پکا ہندو کون ہے اور سچا عیسائی کہاں ہے؟ ہر سچی اور کھری بات کہنے والے کو اُس کے دھرم کے لوگ ادھرمی (کافر) کہتے ہیں۔ یہ حقیقت تو اب نئے تعلیم یافتہ لڑکوں اور لڑکیوں پر روشن ہو چکی ہے۔ اور پھر میں سراہتی تو اسلام کو ہوں نہ کہ موجودہ مسلمانوں کو۔"

کبیر "تارا، یہ سچ ہے۔ ورنہ میں کیا۔ سب ستیش بابا کی کرپا ہے۔ خیر میں اپنی تعریف تو کسی اور وقت سنونگا۔

لاؤ قرآن شریف۔"

کبیر نے ایک رکوع پڑھا۔ ترجمہ کیا۔ باپ بیٹی نے سر جھکائے۔ ادب سے سنا۔ سوالات کیے جن کو کبیر نے حل کیا۔ ستیش بابو نے ایک بھجن پڑھی۔ کبیر اور تارا نے آنکھیں بند کیے سنی۔ پھر کبیر نے دعا پڑھی اور باپ بیٹی نے آمین کہی۔ اس انوکھی عبادت کے بعد پھلوں کے ساتھ چاے پی جاتی۔ تارا جو ستیش بابو کے گھر میں بے ماں کی اکیلی خانہ دار تھی میزبانی کی خدمت انجام دیتی۔ بغیر تبا کو کے جس سے یہ گروہ محترز تھا یہ مختصر پارٹی برخاست ہو جاتی۔ یہ تھا ہر اتوار کی سہ پہر کا معمول۔

کبیر کی دوسری مخصوص تقریر کے دن کیا کیفیت گزری اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سارے اخبارات اس کے اقتباسات اور کبیر کی تعریف سے معمور تھے۔ ہر جماعت میں اسی کا چرچا تھا۔ پولیس کی رپورٹ پر حکام انتظامی کے اشارے سے یا محض اخباروں میں پڑھ کر پرنسپل صاحب نے کبیر کو اپنی کوٹھی پر بلا بھیجا اور سیاسیات میں مداخلت پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ کبیر نے جواب دیا کہ "اگر حب وطن کا وعظ جو ہمیں کالج میں سکھایا جاتا ہے اور مساوات نوع انسان کی نصیحت جو بائبل اور قرآن دونوں پیش کرتے ہیں، سیاست ممنوعہ ہے تو اس شجر ممنوع سے کوئی تعلیم یافتہ ایماندار شہری پرہیز نہیں کر سکتا۔ نہ عیسائی من حیث عیسائی، نہ مسلم من حیث مسلم، نہ ہندو من حیث ہندو۔ میں نے بغاوت یا نقض امن کی کوئی تحریک تو نہیں کی۔"

پرنسپل "یہ سچ ہے کہ تم قانونی گرفت سے باہر ہو۔ میں ذاتی طور پر تمہارا ہم خیال ہوں، مگر جانتے ہو کہ بعض چیز ایک کے لیے تریاق ہوتی ہے، دوسرے کے لیے زہر۔ عوام پر اس اشتراک و مساوات عامہ کی تعلیم کا یہ اثر ہوگا کہ سوشلزم یا اشتراکیت نشو و نما پائیگی جو حکومتوں کے امن و انتظام میں مخل ہوتی ہے۔"

کبیر "میری تقریر انگریزی میں ہوتی ہے، مخاطب صرف تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ پھر عوام پر برا اثر کیوں پڑنے لگا۔ رہا سوشلزم، کمیونزم یا بالشویزم تو معاف فرمائیے گا آپ خود ایک لکچر میں ان کے فرق ہم پر واضح کر چکے ہیں اور سوشلزم کو وسیع مفہوم میں ناقابل اعتراض بلکہ مفید خلق فرما چکے ہیں۔ پھر یہ غلط بحث کیوں فرما رہے ہیں۔ اسلام خود ایک پورے سوشلزم کا حامی بلکہ پیغامبر و مبلغ ہے جس سے کوئی باخبر مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ پھر ایک مسلمان کو اس سے کیونکر روک سکتے ہیں؟"

پرنسپل صاحب زور سے ہنسے۔ فرمانے لگے "میرا منشا بحث کرنا یا تمہیں کوئی نیا حکم دینا نہیں۔ میں نے تمہیں یہاں پرنسپل کی حیثیت سے نہیں بلایا بلکہ ایک ہمدرد دوست کی حیثیت سے۔ اول تو یوں سمجھو کہ حکام انتظامی ذرا ذرا سی بات سے خائف ہو جاتے ہیں۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کو منع نہیں کرتے مگر اس کے جوش کے نتائج سے ڈرتے ہیں۔ حق و ناحق سے بحث نہیں۔ احتیاط سمجھو یا وہم کہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے یہ تقریری ہنگامے

سیاسیات کے دائرہ سے باہر بھی مگر اس قدر قریب ہیں کہ ہر لحظہ اس میں گر جانے کا قوی اندیشہ ہے جو طالب علم کی حیثیت سے ابھی تمہارے لیے مہلک ہے۔ کم سے کم بی اے کے امتحان تک اس کو ملتوی رکھو اور اگر سرکاری ملازمت کرنا ہو تو بالکل روک دو۔ حق یا ناحق حکام کو یہ پسند نہیں۔ وہ مشتبہ ہو ہی جاتے ہیں۔"

کبیر "بس بس میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ شکریہ۔ تکمیل تعلیم تک میں ارشاد کی تعمیل کروں گا۔"

پرنسپل (مسکرا کر) "مجھے امید تھی کہ تمہارے لیے اشارہ کافی ہوگا۔"

ایک تو پرنسپل کی فہمایش، پھر امتحان کی تیاری، اور سب پر طرہ یہ کہ ہندو مسلم اتحاد و محبت کی لہر جو... دوڑ رہی تھی، بقرعید میں ایک گائے کے بلوے نے فنا کر دی۔ یہ بھائی بھائی کئی روز تک چھریاں لیے ایک دوسرے کے جگر میں بھونکنے کو تیار رہتے۔ ہفتہ بھر بھلے آدمیوں کا راہ چلنا بند ہو گیا۔ راہ گیر پکڑ پکڑ کر پیٹے اور کبھی مار تک ڈالے جاتے۔ چار دن پیشتر کی محبت نفرت و کدورت سے نہیں بلکہ وحشت و بہیمیت سے بدل گئی تھی۔ کبیر مایوس ہو کر ہندو مسلم اتحاد کے خواب کو دل سے بھلانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پڑھنے یا ستیش بابو کے ہاں جا کر غم غلط کرنے کے سوا کوئی شغل نہ رہا۔

اسی زمانہ کی ایک سرد شام کا ذکر ہے۔ کبیر، ستیش بابو تارا۔ آتشدان کے پاس بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ آج کے ہندو مسلم کشت و خون کی خبر زیادہ حسرتناک تھی۔ بظاہر سب خاموش تھے مگر اندر اندر سب کے دل وقف شیون تھے۔ لاکھ تقریریں دلوں میں گونجتی تھیں، نہ بہ لب چھلکتی تھیں اور مایوسی کی ایک ٹھنڈی سانس میں اڑ جاتی تھیں۔ چہرے سراپا فکر و تخیل تھے۔ ستیش بابو زیر لب بڑبڑائے جیسے دل کی آواز سنائی دے جائے۔

"جب تک ہندو و مسلمان مذہب، زبان، چھوت چھات اور ذات پات کے بہانوں سے علٰحدہ رہیں گے جب تک ان کی ذہنیتوں میں اختلاط نہ ہوگا متحدہ ہندی قومیت کا خواب خواب ہی رہیگا۔ ان میں صدیوں اتحاد نہ ہوگا۔"

کبیر "آپ گویا میرے دل سے بول رہے ہیں۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ متحدہ قومیت جو اتحاد چاہتی ہے وہ ظاہری لیپ پوت، اور پیوند در فیصے ممکن نہیں۔ دین کے پاک نام سے خلق خدا کا جتنا خون بہایا گیا ہے کسی دوسرے دنیاوی مقصد یا طمع سے نہیں بہا۔ کیا اب بھی مذہب کو خدا کی رحمت کہا جا سکتا ہے؟"

تارا۔ قطع کلام ہوتا ہے۔ "تازہ جنگ یورپ میں جتنا خون بہا ہے، جتنے بچے یتیم، سہاگنیں بیوہ اور بوڑھے والدین نپوتر (لاولد)، معصوم بچے قتل، عصمت کی دیویاں بے عزت، کھیتیاں ویران، کارخانے تباہ، محل اور جھونپڑے برباد ہوئے ہیں اُن سے زیادہ ظلم اور اتیاے کسی دوسرے کی جنگ میں کبھی دیکھا یا سنا گیا ہے۔ آج کی بات ہے۔ ابھی صبح کی شام نہیں ہوئی۔"

ستیش "۔ سچ ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ مگر مذہبی جنگ ہو یا ملکی، کارن ایک ہی ہے۔ خود غرضی، من کی پالن، نفس پروری، تعصب۔ مذہب ان کے مٹاتے ہی کو آئے تھے مگر امتدادِ زمانہ سے بگڑ بگڑ گئے، سڑ گئے، اور اپنی زہریلی ہوا سے سنسار میں زندگی کے عوض موت، صحت کے بدلے ہلاکت پھیلا رہے ہیں۔"

کبیر "۔ اسی دکھ سے کمیونسٹ (اشتراکی) حکومت نے روس میں مذاہب کو ملیا میٹ کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں مذاہب کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ ان کے ایک دم سے کھنڈن کی ضرورت ہے۔"

ستیش "۔ موجودہ روپ میں مذاہب کیسے ہی مضر ہوگئے ہوں تم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ سارے سنسار کو پریم کے شیرازہ میں جمع کر کے یکجان کر دینے کی کوئی اپاسے دھرم کے سوا سے بھی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسانی فکر ایسی مہم کے سر کرنے سے قاصر ہے۔ فلاسفہ و حکما نے جتنے اصول بنائے اور تدبیریں نکالیں سب ناکام ہوئیں۔

جو نکتہ وروں سے حل نہ ہوا، جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں۔"

کبیر "۔ تو کیا آپ مانتے ہیں کہ کسی جگ میں کوئی دھرم اپنی تازگی اور صحت و تندرستی کی حالت میں سنسار میں صلح و امن قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہے؟"

ستیش "۔ ہاں پہلے دنیا آج کی سی وسیع نہ تھی۔ جغرافی حدود تنگ تھے۔ ہر ملک و نسل الگ الگ دنیا تھی۔ ایک دیس میں ایک دھرم وہاں کی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے صلح و امن قائم کر دیتا تھا۔ ہندوستان میں ویدک دھرم، ایران میں زرتشتی، چین میں کنفیوشس کا دھرم، شام میں موسوی صدیوں کامیاب رہے۔ مذہبی جنگ ہمیشہ ایک نئے جُگ کے ارتقا، نئے دور کی قدرتی آمد، نئے حالات کی کشمکش، یا نئے مذہب سے نقدا دم کے وقتوں میں رونما ہوا کی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے پرانی اور نئی تہذیبوں میں جنگ ہوتی ہے۔ بہار میں نئے پودوں کے لیے پرانے پودے یا خودرو جنگل جھاڑیاں کانٹے صاف کر دیے جاتے ہیں اور باغ میں کوڑوں کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ جیسے دست آور دواؤں سے مریض کو دکھ دیکر پیٹ صاف کیا جاتا ہے، نشتر دیکر فاسد خون اور ورم جسم سے نکالی جاتی ہے، دانتوں کے نکلنے میں قدرت بچوں کو دکھ دیتی ہے، پرانے دانت نئے دانتوں کے لیے جگہ خالی کرتے ہیں۔ نئے پتوں کے پھوٹنے سے پہلے خزاں کے زرد پتے جھڑ جاتے ہیں۔ ہومیوپیتھی علاج میں امراض اپنی پوری شدت دکھا کے دید دور ہوتے ہیں۔

" جوں جوں پیغمبر آتے اور گزرتے جاتے ہیں دنیا کی عام حالت بدلتی جاتی ہے۔ ضرورتیں اور تعلیمات

برلتی رہتی ہیں۔ آج سے ڈھائی ہزار سال قبل اسرائیلی دنیا کو رحم و کرم، لطف و محبت اور نفسانیت شکنی یعنی اخلاق کے سدھار کی ضرورت تھی۔ عقائد و احکام درست تھے عیسیٰ مسیح نے اصلاح چاہی۔ کشمکش ہوئی۔ مسیح علیہ السلام کا جسم اس کشمکش کی نذر ہوگیا، مگر روح غالب آئی اور صدیوں پریم کی سوگندھ پھیلاتی رہی۔ قانون الٰہی کے مطابق مسیحی دائرۂ اثر اسرائیلی دائرہ سے وسیع ہوگیا۔ اسی طرح ہندوستان میں جب ہندو دھرم صرف مورتی پوجا اور ہزاروں پیچیدہ رسوم و بدعات کا نام تھا اور خواص بھی جوگ اور سادھن کو دھرم کی غایت سمجھتے تھے، گوتم بُدھ نے برسوں جنگل جنگل پربت پربت ڈھونڈھنے کے بعد پرچار کیا کہ پرماتما نہ جنگل میں ہیں نہ پہاڑیں نہ سمندر میں، وہ اپنی مخلوقات میں ہیں اور انھیں کی سیوا اور رکشا سے ملتے ہیں۔ ویدک دھرم سے مقابلہ ہوا۔ جنگیں ہوئیں۔ آخر بُدھ دھرم گوتم بھگوان کے دیس میں کم سہی مگر اس سے وسیع تر رقبہ یعنی تبت چین، ترکستان اور ایران پر چھا گیا۔

آج سے چودہ سو برس پہلے دنیا کے مختلف حصوں میں پرانے مذاہب بہت کچھ روشنی پھیلا چکے تھے موسوی، عیسوی، زرتشتی اور بُدھی تعلیمات خدا کو پہنچوا چکی تھیں۔ دنیا اصول اخلاق سے روشناس ہو چکی تھی۔ مہذب دنیا اب زیادہ وسیع ہو چکی تھی۔ مگر صفاتِ الٰہی کے ادراک کا باریک تر اور لطیف تر مرحلہ باقی تھا۔ پیغام حق کھوئی ہوئی بھیڑوں سے آگے پہنچانا تھا۔ ملکوں، نسلوں، زبانوں، رنگوں، طبقوں اور جاتیوں کی چہار دیواریاں توڑنا تھیں۔ جغرافی حدود وسیع سے لامحدود کرکے تمام بنی نوع انسان کو ایک برادری کے رشتے میں باندھنا تھا۔ انقلابی جنگیں ناگزیر تھیں، ہوئیں۔ یوں تو ہر دھرم کا علمبردار حق و صداقت کا مدعی ہوتا ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ مظلوم اور پست حال طبقہ نے جو جمہور خلائق ہے کس کا ساتھ دیا؟ ارباب دول نے اپنی سلطنتوں کے لیے اور ربیوں، قسیسوں، موبدوں نے اقتدار کے لیے کشمکش کی۔ مگر شکستہ حال بھوکوں ننگوں، غریبوں نے فوراً اسلام کا پیغام مساوات خوشی سے قبول کرلیا۔ اس لیے صرف خوں ریزیوں پر مت جاؤ، عوام الناس اور پست طبقہ کی حالت پر نظر کرو جس سے عبارت ہے سوسائٹی اور ہیومینیٹی (خلق اللہ)۔

کبیر: تو ظہور اسلام کے بعد پھر جو بگاڑ پیدا ہوگئے ہیں ان کے سدھار کے لیے آج پھر ایک پیغمبر کی ضرورت ہے؟

ستیش: اس کا جواب مجھ سے بہتر تم کو دینا چاہیے تھا کہ پشتینی مسلمان ہو اور تعلیم یافتہ۔ خیر یہ بھی مجھی سے سنو کہ اگر ٹھیٹھ مسلم نہیں تو اسلم بھی نہیں ہوں۔ پیغمبری ضرورت ہے بھی اور نہیں بھی۔ یعنی پیغمبر وسیع مفہوم میں آتے رہیں گے۔ ایک نہیں، لاتعداد۔ ان کو مصلح، مجدد، مجتہد، ریفارمر کہو یا نبی اور پیغمبر کہو۔ اصلاح میں مناقشہ کیا ہے۔ مگر وحی و الہام کے واسطوں کی اب ضرورت نہیں۔ دنیا ارتقائی اس منزل سے گزر چکی ہے۔ جب خدا ساری قوم میں ایک فرد کامل کو منتخب کر لیتا تھا کہ اسے بندوں تک اپنا پیغام پہنچانے

کا آلہ بنائے ۔ دوسرے لفظوں میں براہ راست تعلیم الٰہی یا وہبی وحی و الہام کا حامل ہو ۔ یوں سمجھو کہ نصاب تعلیم کامل ہے، پڑھائی ناقص ۔ اگر مدرسہ کا معلم شیکسپیر اور ملٹن پر عبور نہیں رکھتا اور خراب پڑھاتا ہے تو شیکسپیر اور ملٹن میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت نہیں معلم میں قابلیت کی ضرورت ہے ۔ اسی طرح پڑھانے والے بدلتے رہیں گے ۔ کبھی قابل آئیں گے کبھی نا قابل مگر شیکسپیر اور ملٹن نہیں بدلیں گے ۔

غرض قرآن شریف اب تک آخری نصاب ہے کامل و مکمل ۔ اس کا علم پرمیشور کو ہے کہ دنیا پر وہ دَور کب آنے گا یا نہ آئیگا جب قرآن سے مختلف کوئی نصاب مقرر ہو گا ۔ تم لوگ اسے "ہمیشہ ہمیشہ" کے لیے "قیامت" تک کے لیے آخری صحیفہ مانتے ہو گر یہ ہمیشگی اور قیامت انسانی نقطہ نظر سے ہے ۔ انسانی تصور اور قیاس تاریخی و آثاری صحیح مدت کے ادراک سے قاصر ہیں ۔ یہ ہمیشگی و قیامت و آخرت مجازی و اعتباری ہیں، یا لواسطہ ہیں ۔ دنیا کی ایک خاص عمر یا جگ کے لحاظ سے ہیں، مطلق نہیں ۔ پرماتما کے سوا کوئی وجود، کوئی زمان، کوئی مکان مطلق یا حقیقی اور ازلی و ابدی نہیں ۔ ہزاروں لاکھوں برس پہلے کیا تھا ہزاروں لاکھوں برس بعد کیا ہو گا، کتنی دنیائیں بنیں اور مٹیں یا بنینگی اور مٹیں گی، انگلا اور اک ایک دنیا اور ایک دَورِ عالم نہ کر سکتا ہے نہ کرنے کی ضرورت ۔"

کبیر: "حق یہ ہے کہ آپ نے اسلام کو مجھ سے اور عام علمائے اسلام سے بہتر سمجھا ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کامل سہی، موجودہ زبوں صورتِ حال کا کیا علاج ہے؟ ہم کو کیا کرنا چاہیے؟"

ستیش: "قرآن کی اصلی تعلیمات کو سمجھنا سمجھانا اور برت کر نمونہ پیش کرنا ۔"

کبیر: "اول تو ہم خود ناقص ۔ اور قادر بھی ہوں تو ایک ہماری ذات سے کیا ہو سکتا ہے؟"

ستیش: "تم کسی اور فرد یا افراد کے لیے راستہ تو صاف کر سکتے ہو ۔ جو تم سے نہ ہو سکے، ہو سکتا ہے کہ تمہارے بارے ہوئے دیا سے کوئی دوسرا یا تیسرا یا چوتھا ایک مشعل روشن کر دے اور عنا رکی اندھیری کو اُجالا کر دے جیسے مسیح بھگوان کے دیا کو محمد بھگوان نے مشعل بنا دیا ۔ جو آج تک جل رہا ہے گر ٹمٹمانے لگا ہے ۔ صرف تیل ڈالنا ہے ۔"

کبیر: "تیل سے آپ کی مراد کیا ہے؟ ایک لفظ میں فرمائیے ۔"

ستیش: "پریم"

کبیر: "پریم کی شراب خلق کی حلق سے کیسے اُتاری جائے؟"

ستیش: "مساوات اور رواداری کے پیالے سے ۔ تمام بنی نوع انسان کو ایک سمجھو اور سب کی یکساں خدمت کرو ۔ وہ ایک ہو جائیں گے ۔ اسلام یہی ہے یا اور کچھ؟ توحید یہی ہے، یا اور کچھ ہے

ویدانت کا وحدۃ الوجود جو اب مسخ ہو گیا ہے اس کے سوا کیا تھا کہ تمام مخلوقات ایک جنس ہیں ؎

حقیقت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو کہ خاکی ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

غرض توحید، مساوات، عبادتِ حق، یا خدمتِ خلق ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور تشریحیں ہیں۔ اور یہی حقیقتِ دینِ حق ہے۔"

اس گفتگو کی محویت میں گھنٹے نے گیارہ بجائے تو سب چونکے اور یہ مختصر صحبت منتشر ہوئی۔

دو مہینے کے بعد ان شبانہ صحبتوں کا مادی نتیجہ ایک ماہوار انگریزی جریدہ "ٹروتھ" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ چھ اشاعتوں میں یہ ہندوستان کے ہر طبقہ میں ہر دلعزیز اور انگلستان، امریکہ، جنیوا، جاپان کے خاص طبقوں میں مقبول ہو گیا۔ اسکے بعض مشہور اور معرکۃ الآرا مقالات کے موضوع اور خلاصہ مطالب یہ تھے:۔

خدا کہاں ہے؟ نہ جنگل میں، نہ پہاڑ میں، نہ سمندر میں، نہ کعبہ اور مسجد میں، نہ کاشی اور مندر میں، نہ گرجا اور آتشکدہ میں۔ تمام مخلوقات میں اسی کی ذات کا ظہور ہے۔ صفات ہمارے ادراک سے باہر ہیں۔

عبادت کیا ہے؟ عبادت اپنی پرستش ہے، یعنی مخلوق کی خدمت۔ خالق ہماری پوجا سے بے نیاز اور بلند تر ہے۔ اس حدیث قدسی سے استدلال کہ قیامت میں خدا بندے سے سوال کریگا میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، میں پیاسا تھا تو نے پانی نہیں پلایا، میں ننگا تھا بدن نہ ڈھانکا، بندہ کہیگا خداوندِ بے نیاز تو بھوکا پیاسا ننگا کیا معنی؟ خدا جواب دیگا میرا فلاں بندہ بھوکا تھا اگر اُسے کھانا کھلاتا تو مجھے کھلاتا، فلاں پیاسا تھا، تو اُسے پانی پلاتا تو مجھے پلاتا، فلاں ٹھنڈ سے اکڑ رہا تھا تو اُسے کپڑا پہناتا تو مجھے پہناتا۔

جو شیخ کو کعبے میں نہ طاعت سے ملا — جوگی کو نہ جنگل میں ریاضت سے ملا
اک رندِ تبہ حال کو وہ خالقِ کُل — بازار میں مخلوق کی خدمت سے ملا

نماز، روزہ، دھیان، تپسیا کا مقصد صرف اپنے نفس کو مٹانے اور دوسروں پر مرنے کی قابلیت پیدا کرنا۔

بہشت و دوزخ کیا ہیں؟ صلح و جنگ، محبت و عداوت، پریم کا پھول اور کینہ کپٹ کی آگ۔ اپنے اعمال کے نتائج اپنے آگے یا اپنی آئندہ نسلوں کے آگے آنا۔

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اپنے اپنے اعمال کے مطابق قطرہ سمندر سے ہم آغوش یا بیتاب ہم آغوشی حقیقتِ مطلقہ کا انکشاف۔ آگے کچھ نہیں معلوم نہ علم کی ضرورت۔ زندگی ایک امانت ہے خلق اللہ کی ؎

ایں جانِ عاریت کہ بحافظ سپرد دوست — روزے رخش ببینم و تسلیم وے کنم

اسلام کیا ہے؟ سوال یوں کرو سچائی کیا ہے؟ دین کیا ہے؟ یہودیت، نصرانیت، ویدیت، بودھمت، کیا ہیں؟ توحید! توحید کیا ہے؟ خداوند کے فرزندوں کی ایک برادری، ایک خاندان، ایک گھر، جس پر صرف ایک ذاتِ واحد، خدا کی حکومت ہو۔ اور کسی ماسوا کا دخل قابل قبول نہیں۔ آزادی، مساوات، ان کو توڑنے والی ہر طاقت شرک و کفر اور قابل رفع و جہاد اور ہر حریف مشرک و کافر۔ وحدۃ الوجود بھی یہی، ہر باقی دھوکا اور گمراہی۔

ٹروتھ کی اشاعت حیرت انگیز طور پر بڑھ رہی تھی۔ اسکے مضامین کے ترجم اور اقتباس سے شاید ہی ہندوستان کی کسی زبان کا رسالہ خالی رہتا ہو۔ اس کی آمدنی سے کافی رقم بس انداز ہوتی اور اس نئی برادری کے تبلیغی کاموں پر صرف ہوتی۔ اب تک سیکڑوں کی تعداد میں ارکان شریک ہو چکے تھے اور اب انکی تنظیم و تقسیم عمل کا سوال زیر غور تھا۔

قانون فطرت کے مطابق تارا اور کبیر کے تعلقات زیادہ عرصہ تک برادرانہ نہ رہ سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان میں ایک خاص طور کی کشش پیدا ہوئی، جسے کشش ضدّین کہیے، یعنی تارا ایک مختلف نسل مختلف زبان، مختلف تہذیب و معاشرت والے خاندان کی لڑکی ہونے کے سبب سے کبیر کے لیے ایک انوکھی چیز تھی۔ اور انوکھے کی طرف ایک لپک ہوتی ہے، یا کشش مثلین یعنی دماغی وحدت و اشتراک خیال کا نتیجہ سبب جو کچھ بھی ہو۔ انکے تعلقاتِ دوستی کا نشو و نما بتدریج اس حد تک ہو گیا کہ دونوں ذاتیں ایک شخصیت واحد میں جذب ہو جانے کا تقاضا کرتی تھیں سے یہ کہہ رہی تھی "انا القیس" وہ "انا لیلیٰ"
جزئی تفصیلات عشق و محبت سے قطع نظر کیجیے۔ اگر آپ کی رگ و پے میں گرم جوان خون دوڑتا رہا ہو تو یاد کیجیے اور سمجھ لیجیے۔ مجھے لیلیٰ مجنوں کی داستان سنانا نہیں۔ کبیر کی زندگی کے صرف چند ضروری اور سبق آموز حصے منظر عام پر لانا ہیں۔

ایک روز ٹروتھ میں کبیر کا ایک سبدیلا مقالہ "مذاہب عالم کا مشترک نقطۂ نظر" شائع ہوا جس میں مختلف مذاہب کے اساسی اصول و عقائد پر ان کے صحیفوں سے فقرے اور عبارتیں نقل کر کے ان میں اتحاد غایت دکھایا تھا۔ دنیا پر خدائی سلطنت یا خدائی گھرانے کی تعمیر۔ ایک واحد طاقت کی پرستش میں آزادی، مساوات، محبت، خدمتِ خلق داخل ہیں۔ ایسی طاقت کا منکر صلح و امن کا منکر، اور قابل تعزیر و اصلاح ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ستیش بابو اسے پڑھ کر ایسے خوش ہوئے کہ کمرے میں قدم رکھتے ہی اُسے گلے سے لگالیا اور مدح وتحسین کا پُل باندھ دیا۔ کبیر نے غیر معمولی تعریفوں سے شرما کر یا بوکھلا کر پیچھا چھڑانے کے لیے موضوع سخن بدل دینا چاہا، یا قصداً وہ اپنے دلی مدعا کے لیے ایسے موقع کا منتظر تھا، اسے خدا جانتا ہے۔ اس نے شوخی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا

" بتایا آپ میری بہت زیادہ تعریف کرتے ہیں اور مجھ سے بہت خوش ہیں۔ اگر واقعی میں نے آپ کو خوش کیا ہے تو میں آپ سے کچھ مانگوں؟ بہت دنوں سے آپ نے مجھے کوئی پرائز (انعام) نہیں دیا ہے۔"

ستیش بابو (مسکرا کر) " اب تک تم اپنے آپ کو مدرسہ کا طالب علم ہی سمجھتے ہو؟ اب میں تمھارے لائق کیا رکھتا ہوں کہ دوں؟ ایک دولت ہے محبت وہ تم کو دے چکا۔"

کبیر: " اگر میں ایسی چیز مانگوں جو آپ کے پاس ہو تو آپ دریغ تو نہ رکھیں گے؟"

ستیش بابو۔ " یہ تم خود جانتے ہو۔"

کبیر: " اگر آسمان کا تارا مانگوں؟"

ستیش بابو (حیران ہو کر) " یہ میرے پاس کہاں؟" (پھر تارا کی طرف غور سے دیکھ کر کچھ سمجھے اور مسکرائے) " آنکھوں کا ایک تارا ہے۔ سو آنکھیں ہی تمھاری ہیں۔ تم آسمان ہو تو یہ آسمان کا تارا ابھی بن جائے تو دو دو نہیں"

کبیر: " میں آسمان تو نہیں مگر ایک تارا مل جائے تو آسمان سے بلند ہو جاؤں۔"

ایک ہفتہ ہی میں ستیش بابو نے تارا کا ہاتھ کبیر کے ہاتھ میں دے کر کہا " تم روحانی حیثیت سے میرے بھائی تھے ہی۔ آج جسمانی رشتے سے بیٹے بھی ہوئے۔ جہاں عقائد اور نصب العین کا تعلق ہے تم میرے ہم مشرب ہو۔ گرگ کا سنا یا نفس یا من کی صفائی ایک کٹھن گھاٹی ہے جس سے تم اب تک ناآشنا ہو اور مجھے اندیشہ ہے ایک مدت تک رہوگے۔ بالفعل نہیں۔ ناممکن ہے۔ تمھارے ذہنی ماحول اور فضا کا اثر تمھیں چھوڑ نہیں سکتا ——— (سوچ کر) صرف ایک اُپائے ہے۔ نارائن تم کو ٹھوکر دے کر ایک اور زندگی دینگے۔ جیسے سونا تپا کر صاف اور حفاظت جلا کر پاک کی جاتی ہے۔ کٹھن امتحان ہے۔ نارائن تمھیں اس میں کامیاب کریں۔ (رک کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ پھر کھولتے ہیں) ایشور کی جو خوشی۔ جاؤ تم دونوں ایک دوسرے کے صرف مادی نہیں روحانی معاون و مددگار رہنا۔ تارا کی اس مرتے دم تک پکی ہندنی تھی۔ توحید اُس کی سمجھ سے باہر رہی ممکن ہے تارا ابھی دودھ اور ابتدائی تعلیم کے اثر سے بالکل پاک نہ ہو۔ کبھی خامی دکھائے تو تم ہر قدم پر اس کی دستگیری کروگے۔ لیکن یاد رہے کہ کشش اور دنیا میں جب سے اصلی زندگی شروع ہوتی ہے وہی تمھاری دستگیری کرسکیگی۔"

ہماری آپ کی طرح کبیر بھی جب تک کامیاب آرزو تھا، اپنی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا۔ اُسکی تارا ایک مدت کی کشمکش امید و یاس کی فتح، ہیجان و اضطراب محبت کی تسکین، بلند ترین منزل تمنا کی رسائی تھی۔ علوم وفنون، فضل وکمال، عزت وشہرت، وجاہت وصحت، حسن وتندرستی، دولت وثروت سے کافی بہرہ یاب تھا۔ دولتِ فکر وتدبر سے وافی حصہ رکھتا تھا۔ سیر وسیاحت ضرور تھا کرتا تھا اور شوق سے بھی۔ قدرت کے عظیم جمالی اور جلالی مناظر سے متاثر ہوتا۔ ہمالیہ کی سربفلک چوٹیوں کی عظمت، کشمیر کی رنگین وادیوں کی فرحت، جنگلوں کے وحشت ناک گنجوں کی ہیبت، آبشاروں کی آواز، سمندر اور ریگستان کی ناپیداکنار پہنوں کے سناٹے میں اسکا دل کوئی جھلک دیکھ لیتا جو چنگاری کی طرح ایک آن میں نظر آجاتی اور غائب ہو جاتی۔ پھر وہی تارا، وہی دن، وہی راتیں۔

تارا پر قدرت کے ان جلووں کا زیادہ اثر ہوتا۔ وہ ہری ہری بول اُٹھتی۔ زیرلب کچھ کہتی، کبھی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں، کبھی ہاتھ اوپر اُٹھ جاتے۔ جس دن وہ شوہر کے ساتھ کوئی موثر قدرتی منظر دیکھ آتی گھنٹوں خاموش رہتی۔ عبادت زیادہ کرتی۔ کبیر ملامت کرتا "تم دل کی بہت کمزور ہو۔ کیا تاریک گھاٹیوں میں گھرے گھرے غار دیکھ کر ڈر گئیں؟ کیا سمندر میں موجوں کے جھکولوں اور کشتی کے ہچکولوں نے خوفزدہ کر دیا؟ ہاں ضعف دل ان آثار قدرت میں ایک خوفناک ہستی کو پوشیدہ سمجھتے اور اُسکے راضی کرنے کو اپنے طور پر پرستش کرنے لگتے ہیں۔ یہ توہم پرستی ہے۔ اگر اُس ہستی کو خدا بھی فرض کرو تو وہ ان بھیانک مناظر میں محدود نہیں۔ وہ تو ہر جگہ ہے۔ کیا مجھ میں تم میں نہیں؟ اُس کا جلوہ تو زیادہ تر تمھاری مخمور آنکھوں، گلابی گالوں، اور برق ریز تبسم میں جھلک رہا ہے۔" یہ کہکر وہ بیتابانہ حرکتیں کرنے لگتا۔

تارا جھینپتی ہے سکراتی ہے۔ مسکراہٹ اُسکے لبوں پر تازہ آفت لاتا ہے "صبر صبر! کبھی تو سنجیدگی سے کچھ سوچا کرو اور سوچنے دو۔ کچھ دیر چُپ رہا کرو اور رہنے دو۔ نفس کے جھمیلوں میں روح کو بھی اُبھرنے کا موقعہ دو۔ سنو۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں۔"

کبیر "اپنے خدا سے بھی نہیں؟"

تارا: "خدا سے بھی نہیں۔"

کبیر۔ "یہ کیا؟ پھر روح اور نفس کا جھگڑا کیسا؟ تمھاری عبادت اور پرستش کے کیا معنی؟"

تارا۔ "سب کے معنی ہیں۔ سنو۔ خدا سے میں نہیں ڈرتی۔ وہ ڈراونا نہیں۔ اس کی محبت اور احسان سے ایک مغلوبیت اور بیچارگی محسوس کرتی ہوں اور اس احساس سے جو سمجھ میں آتا ہے کرتی ہوں۔"

کبیر آنکھیں پھاڑ کر تارا کو گھورتا ہے۔ پھر ایک منٹ کو بند کر لیتا ہے اور کہتا ہے "تارا ستیش بابا نے سچ کہا تھا۔ تم میں ایک روحانیت کا نور ہے جو میری پہونچ سے بالاتر ہے۔ تم مجھ سے زیادہ مسلمان ہو۔"

"تارا! اگر یہ کچھ ہے تو میں نے تمہیں سے پایا ہے اور تمہیں تعجب کرتے ہو؟ پڑھو وہ آیتیں جو بابا تمہارے ساتھ پڑھ رہے تھے

"آسمان اور زمین کی خلقت میں، دن اور رات کے اُلٹ پلٹ میں، کشتی کے سمندر میں چلنے میں، آسمان سے گہنے والے مینہ میں جو مردہ زمین میں جان ڈال دیتا ہے، ہر قسم کے جانوروں میں جو اُس نے روئے زمین پر پھیلا رکھے ہیں، ہواؤں کے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر پھرنے میں آسمان و زمین کے درمیان تابعدار بادلوں میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریح والسحاب المسخر بین السماء والارض لایات لقوم یعقلون (البقرۃ - ع ۲۰)

اُسکی نشانیوں میں سے آسمان زمین کی خلقت اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے سمجھ والوں کے لیے ان میں نشانیاں ہیں ...... اُسکی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ بجلیاں دکھا کر تم میں کبھی خوف اور کبھی امید پیدا کرتا ہے اور آسمان سے مینہ برسا کر مردہ زمین میں جان ڈالدیتا ہے۔ بیشک عقل والوں کے لیے ان میں نشانیاں ہیں۔

ومن ایاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذلک لایات للعلمین ۵ .... ومن ایاتہ یریکم البرق خوفا وطمعا وینزل من السماء ماء فیحیی بہ الارض بعد موتہا ان فی ذلک لایات لقوم یعقلون ۵ (الروم - ع ۳)

"کیا لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسکی خلقت کیسی ہے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کتنا اونچا بنایا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے گڑے ہیں؟ زمین کو نہیں دیکھتے کتنا پھیلاؤ ہے؟ (اے پیغمبر یہ سب بتا کر ان کو) سمجھاؤ۔ تمہارا کام سمجھانا ہے۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ۵ والی السماء کیف رفعت ۵ والی الجبال کیف نصبت ۵ والی الارض کیف سطحت ۵ فذکر انما انت مذکر ۵ (غاشیہ)

"بھلا آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے مینہ کس نے برسایا جس سے ہم نے دلکشا باغ اُگائے۔ یہ تمہاری قدرت نہ تھی کہ تم اُن باغوں کے درخت اُگاتے۔ کیا خدا کے ساتھ

امن خلق السموات والارض وانزل لکم من السماء ماء فانبتنا بہ حدائق ذات بہجۃ ج ما کان لکم ان تنبتوا شجرہا ء الہ مع اللہ ؟ بل ہم قوم یعدلون

کوئی اور معبود بھی ہے؟ مگر یہ بے سمجھ اور کج رو لوگ ہیں۔

"بھلا کس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور بیچ میں ندیاں بنائیں۔ اور اُنکے لیے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان ایک روک کر دی؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی تھا؟ مگر اکثر لوگ اتنا نہیں سمجھتے ....

امن جعل الارض قرارا وجعل خللها انهارا وجعل لها رواسی وجعل بین البحرین حاجزا ء الٰہ مع اللہ بل اکثرهم لا یعلمون ......

"بھلا خشکی اور تری کی اندھیریوں میں تمھاری رہنمائی کون کرتا ہے اور اپنی رحمت (مینہ) کے آگے ہواؤں کی بشارت کون بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود؟ اللہ بلند تر ہے اس سے جسکے ساتھ اُس کو شریک ٹھیراتے ہیں۔

امن یهدیکم فی ظلمت البر والبحر و من یرسل الریح بشرا بین یدی رحمته ء الٰہ مع اللہ؟ تعالی اللہ عما یشرکون ٥

(نمل رع ۵)

اتنا ہی نہیں ہے۔ خدا اس درس عبرت کو مطالعہ فطرت کو ایمان والوں پر لازم قرار دیتا ہے۔ جو اس سے منہ موڑے اُسکو عذاب کی دھمکی دیتا ہے۔ ایسی ہی آیتوں یا منتروں نے مناظر قدرت کو میرے لیے صحیفہ بنا دیا ہے اور ہر مسلمان کے لیے ہونا چاہیے

کبیر "تم کہتی تو حق ہو۔ مگر اب یہ تاثر مسلمان کی خصوصیت نہیں۔ خدا کی توفیق ہے جسے یہ عبرت پذیر دل اور حق بین آنکھیں دے۔

دوسرے دن پھر تارا اور کبیر اپنا اپنا رجحان طبیعت لیے سیر کو نکلے۔ سہ پہر کو کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی ہوا کھانے کی رائے قرار پائی۔ تارا کبیر کی فرمائش سے گا رہی تھی اور آنکھیں افق سمندر اور آسمان کے ملنے کی جگہ پر لگی ہوئی تھیں۔ یونہی یہ دور نکل گئے۔ شام ہوگئی۔ یکا یک بے سان وگمان خدا جانے کہاں سے چشم زدن میں بادل چھا گئے، بجلی چمکنے لگی، بارش کے ساتھ موجوں میں سخت تلاطم شروع ہوگیا۔ تارا کبیر کے کاندھے پر سر رکھے، ہاتھ اُس کی بغل میں حائل، آنکھیں بند کیے، کبیر اُسے گلے لگائے، ایک دوسرے میں گُتھے تھے۔ دونوں ملاح چیخے، بجلی چمکی، بادل کڑکا۔ ساحل والوں نے پھر کچھ نہ دیکھا۔ بجلی کی دوسری چمک میں کچھ نظر نہ آیا۔ کنارے پر شور ہوا "کشتی ڈوب گئی! کشتی ڈوب گئی!" کسی کی ہمت نہ تھی کہ سمندر میں قدم رکھے، یا کشتی لیجائے۔ محافظین ساحل کی امدادی کشتیوں کے نکلتے نکلتے دس منٹ اور لگ گئے۔ وہ ناکام واپس

آئیں۔

صبح کے اخباروں میں نہایت نمایاں اور جلی سرخیوں میں یہ خبر مشتہر تھی کہ مسٹر اور مسز کبیر جو بمبئی کے فلاں ساحل پر ہنی مون منا رہے تھے، سمندر کی سیر میں غرقاب ہو گئے۔ مسز کبیر بابو ستیش چندر چٹرجی ایم اے مشہور وظیفہ خوار ہیڈ ماسٹر کی اکلوتی بیٹی اور مسٹر کبیر الدین، احمد خان بہادر نصیر الدین احمد کے بیٹے، ٹروتھ کے ایڈیٹر، شیریں سخن مقرر اور مصلح تھے۔ حسرت و ماتم۔ دونوں کے والدین سے اظہار ہمدردی و تعزیت۔

ستیش بابو جیسے مرنے کا بہانہ ڈھونڈھ رہے تھے۔ اس خبر کی اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر بلا کسی ظاہری مرض کے صبر و خاموشی سے انتقال کر گئے۔ لاش پر ہندو، مسلمان، عیسائی، سب نے دعویٰ کیا گر کسی مذہب کے باقاعدہ اعلان کی عدم موجودگی میں وہ آبائی مذہب کے مطابق جلائے گئے۔ مسلمان اور عیسائی حسرت سے انکی جلتی ہوئی لاش کو دیکھا کیے...... اور اپنے اپنے طریقہ پر فاتحہ پڑھتے اور تکفیر کرتے گھر آئے۔ نادانوں میں آج تک چرچا ہے "ہاں! تھا سچا عیسائی گر خاتمہ اندوہناک ہوا" "افسوس! تھے پختہ مسلمان۔ قرآن شریف ہاتھ میں لیے مرے، مگر آخر وقت تک یہ کمزوری ان سے نہ گئی کہ کلمہ کا اعلان کر دیتے۔" حقیقت کو کوئی نہ سمجھا۔ سمجھنے والے پہلے ہی غرق آب ہو گئے اور یہ نذر آتش۔ شیشے پانی میں دھل کر صاف ہوئے، لوہا آگ میں جل کر پاک۔ عام کثافتیں مٹی میں دبا کر ظاہر کی جاتی ہیں۔ فرق طبیعتوں کی ساخت میں ہوتا ہے۔ اصول تدبیر اپنی اپنی جگہ سب درست ہیں۔

آکاس گری کی ایک جنگلوں اور ٹیلوں سے گھری ہوئی سرسبز وادی میں ایک مرتاض درویش کی شہرت ہے۔ صبح شام نکل کر جنگلوں میں ٹہلتا اور جھرنے کے کنارے چٹان پر بیٹھا شفق کی طرف نظر گڑائے رہتا۔ باقی وقتوں میں وہ اپنی کٹیا میں بند رہتا۔ آس پاس کے منتشر جھونپڑوں میں بسنے والے نیم وحشی کسان اپنے مویشی چراتے اس کی کٹیا کے در پر استعجاب اور عقیدت سے خاموش کھڑے اسکو تکا کرتے۔ صبح شام جہاں نظر آجاتا اسکو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے۔ اس سے کچھ کہنے سننے کی کوشش کرتے مگر جواب نہ پاتے۔ اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے، دودھ، موسم کے تازہ یا بے موسم خشک پھل رکھ جاتے۔ انہیں سے وہ تن ڈھانک اور پیٹ بھر لیا کرتا۔ رفتہ رفتہ دور دور سے اہل حاجت مرادیں لے کر آنے لگے۔ سب کا جواب ایک طرف سے خاموشی دوسری طرف عجب آمیز مایوسی تھی۔ کسی کو خطاب کا اہل سمجھ کر کچھ کہتا تو اتنا کہتا کہ

"میں خود آرزوؤں کا مارا ہوا ہوں۔ لاچار ہوں۔ تم انکو دل سے مٹاؤ اور نچنت بیٹھو۔ میں خود کھویا ہوا ہوں۔ تمہاری رہبری کیا کر سکتا ہوں؟ جاؤ جاؤ۔ مایا کے جال کو توڑو۔ اسکے پھندوں

سے نکلو۔ مجھے اس کی یاد نہ دلاؤ۔ اسے دل سے بھلانے دو۔ ورنہ میں یہاں سے بھی چلا جاؤنگا
جس طرح دو کٹیاں تم لوگوں کے کارن چھوڑ چکا۔ بن باسی فقیر کے لیے کوئی جگہ گھر نہیں پھر سب گھر ہے
دھرتی کے اوپر، دھرتی کے نیچے آکاس کے اوپر"
یہ دھمکی اہلِ حاجت کی زبان بند کر دیتی اور عقیدت بڑھا دیتی۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک اور سادھو اسی قرب کی ایک اور وادی میں نمودار ہوا۔ یہ سیلانی تھا۔ تمام تمام دن جنگلی آبادیوں میں مارا مارا پھرتا۔ جس کسی کا جانور کھو جاتا اُس کے استھان پہ آتا اور اپنا جانور پالیتا۔ کوئی بیمار ہوتا تو سادھو کی جڑی بوٹیوں اور تدبیروں سے اچھا ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ اسکے ایک دستِ شفقت، ایک بول، یہاں تک کہ ایک نظر سے بیمار کو افاقہ ہو جاتا۔ روحانی اور اخلاقی روگ کا بھی علاج کرتا۔ کتنی عورتوں نے خاوندوں کی زد و کوب سے، مردوں نے جورو کی بد مزاجی سے، پڑوسیوں نے آپس کے جھگڑوں سے، جواریوں نے جُوے کی لعنت سے، شرابیوں نے نشہ خواری کی آفت سے، مفلسوں نے افلاس سے، ننگوں اور بھوکوں نے سردی اور بھوک سے نجات پائی۔ تندرستی اور مرفہ حالی کے آثار چہروں سے ٹپکنے لگے۔ درویش آنے جانے والوں سے اکثر آپس میں اس سادھو کا چرچا سنتا اور اپنے دھیان گیان میں محو ہو جاتا۔

ایک پورنماسی کی رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ چاندنی کے کھیت میں ساری وادی اُجالی ہو رہی ہے
درویش کٹیا کے باہر الاؤ کے بھبھل کے سامنے اپنے خیالات میں مست بیٹھا ہے۔ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا:۔
"زندگی کے دن پہاڑ ہو گئے۔ اے خدا تجھ کو معلوم تھا کہ ہم نے اپنی زندگیاں تیرے بندوں کی خدمت کے لیے وقف کر دی ہیں۔ پھر تیرے ہی آہنی ہاتھوں نے میرے اعضا شل کر دیئے ؎
ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی   چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سنتے آئے، پڑھتے آئے، سیکھتے آئے کہ طلب صادق، عزم خالص، ارادہ راسخ کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ جھوٹ، بالکل جھوٹ! میں مفلوج کر دیا گیا، پاگل بنا دیا گیا۔ کیا ہماری طلب صادق نہ تھی؟ عزم خالص نہ تھا؟ ارادہ راسخ نہ تھا؟ خدا تو ہی خوب جانتا ہے۔
کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس سے کہوں؟ ستیش بابا رے؟ آہ کون مُنہ لیکر اُنکے پاس جاؤں؟ اُن کی وہ انمول امانت! وہ انوکھا ہیرا! وہ چمکتا تارا ڈوب گیا؟ ہائے ڈوب گیا (اوپر دیکھ کر) تارو تم روز ڈوبتے ہو روز اُبھرتے ہو، میری تارا پھر نہ اُبھرے گی؟" (سر جھکا لیتا ہے)

"ہاں تارا پھر اُبھر گیا، نیا وہ صاف آسمان میں تیز چمک کے ساتھ - اس وقت بھی تارا موجود ہے مگر تمھاری گرد آلود فضا میں دکھائی نہیں دیتی - اپنی فضا کو گرد و غبار سے صاف کرو اور اس کو دیکھو"

فقیر نے اس آواز پر سر اٹھایا - تھر تھر کانپنے لگا - ستیش بابو اپنے معمولی لباس میں کھڑے تھے - اُس نے قدم لینا چاہا - اُنھوں نے ذرا پیچھے ہٹ کر تیز تیوروں سے گھور کر کہا

"تم اپنی طلب کو طلب صادق کہتے ہو، عزم کو عزم راسخ کہتے ہو اور استری کو ساری خدائی پر ترجیح دے رکھی ہے - نارائن کو چھوڑ کر ناری کی ہو جاگی - اس کو کھو دیا تو خلق اللہ کو بھی چھوڑ دیا - یہی طلب صادق تھی؟ پھر بھگوان کو دوش دیتے ہو؟

میں نے پہلے ہی کہا تھا تم کچے ہو - مگر اتنا کچا نہ سمجھا تھا - کامنا نے پرماتما کو بھلا دیا؟ مخلوق سے تم بھاگتے پھرتے ہو؟ بھاگ کر جاؤ گے کہاں - کیا تم بھول گئے کہ خدا ان سے جدا نہیں - یہ رباعیاں کس نے کہی تھیں اور تم نے شایع کی تھیں؟ تمھیں نے؟ جھوٹ تھیں؟ دھوکا تھا؟

خلاق کو مخلوق کے آب و گل میں دیکھا   عاصی کی کبھی چشم خجل میں دیکھا
ہر چند وہ ہے قید مکاں سے آزاد   اکثر اُسے میں نے درد دل میں دیکھا

وہ درد دل کیا ہوا؟ صرف تارا کے لیے تھا اور اُسی کے ساتھ ختم ہو گیا؟ پھر یہ کس نے کہا تھا؟

جو شیخ کو کعبہ میں نہ طاعت سے ملا   جوگی کو نہ جنگل میں ریاضت سے ملا
اک رند تبہ حال کو وہ خالق کل   بازار میں مخلوق کی خدمت سے ملا

کیا وہ ملا اور پھر کھو گیا؟ ارے نادان کیا تو بھول گیا کہ انھیں میں خدا ہے؟ جا ان کو پریم دے اور خوش کر ورنہ دنیا کے ساتھ دھرم بھی نشٹ ہوا جاتا ہے"

کبیر - "ستیش بابا بڑے گاڑھے وقت میں درشن دیے - میں تو آپ کو منہ نہ دکھا سکتا تھا - آپ پہلے کیوں نہ آئے؟ بتائیے کیا کروں (رو کر) مجھ سے کچھ ہوتا نہیں - دل چاہتا ہے آنسوؤں سے آتما کھتی ہے خلق کی سیوا کروں، پر کلیجا بیٹھا جاتا ہے - اُٹھنے نہیں دیتا - کیا میرا سب کیا دھرا اکارت جائیگا؟ اُجالا دیکھ کر یہ اندھیرا، یہ داشت نہیں! مجھے گلے لگائیے"

ستیش کی آواز - "کبیر میرا دیا اب اس سنسار میں نہیں رہا، پھر بھی میں تم سے جدا نہیں - ٹھیک وقت پر آیا ہوں - تمھاری آتما کو ضرورت تھی اتنی رگڑ کی، اتنی تپسیا اور ریاضت کی - لوہے دل کے زنگ کو تپا کر صاف کرنے کی - خودی سے روح کو پاک کرنے کی - مبارک ہو تم اُس کٹھن گھاٹی سے نکل گئے - جاؤ یہاں سے جاؤ اپنا کام شروع کر دو"

کبیر کی آنکھ پھر جھپک گئی۔ اور دو سکنڈ میں کھلی۔ دیکھا تو ستیش بابو نہ تھے۔ ایک سادھو کھڑا اس کو گھور رہا تھا۔ کبیر نے آنکھیں ملیں۔ دیکھا۔ پھر آنکھیں ملیں پھر دیکھا۔ کھڑا ہو گیا۔

کبیر "تم کون ہو بابا؟ ابھی تمھیں مجھ سے باتیں کر رہے تھے؟ تم تو نہ تھے۔ میں جس سے باتیں کر رہا تھا کدھر گیا؟ تم نے کسی کو یہاں دیکھا؟ تم کہاں سے ٹپک پڑے؟"

سادھو "میرا استھان اسی پڑوس میں ہے۔ جو کچھ ہوں میری صورت سے ظاہر ہے۔" (کبیر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتا ہے) میں تو ابھی آ رہا ہوں کسی کو بھی نہیں دیکھا۔"

کبیر "کیوں کر آئے سادھو بابا؟" (سادھو اور قریب ہو جاتا ہے اور چاندنی کی روشنی میں چہرہ کو گھورتا ہے۔)

سادھو "یہ میں نہیں بتا سکتا۔ بے ارادہ کوئی چیز آپ ہی آپ کھینچ لائی۔ وہ چیز ایشور کی اچھا کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ اُس کا کوئی فیصلہ قریب ہے۔"

کبیر "ارے سادھو سچ سچ بتا تو ہے کون؟ یہ میں کس کی آواز سُن رہا ہوں؟ (آنکھیں مل کر) بتا دے میں ہوش میں ہوں؟"

سادھو "ہے پرماتما میں کس کی آواز سن رہی ہوں؟"

ایک منٹ کے اندر کبیر اور سادھو ایک ساتھ بول اُٹھتے ہیں "میری تارا" "میرے کبیر" اور دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے۔ سپیدۂ صبح کی چادر پھیل رہی تھی، چڑیاں گا رہی تھیں، نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے خودرَو پھولوں کی خوشبو کھیر رہے تھے۔ آبشار کی آواز اب بھیانک نہ تھی خوش آیند موسیقی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ دونوں میں سے کوئی ڈوبا نہ تھا۔ موجوں نے ایک کو ایک ویران ساحل پر اور دوسرے کو دوسرے سرے پر ڈال دیا تھا۔ ایک نے دوسرے کو مردہ سمجھ لیا اور رو بیٹھا۔ مایوسی نے ترکِ دنیا پر آمادہ کر دیا۔ ایک غیب کا ہاتھ تھا جو دونوں کو جس طرح چاہتا تھا نچاتا تھا۔ اور جب تک چاہا نچایا۔ یہ ستیش بابو کی ملاقات خواب نہ تھی، وہم نہ تھا۔ آفتاب کی سی روشن حقیقت تھی جس کی تعبیر ہم آپ تو کیا کہیں گے خود کبیر اور تارا کو آج تک ڈھونڈھ رہا ہے۔ آیا یہ سب کچھ ہوش میں دیکھا اور جھیلا یا بے ہوشی میں۔ اگر ان کی غرقابی کی خبر اخباروں میں محفوظ نہ ہوتی، احباب انکے غائب ہونے کا چرچا نہ کرتے، اور تھوڑی دیر وقت نہ ہوتا، کاغذات شہادت نہ دیتے تو یہ بھی ارونگ واشنگٹن کے رِپ وین ونکل کا طلسم دماغی یادگار نہ شخصیت کا ایک نفسیاتی ظہور تصور کر لیتے۔

تارا اور کبیر نے اب تازہ جوش عمل کے ساتھ نئی زندگی اختیار کی۔ تروتھ انگریزی اشاعت کے علاوہ اردو ہندی بنگالہ رسم خطا و زبانوں میں بھی جاری کیا گیا اور اُسے مقبولیت عام حاصل ہوتی جاتی ہے۔ تارا کے زیر نگرانی ایک مسکین خانہ قائم ہے جس میں ناقص العضو پرورش پاتے اور جزوی صلاحیت والے حسب صلاحیت پیشے سیکھنے اور کمانے کے لائق بنائے جاتے ہیں۔ قومی خیرات و صدقات انکے کفیل ہیں۔ ایک متحرک کتبخانہ کھلا ہوا ہے جس کی کتابیں اور اخبارات و رسائل گاؤں گاؤں ہر دار المطالعہ میں پہونچا پہونچا کر ایک ایک ماہ رکھے جاتے ہیں۔ غریب پیشہ وروں کے بچوں اور بچیوں کے لیے شبینہ مکتب جاری ہیں جن میں تارا بھی ایک ایک گھنٹہ درس دے آتی ہے۔ ان کل اداروں میں انسانی محبت و مساوات کی عملی تعلیم دی جاتی ہے خانگی صنعت و حرفت کے سامان اور ذرائع مہیا کر کے غریبوں کی رفاہ اور خوشحالی کی بنا ڈال دی گئی ہے اول اول حکومت ان سے بھڑکتی اور عوام جھجکتے رہے، مفسدوں نے بدنامیاں پھیلائیں، مگر رفتہ رفتہ غلط فہمیاں دُور ہوئیں اور اب متعدد روسا و حکام ان کے معاون ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی بنیادیں مضبوط ہو چکی ہیں اور اپنے بل پر کھڑے ہیں۔

تارا اور کبیر آج بھی خلق میں پریم کا شراب خانہ کھولے بیٹھے ہیں لیکن اس پر کوئی تختی، سائن بورڈ، اشتہار نہیں، پروپگینڈا نہیں۔ مگر پینے والوں کو اب تک چاٹ نہیں لگی۔ ادھر رُخ کم کرتے ہیں۔ لوگ ستی شراب سے مخمور ہیں، سیاہ مست ہیں اور وہی پیے جاتے ہیں

ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

وقت قریب ہے کہ خلق اس کا مزا چکھ جائے۔ پھر اس پریم کے میکدہ میں ہُو حق کی صدائیں گونجتی ہوں گی فرقہ واری کے بُھٹوں میں گتے لوٹتے ہوں گے۔

غزل جناب محمد شرف الدین صاحب تسلیم بنگلوری

دشمنِ جاں شب فرقت ہوگی | جو گھڑی ہوگی مصیبت ہوگی
بعد مدت وہ ملے ہیں ہم سے | رات بھر آج شکایت ہوگی
آئے گا چاند سی صورت والا | میرے کاشانہ کی زینت ہوگی
گالیاں اور بھی دیتے جاؤ | کہ زیادہ مری عزت ہوگی
دلِ وارفتہ یہ کیا سمجھا تھا | کسی کافر سے محبت ہوگی

بے نقاب آئے جو وہ محشر میں
اے تسلیم اور قیامت ہوگی

آکاش کی دیوی

(ایک مختصر تمثیل)

(جناب سید حامد حسن صاحب بلگرامی بی اے (آنرس) ایم اے)

افراد:-

شانتی - ایک امیر خاندان کی خوبصورت لڑکی - کرشن کی بیاہی بیوی
کرشن - شانتی کا شوہر -
کملا - کرشن کی بہن -
میکو - کرشن کے باغ کا مالی -
مختار

(کرشن اپنے مکان کے مغربی برآمدے میں ایک البم کو نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا ہے - عنقریب غروب ہونے والے سورج کی ترچھی شعاعیں درودں کی لٹکتی ہوئی بیلوں، اور پام کے طاؤس رقصاں پتوں سے گزرتی ہوئی اُسکے پیروں پر پڑ رہی ہیں، کرشن کے چہرے پر ہلکے تبسم کی لطیف لہریں نمایاں ہیں ...... شانتی باغ کے ایک حصہ میں چھوٹے چھوٹے پودوں سے دلبستگی کر رہی ہے، ٹہلتے ہوئے ادھر آ جاتی ہے - اسکی نگاہ کرشن پر پڑتی ہے، کرشن کو مسرور دیکھ کر خود اسکی مسرتوں میں شریک ہونے کے لیے ادھر مُڑ جاتی ہے ...... پیروں کی آہٹ سے کرشن کی نظریں ادھر اُٹھ جاتی ہیں شانتی کو آتا دیکھ کر مسکراتا ہے اور البم بند کر لیتا ہے)

شانتی - (ایک دلفریب تبسم کے ساتھ) آج ...... کیا دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں؟

کرشن (کرسی پر کسی قدر سنبھلتے ہوئے) کچھ نہیں ایک پُرانا البم دیکھ رہا تھا -

شانتی (نزدیک آتے ہوئے) اچھا - میں بھی تو دیکھوں -

کرشن (پاس رکھی ہوئی کرسی کو کچھ نزدیک کر لیتا ہے) بیٹھو تو سہی -

شانتی کرسی پر بیٹھتی ہے

شانتی - دکھلائیے ؟

کرشن - شانتی اسے نہ دیکھو - یہ تصویریں ... ایک ... پُرانی ... داستان کی یادگاریں ہیں (منہ بگھا کے) بھرتے ہوئے زخموں سے کھیلنے سے کیا فائدہ -

شانتی - بس رہنے دیجیے - آپ ہمیشہ یوں ہی جھیڑا کرتے ہیں

کرشن نہیں شانتی تمہارے سر کی قسم آج جھوٹ

نہیں ہوتا۔

(کرشن کی بیساختہ قسم شانتی کو حیرت میں ڈالدیتی ہے۔ کرشن کی محبت قسم کو سچ ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ اور وہی محبت اسکے یقین میں سدِّراہ ہے)

شانتی - نہیں پیارے کرشن میں سنوں گی اور ضرور سنوں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ عورت حقیقت کو معلوم کرنے کیلئے اتنی ہی بیتاب ہوتی ہے جتنا کہ آپ لوگوں کے خیال سے وہ ایک راز کو ظاہر کرنے کےلیے۔

کرشن - آج تو آپ نفسیات پر تُلی ہوئی ہیں خیر سُنیئے لیکن مجھے الزام نہ دیجیے گا، ہر انسان سے لغزش ہوسکتی ہے اگر مجھ سے بھی ہوئی تو وہ ایک انسانیت کی دلیل ہے۔

شانتی۔ ! ؟ (یعنی سراپا سوال اور مجسم استعجاب)

کرشن (سگرٹ جلاتے ہوئے) اچھا سنیئے.. لیکن ایک شرط ہے۔

شانتی - وہ کیا ؟

کرشن - کہ آپ کو پوری داستان سُننا پڑیگی۔

شانتی - سنوں گی۔

کرشن - آج چار سال کا زمانہ ہوا میں ایک لکچر میں گیا ہوا تھا۔ میری آنکھوں نے ایک جادو دیکھا۔ نظریں ٹھٹھک کے رہ گئیں۔ سمجھیں۔ یہ ایک حیا کی دیوی تھی جسکے رسیلے جسم کو سبز رنگ کی ایک ہلکی ساڑی اپنے آغوش میں لیے ہوئے تھی۔ کامدانی کے سیک بوٹے بجلی کی تیز روشنی میں چمک چمک کر نگاہوں میں کھبے جاتے تھے۔ چہرے کی شگفتگی اور تازگی نظروں سے گزر کر دل کی گہرائیوں کا جائزہ لیتی تھی۔ اور دل کو درسِ محبت دیتی تھی۔ شانتی، مجھے محبت کا احساس پہلی بار وہیں ہوا۔ درد کی پہلی ٹھمک، محبت کی لطیف گرانی، وہیں محسوس ہوئی، میں بیتاب تھا... اور اُسوقت تک اس بیتابی میں تبدیلی نہ ہوئی جب تک کہ میرے ایک پیارے دوست نے اُس کی تصویر مجھے لادی....
شانتی، دیکھو یہ اس کی پہلی تصویر ہے۔

(شانتی کو تصویر دکھاتا ہے) یہ شانتی ہی کی تصویر تھی جو شادی سے قبل.... کرشن نے حاصل کرلی تھی۔

شانتی (کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑجاتی ہے)

کرشن مسکراتا ہے...

شانتی - بس رہنے بھی دیجیے - آپ نے کیں نہ وہی چھیڑ کی باتیں ....

کرشن (جوشِ محبت سے ....)

اب تو تمھیں پوری داستان سننا پڑے گی۔

کرشن - ایک روز سخت گرمی پڑ رہی تھی، سمجھیں شانتی، بہت گرمی تھی۔ میں اپنی محبوبہ کے ساتھ تھا۔ دھوپ کی تپش اور گرمی کی زیادتی سے اُسکے گلابی چہرے پر پسینے کے قطرے آگئے۔ میں نے انھیں رومال سے خشک کرنا چاہا، لیکن وہ مجھے اتنے بھلے معلوم ہوئے کہ جیسے چنبیلی کے پھولوں پر اوس کی بوندیں۔ شانتی میں نے اُس چہرے کی بھی تصویر لے لی۔ دیکھو یہ ایک دوسری تصویر ہے۔ (یہ بھی شانتی ہی کی تصویر تھی)

شانتی (چُپ ہے، کرشن کی دیوانہ وار محبت پر کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن زبان ساتھ نہیں دیتی۔ چہرے پر حیا

کی سرخیاں آتی ہیں اور مِلی جاتی ہیں)

کرشن - شانتی تیرتھ کے دن تھے، ہم لوگ اپنے اُن گناہوں کو جن کی وجہ سے ہمیں اپنی زندگی میں ملنے کے لیے عمر کے ۲۲ سال انتظار کرنا پڑا، اُن پاپوں کو دھونے گئے - گنگا کے کنارے بہت جاتری آتے تھے - شانتی ہماری محبوبہ بھی، اپنے لطیف جسم کو ہلکی سفید ساڑی میں چھپائے ہوئے نہانے گئی - تھوڑی ہی دیر میں لہروں کے جھولے میں تھی، پانی میں پہنچکر وہ ایسی خوش تھی جیسے ایک معصوم بچہ اس کی گود میں، گنگا کی پاک لہریں اُسکے جسم سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں - اُس نے پانی میں ایک غوطہ لگایا لیکن گھبراکر اُٹھ کھڑی ہوئی، مجھے یہ سماں بہت بھایا - میں نے اُسکی بھی ایک تصویر لے لی - دیکھو شانتی (تصویر دکھاکر) بھیگے بھیگے بال چاند سے چہرے پر کیسے چپٹے ہوئے ہیں شانتی مجھے یہ تصویر بہت پسند ہے -

شانتی - بس رہنے دیجیے - آپ پریم کے دیوتا ہیں - دو سال سے زیادہ مجھے آپ کے چرنوں کی سیوا کرتے ہوگئی لیکن آپ کی محبت بڑھتی ہی جاتی ہے -

کرشن - (شانتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے) شانتی میں اس فلسفہ کا قائل نہیں کہ محبت کو صرف تمناؤں تک محدود رکھا جائے، اور اس صداقت کو پاکر اُسکی اتنی ہی قدر نہ کی جائے - شانتی، محبت ایک حسن ہے، اور حسن صداقت - جس کو پاکر آرزو سے زیادہ خوشی ہوتی ہے - شانتی، .... مجھے یہ سبق تمھیں سے تو ملا ہے - ورنہ شاید میں بھی کسی فلاسفر کی طرح محبت کی ہجر اُن نصیبی کو ازدواجی زندگی کی خوشگوار گھڑیوں سے بہتر سمجھتا -

شانتی - آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں - آپ ہمارے رام ہیں (حیا سے سر جھکاکر) کاش میں آپ کی سیتا بن سکتی -

کرشن (نرم اُنگلیوں پر محبت کی ایک یادگار قائم کرتے ہوئے) یہ کیا اُلٹی گنگا بہا رہی ہو - لیکن ... ہاں ابھی داستان باقی ہے

شانتی - نہیں پیارے کرشن (ہاتھ چھڑاتے ہوئے) اب رہنے دیجیے،

کرشن - اچھا خیر، یہ تصویر اور دیکھ لو (تصویر دکھاکر) بظاہر چہرے پر غصہ کے آثار ہیں - شاید اسوقت "انھیں" کوئی کام تھا اور مجھے الفت کی چھیڑیں سوجھی تھیں - وہ روٹھ گئیں، میں نے منانا چاہا - چہرے پر غصہ کے کچھ نشان ہیں نا؟ ... شانتی، مجھے غصہ بھی پیارا معلوم ہوتا ہے - کیمرا اٹھا لایا، اور پاس رکھے ہوئے ایک طشت پر گلدان گرا دیا - وہ چونک پڑی کچھ غصے اور کچھ خوف سے چہرہ تمتما اٹھا - دیکھو تصویر میں دونوں پہلو کتنے نمایاں ہیں - لیکن شانتی، مجھے اس میں بھی نینوں سے پریم ہی ٹپکتا معلوم ہوتا ہے - اور دیکھو .....

شانتی (البم ہاتھ سے کھینچ لیتی ہے اور اُٹھ کھڑی ہوتی ہے)

کرشن (مسکراتا ہے اور .....

پردہ گرتا ہے

دوسرا سین

(قریب ایک سال کے گزر گیا، فطرت کی ستم ظریفی تھی کہ شانتی کے خوبصورت اور سڈول جسم پر فالج کا اثر ہوگیا۔ وہ بچ گئی لیکن جسم کے بعض اعضا پر اُسکے اثرات رہ گئے ...... شانتی گھر کے صحن میں دھوپ میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے، کسی قدر فاصلے پر ایک پلنگ پر اسکی ساس اور کرشن کی بہن کملا بیٹھی ہیں)

کرشن کی ماں - پرمیشور نے بڑی دَیا کی کہ بیٹی شانتی کو اُٹھا کھڑا کیا۔

کملا (کرشن کی بہن) اور کیا، ماتاجی ملیں تو بھائی کہیں کے نہ رہتے۔

ماں - دیکھتی تھی کہ اُس کی بیماری کے زمانہ میں کرشن کا کھانا پینا کیسا چھوٹ گیا تھا۔

کملا - کچھ بھگوان ہی کو کرشن کی خوشی منظور تھی، کچھ نام کی بھی برکت تھی۔

ماں - بیٹی سچ کہا۔ میں نے اس کا نام رکھنے کے لیے لاہور کا ایک پنڈت بلایا تھا۔ بڑا گیانی تھا، پوتھی کھولتے ہی بول اُٹھا، کرشن نام رکھو۔

کملا - تبھی تو بہن شانتی کا سہاگ ملا۔

ماں - یہ اُلٹا سہاگ، کملا یہ بھی تجھے ایک ہی سوجھی۔

(شانتی کی نگاہیں کتاب پر ہیں لیکن وہ یہ گفتگو سُن رہی ہے، پیشانی پر کچھ شکنیں نمایاں ہوتی جاتی ہیں)

شانتی (کتاب سے نگاہ ہٹا کر زمین کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچ رہی ہے) کیا ماتاجی کا یہ خیال سچ ہے؟ یا میں ہی غلطی پر ہوں؟ کیا کرشن اب بھی مجھ سے اُتنی ہی محبت کرتا ہے؟ .... اور اگر ..... لیکن نہیں ... کرشن کا راتوں کو دیر سے آنا، مجھ سے زیادہ دوستوں کے پاس بیٹھ کر وقت گزارا کرنا .... اس کل ہی کی تو بات ہے ... میں نے کرشن کو پکارا .... وہ باہر جا رہے تھے ...... لیکن .. چلے گئے ... شاید ... نہ سنا ہو .... مگر اس سے پہلے وہ اس سے دھیمی آواز سُن لیا کرتے تھے ..... یوں تو اور بھی بہت سی باتیں ہیں ... لیکن نہیں، اکثر انسان جب اپنے میں کوئی کمزوری محسوس کرتا ہے تو سمجھتا ہے کہ دنیا اُس کو ذلیل نظروں سے دیکھ رہی ہے ... شاید یہی ہو ... مگر میں .... اس کو کیا کروں .... دل نہیں مانتا۔

(پھر کچھ سوچ کر، کتاب بند کر دیتی ہے، اور کمرے کی طرف چلی جاتی ہے)

شانتی - آئیں کرشن، آپ یہاں بیٹھے ہیں۔

کرشن - ہاں! ادھر آیا، دیکھا آپ کتاب پڑھ رہی ہیں، میں بھی یہ کتاب پڑھنے لگا۔

(کرشن کی زبان سے آپ کا لفظ اسی طرف شانتی نے پھر سنا تھا)

کرشن - یہ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ مسٹر بیگ[1] نے عورتوں کی کمزوریوں کا چربہ اُتارا ہے۔

شانتی - لیکن اُنھوں نے تصویر کا صرف ایک ہی رُخ دیکھا ہے۔ عورت بیشک کمزور ہے لیکن اُس کی کمزوری

[1] مسٹر عظیم بیگ چغتائی - مصنف "کمزوری"

دماغ و خیال کی کمزوری کہی جا سکتی ہے نہ کہ عمل کی۔
کرشن۔ یہ نظریہ عام خیالات سے کسقدر مختلف ہے۔
شانتی۔ ہاں اس لیے جدا ہے کہ ان بیچاریوں کے جذبات کی ترجمانی آپ کے بھائی بند کرتے ہیں اور شانتی کی زبان خود اُسکے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے۔
کرشن۔ تو کیا آپ مردوں کو عمل میں کمزور خیال کرتی ہیں۔
(شانتی کے دل پر آپ کے اعادہ سے ایک اور چوٹ لگتی ہے۔ گزشتہ محبت کی یاد آتی ہے۔ آنکھیں پُرنم ہوتی معلوم ہوتی ہیں لیکن خوددار شانتی آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو خشک کر کے جواب دیتی ہے)
اس بحث کی بنیاد خیالات پر ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے آپ کے خیالات کا سنگم اب نہ ملے۔ لیکن اتنا غالباً آپ بھی مانیں گے کہ عورت اپنے خیالات اور عقیدے میں مرد سے زیادہ دھنی ہوتی ہے۔ مرد کے خیالات بدلا کرتے ہیں ... کرشن؟ ... اُس کی محبت بھی بدلا کرتی ہے ... لیکن عورت اُسکے عقیدہ اور اُس کے جذبات آکاش پر قطب ستارے کی طرح چمکتے رہتے ہیں .... سمجھے کرشن۔ اسی کو مرد عورت کی کمزوری سمجھتے ہیں اور عورتیں اسی کو اپنا زیور۔
کرشن مسکرا کر چپ ہو جاتا ہے۔
(پردہ گرتا ہے)

تیسرا سین

(آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے لیکن شانتی کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہے۔ رات کا سناٹا ہے، دور رکھی ہوئی شمع کی دھیمی لیکن اُداس روشنی کرشن کے بےخبر چہرے پر پڑ رہی ہے، اور شانتی کی ٹکٹکی کبھی شمع کی طرف بندھ جاتی ہے تو کبھی کرشن کے سوتے ہوئے چہرے پر۔)
شانتی (کرشن کو سوتا دیکھ کر دل ہی دل ہی دل میں یا زبان یاس سے) پیارے کرشن، اپنی تباہی میں تمہیں شریک غم کرنے کی ہمت اب نہیں۔ اور نہ تمہارے دل ہی کو وہ بے چینی ہے کہ شانتی کی ہلکی سی آہٹ سے بھی تمہاری آنکھ کھل جائے ... ہاں ... وہ تاریک رات جب ہم لوگ وادی کی پہاڑیوں اور آبشاروں میں اپنا راستہ بھول گئے تھے۔ کس بلا کی تاریکی تھی۔ مگر نہیں۔ اس تاریکی میں بھی ایک روشنی تھی۔ تارے نہ تھے ... چاند نہ تھا ... لیکن پریم کے دو دیئے ضرور جل رہے تھے ... آج کتنا اندھیرا ہے ....
(شمع کی لو تیز کرتی ہے)
... پیارے کرشن کیا وہ محبت ... محبت نہ تھی، آہ محبت اور ہوس اپنی پہلی منزل میں کس قدر قریب ہیں ...... "بھیگے ہوئے بال چاند سے کیسے چھپے جاتے ہیں" .... "شانتی" گرمی کے دن تھے .. آہ
(آنکھ سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ شمع کی دھیمی روشنی پھر دھندلی ہو جاتی ہے) اُف، محبت، محبت دھوکا ہے .. وہم ہے .. بیماری ہے ... حسن کی بےچین کر دینے والی جرات، دل ہر کیف حسن کی سرشاریوں کے لطف اُٹھانے جانے کی تمنا ... کیا محبت اسی کا نام ہے

.... مگر نہیں - ہوس کے راون کا پریم کی سُندرتا سے
کیا مقابلہ - دنیا کی سب چیزیں دھوکا ہو سکتی ہیں ...
آکاش کی سب چیزیں ممکن ہے مایا ہوں ... محبت
مایا نہیں - ہوں ... دُنیا (کرشن کروٹ بدلتا ہے -
شانتی اپنے خیالات میں غرق ہے) ہم دُنیا کی مایا میں
پڑکے یہاں کی ریتوں سے آزاد ہونے آئے ہیں'
اور محبت کے دیوتا کے آگے پریم کے دیئے جلاتا ہے ....
تکلیفیں اُٹھا اُٹھا کے، مصیبتیں جھیل جھیل کے اسی
محبت کی آگ ... آگ کو روشن رکھنا ... یہی زندگی
کا جوہر ہے - (شانتی کے چہرے پر سرخی دوڑ جاتی ہے -
شمع گل ہو جھلملانے لگتی ہے - شانتی اُٹھتی ہے شمع
کی لَو کچھ اور تیز کرتی ہے - کرشن کی نظریں شانتی کے
پُرنم چہرے اور غرقاب آنکھوں سے دیکھنے سے قاصر
ہیں - شانتی بامشتی بکڑکر کرشن کے قدموں پر پڑی ہوئی
چادر کو عقیدت سے چومتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

چوتھا سین

(صبح کا وقت ہے، سورج ابھی نہیں نکلا لیکن
صبح کی وہ کیفیت اور روشنی جو اس کی پیش خیمہ ہوتی ہے
پھیلی ہوئی ہے - شانتی بنگلے کے پھاٹک تک جا رہی
ہے تاکہ گزشتہ رات کے لکھے ہوئے خطوں کو اپنے
ہاتھ سے ڈاک کے حوالے کر دے —)
میکو مالی (شانتی کو دیکھتے ہی سنبھلتے ہوئے گملے
کو چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے) مجھو رانی بندگی

شانتی (ہاتھ میں لیے ہوئے لفافوں سے بلا نظر اٹھائے
سر ہلا دیتی ہے)
میکو (دو پھول توڑکر) حضور (پھول پیش کرتا ہے)
شانتی (مالی کی طرف نظر اٹھا کر) پھول لے لیتی ہے -
(کچھ دیکھتی ہے اور پھر کچھ سوچ کر) مالی چنبیلی کے پھول
نہیں ؟
میکو - ابھی کا ہے نہیں حضور (پھول توڑنے بڑھتا ہے)
شانتی (کی نظریں باغ کے دلفریب پھولوں پر پڑتی
ہیں، جن پر اوس کی بوندیں ہنوز چمک رہی ہیں)
دیکھو اوس کے قطرے نہ گرنے پائیں -
مالی - سنبھال کر گچھا توڑتا ہے اور پیش کرتا ہے -
شانتی - پھول لے لیتی ہے اُن کو بغور دیکھتے ہوئے
پھر لیٹر بکس کی طرف چل دیتی ہے —
شانتی - (چنبیلی کے گچھے کو ایک بار پھر دیکھتی ہے -
مسکراتی ہے اور ایک طرف بیل پر ڈال دیتی ہے)
خط ڈالنا چاہتی ہے - لیٹر بکس پر لکھے ہوئے وقت کو
دیکھتی ہے اور پھر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچنے لگتی ہے - وہ
ایک کشمکش میں ہے جس کو چہرے کی رنگت اور آنکھوں
کی حیرت روشن کیے بغیر نہیں رہتی - چھوٹی چھوٹی چڑیاں
چہچہاتی ہوئی پاس سے نکل جاتی ہیں - ایک بار پھر
اُن نظروں سے جن میں کشمکش تیقن سے بدلتی نظر آتی
تھی ایک لفافہ کو دیکھا - اور ایک عجیب کیفیت
استقلال سے خطوں کو ڈاک کے حوالے کر دیا —
شانتی واپس آتی ہے تو کرشن کو اُٹھا پاتی ہے'
کرشن - آج آپ بہت صبح اُٹھ پڑیں -

شانتی - ہاں آنکھ کھل گئی، ذرا ٹہلنے کو جی چاہا،
اور....

کرشن - اور کیا؟

شانتی - (میز کی چیزوں کو سنبھالتے ہوئے اور کرسی کو
قریب کرتے ہوئے) دو ایک خط بھی ڈالنا تھے -

کرشن (جماہی لیکر) آج بڑے ضروری خط لکھ ڈالے؟

شانتی - بہت ضروری - پتا جی کو عرصہ سے کوئی خط
نہ بھیجا تھا، ایک اور خط بھی ضروری تھا -

کرشن (چپ ہو جاتا ہے) میز پر رکھے ہوئے سگریٹ کیس
کو اٹھاتا اور مسہری کے تکیہ سے ٹیک لگاکے
سگریٹ پینا شروع کرتا ہے - دھوئیں کے حلقے کمرے
میں پھیلتے جاتے ہیں -

شانتی - تو آج گاؤں جانے کا ارادہ ہے؟

کرشن - ضرور جاؤں گا ـــــ کاغذ دے دیجیئیگا -
(پلنگ سے اٹھ پڑتا ہے)

پردہ گرتا ہے

پانچواں سین

کرشن اپنے گاؤں میں کا مذات کا معائنہ کر رہا
ہے، ہرکارہ ڈاک دیتا ہے - اسکی نظریں ایک لفافہ
پر جم جاتی ہیں - مانوس تحریر اسکو حیرت میں ڈالے
ہوئے ہے - لفافہ کھولتا ہے ـــ

کرشن (دل ہی دل میں) یہ شانتی کی تحریر معلوم ہوتی
ہے - لیکن شانتی کا خط اور ڈاک سے! (اب اسکی
نظریں خط پر پڑیں - خط پڑھنا شروع کرتا ہے - آنکھوں
سے حیرت اور چہرے سے پریشانی نمایاں ہوتی جاتی ہے-
پھر اسکے منہ سے بیساختہ آہ نکل جاتی ہے" آہ شانتی...
پیاری شانتی" وہ مکان کی طرف بے تحاشا بھاگتا
چلا جاتا ہے -

(ہر شخص متحیر ہے)

مختار - خیر تو ہے حضور - (کرشن کی دیوانگی اس کو جواب
نہیں دینے دیتی - وہ مکان کی طرف بھاگ رہا ہے)

مختار (فوراً موٹر منگاکے) حضور موٹر تیار ہے - آپ
مکان جلد پہونچ جائیے گا -

کرشن - جلد پہونچ جاؤں گا (فوراً موٹر میں بیٹھ جاتا ہے)
بہت تیز - ڈرائیور بہت تیز لیچلو - (موٹر چالیس میل
کی رفتار سے جا رہی ہے)

کرشن - اُف کس قدر آہستہ - (کھڑا ہونے لگتا ہے)
تیز لے چلو - اور تیز - آہ - بہت تیز.... (جھنجلا کے)
اُف - تم سے نہیں چلا جاتا -
(پھر خط کو دیکھنے کی جرأت کرتا ہے) آہ شانتی میں
کس قدر پاپی ہوں ــ موٹر سے کود پڑنا چاہتا ہے-
مختار فوراً پکڑ لیتا ہے -

کرشن - مجھے چھوڑ دو - میں مروں گا نہیں (گھڑی
دیکھ کر) اُف - کل ۲ منٹ باقی ہیں (چیخ اٹھتا ہے -
آنسو کے قطرے بے تحاشا نکلنا شروع ہو جاتے ہیں...
ایک بار پھر چھڑانے کی کوشش کرتا ہے - گھڑی کی سوئی
ایک پر آئی - کرشن کی ایک ہیبتناک آواز اسکے اوسان
کی آخری الوداع تھی - اب وہ بیہوش تھا -.......
مختار نے ہاتھ سے خط لیکر پڑھنا شروع کیا -....)

(کرشن .... آہ پیارے کرشن - آپ کی شانتی

اپنے بڑھے اور خراب جسم سے اب آپ کی آنکھوں کو دکھ نہ پہونچائیگی ..... میں جانتی ہوں کہ اب میں اس جسم کی مالک نہیں جسکے پسینے کے قطرے چنبیلی کے پھولوں پر اوس کی بوندیں معلوم ہوں - میں جانتی ہوں کہ میرے چاند سے چہرے کو جسے کبھی بھیگے بالوں نے چھپا لیا تھا آج گرہن لگ چکا - اب نہ تو اس میں آنکھوں کے لیے تازگی باقی ہے اور نہ دل کے لیے مسرت ....

کرشن ... ہمارے ملک کی اکثر عورتوں نے چتا میں جل جل کے زندگی کے جوہر دکھلائے ہیں، آج شانتی آپ کی خوشیوں کے لیے آپ کی زندگی میں ستی ہوتی ہے - میرے نزدیک حیات کا مفہوم اُس وقت ختم ہو جاتا ہے جب پریم کی نظر اُس پر سے اُٹھ جائے - اس وقت روح کی آزادیوں میں کسی خاکی جسم کو حائل رکھنا بزدلی ہے - آج میری چتا کے شعلے ایک بجے دن کو اُٹھیں گے - اور آپ کے واپس ہونے تک شانتی کی آتما اُس دن کی منتظر ہوگی جب محبت ظاہری جسم اور لباس کی ماایا سے گزر کے صرف آکاش کا تارا بن کے چمکے گی -

پیارے کرشن ..... آپ نے مجھے دکھ ..... نہیں دیا - اگر مجھے دکھ پہونچا تو اپنے مقدر سے - البتہ اگر یہ خط کچھ دیر کے لیے آپ کی آنکھوں کو پُرنم کردے تو اسکی لکھنے والی کو معاف کیجیے گا'

پیارے کرشن ..... الوداع

آپ کی ..... شانتی

مختار کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں - ڈرائیور بہ ہوا سی سے موٹر چلا رہا ہے - کرشن بیہوش ہے - کار بنگلے کے قریب پہونچتی ہے ... جسکے اوپری صحن سے آگ کی تیز شعاعوں کے ساتھ دھوئیں کے تاریک بادل اُٹھ رہے ہیں - مختار کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے اور تیزی سے ڈھلکنے لگتے ہیں ..... اسی دھوئیں میں اُسے شانتی کی معصوم صورت نظر آتی ہے جو شعاعوں کے ساتھ آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہے لیکن نظریں کسی کی آخری دید کی منتظر ہیں)

پردہ گرتا ہے

غزل مولوی محمد جمال احمد صاحب محوی : جلال پور (فیض آباد)

ہنس ہنس کے وہ ہماری نظر دیکھتے رہے
تاثیر تیری دیدۂ تر دیکھتے رہے

ارض و سما کو زیر و زبر دیکھتے رہے
ہم انقلاب شام و سحر دیکھتے رہے

محویتِ جمال کا اللہ رے اثر
اُن کی نظر میں اپنی نظر دیکھتے رہے

انجام جانتے تھے جو وعدہ کی رات کا
ہم شام سے نمودِ سحر دیکھتے رہے

وہ چونک چونک پڑتے تھے بستر سے بار بار
آہوں کا اپنی ہم یہ اثر دیکھتے رہے

محفل میں گو نہ تھا میں سزاوارِ التفات
جب تک رہا مجھے وہ مگر دیکھتے رہے

محوی ہنر کا ہم کو تو دعویٰ کبھی نہ تھا
لیکن نگاہِ اہلِ ہنر دیکھتے رہے

اُردو ادب پر ایک خطبہ

(جناب مولوی مشیر احمد علوی صاحب کادری بی اے)

(سلسلۂ الناظر ماہ اپریل)

ہم نے اب تک شعر و شاعری سے بحث کی، لیکن اب ہم مختصراً دکن، دہلی، لکھنؤ، رامپور اور پٹنہ کی نثر نگاری پر بھی تبصرہ کرنا چاہتے ہیں جسکا مرکز بعد کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم ہوا۔ وہاں ممتاز ادبا سرکاری اداروں کے لیے نصاب کی غرض سے مقرر کیے گئے۔ گو یہ اقدام وقتی تھا لیکن اُس نے اُردو کو بہت فائدہ پہونچایا اور ۱۸۳۰ء میں طباعت کی ایجاد سے کتابیں شایع ہو کر شوقین افراد تک پہونچنے لگیں۔ لیکن جو ضیا برطانوی دارالسلطنت کو روشن کیے ہوے اور جگمگا رہی تھی وہ ہل وہ شاہان مغلیہ کے ظل عاطفت کی ساختہ پرداختہ تھی اور دہلی سے آئی تھی جو سلاطین مغلیہ کی واگزاشتہ راجدھانی تھی۔

اس تاراج شدہ قافلہ کے میر سالار، میرامن اور اُنکے حاشیہ نشیں افسوس اور رجوان سب دہلی نژاد تھے۔ اُنھوں نے زبان اُردو کے عہد کو متبرک بنایا، اسالیب بیان اختراع کیے، نقش ونگار بنائے، ملائمت و سادگی بخشی اور ایرانی کلغی کی بدھیاں ڈالیں، منقش زیورات سے صاف موثر مرصع اور طرحدار بنایا۔ اس طرح اسلوب ادبی انتہائی ارتفاع کے ساتھ الجھتا گیا، سلجھتا گیا اور پھیل کر ظاہر ہوتا رہا۔ اور انیسویں صدی کے پہلے نصف حصہ تک یہی اسلوب بیان غیر منقطع افضلیت کی حیثیت سے برسر حکومت رہا۔

جب نثر اُردو فورٹ ولیم اسکول کے عقلا کی زیر نگرانی غیر معمولی ترقیاں کر رہی تھی تو شمالی ہند میں سید احمد (شہید) اسلام میں اصلاحات کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور اس مطالبہ نے ترقیوں کی جدید شاہراہیں کھولدی تھیں۔ نقطۂ خیال بدل گئے تھے، تخیلات کے مرکز جدا ہوگئے تھے۔ جماعتیں علیحدہ ہوگئی تھیں۔ خوفناک مباحث و قضایا کا دروازہ کھل گیا تھا۔ مذہبی جنگ نے ان مباحث کے شعلوں کو ہوا دینا شروع کردی تھی اور اس جنگ (زرگری) میں جو اسلحہ مستعمل ہوے وہ یہی زبان اُردو تھی جس پر اس طویل جاری شدہ جنگ میں صیقل کی ضرورت محسوس کی گئی۔ دھار رکھی گئی۔ مصنفین کرام کا اجتماع ہوا۔ زبان کی نامحدود گہرائیوں اور وسائل کا انکشاف ہوا۔ زبان میں ایک جدید روح پھونکی گئی۔ اور اُردو زبان کو اس جنگ

سے لطافت، نزہت، نفاست، اطمینان، سکون اور خود اختیاری ملی۔ اور وہ جملہ ناممکن البیان، غیر معین، نازک وشستہ، تیز اور سحر سامری بھی ملے جو اُسکے ادبی وقار و عزت کو قائم کرنے والے تھے۔ اور جنھوں نے ہر آئینہ اُردو زبان کی رونق وشکوہ، شان وشوکت، جاہ و جلال اور عظمت و کمال میں اضافہ کیا۔ غرض کہ اُس دَور کی وہابی تحریک نے بے شبہہ بہت کچھ ہماری زبان اُردو میں تعمیری عنصر پیدا کیا۔ شاہ عبد القادر کا کلام پاک کا ترجمہ جو ۱۸۰۳ء میں اصلاً مکمل ہوا تھا۔ وہ سید عبد اللہ (مقلد سید احمد) کے جوش مذہبی اور خروش اسلامی کی بدولت ۱۸۲۹ء میں گویا ۲۶ سال بعد نگی میں زیور طباعت سے آراستہ پیراستہ ہوکر منصۂ عام پر آیا۔ سید عبد اللہ سید احمد کے بہت پُرجوش معتقد تھے اُنھوں نے اپنے امام طریقت سید احمد (علیگڈھ کے سر سید نہیں) کی تنبیہ الغافلین کا اُردو ترجمہ بھی کیا اور ۱۸۳۰ء میں اسی مطبع سے شایع کیا۔ حاجی اسمٰعیل نے تقویۃ الایمان نامی رسالہ شایع کیا۔ جس نے سید کے معتقدین میں بڑا جوش و خروش پیدا کر دیا۔ طریقہ محمدی کے معتقدین کی حسب ذیل تصانیف بھی اسی عصر کی ہیں جو ہر آئینہ مقبول ومشہور ہیں۔ ترغیب جہاد۔ ہدایۃ المومنین منفیح الکبائر والبداہ، نصیحۃ المسلمین اور راۃ المسائل۔

لیکن محض وہابی تحریک ہی اس جذبہ کی محرک نہ تھی جس نے زبان کو ترقی کی شاہراہ ...... پر لاکر کھڑا کر دیا۔ بلکہ اُسوقت دوسری قوتیں بھی کارفرما تھیں۔ مثلاً (۱) ہندوستانی زبان کا ۱۸۳۱ء میں فارسی کی جگہ سرکاری حیثیت حاصل کرنا (۲) مغربی تعلیمات کا پرچار اور اُنکی غیر معمولی ہر دلعزیزی اور (۳) ہندوستانی اخبارات و مطابع کا اجرا۔ ان جملہ امور نے اُردو کی ترقی میں مساویانہ حصہ لیا۔ اس دور میں حب الوطنی اور اصلاحات کا جذبہ بہت کافی پیدا ہو چکا تھا۔ اور ہماری ادبیات متقدمین سے متاخرین تک اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اور یہ فرق مستور نہیں ہے بلکہ ایک صاف اور بیّن نغمہ کا فرق ہے جو سالہا سال سے سنائی دے رہا ہے۔ میر تقی، ذوق و غالب —— ابتدائی دَور کو چھوڑ کر —— سب میں یہی نغمہ کارفرما نظر آتا ہے اور یہی واحد روح ہر ہر قدم پر شگفتہ ہوکر نسل انسانی کو مواخات و احساس فرائض کے شاندار اور شریفانہ کردار کی طرف اُبھار رہی ہے۔

لیکن جب شاعرانہ نغمات قدسی کو سکون و عزلت، خلوت اور خاموشی سے الاپ رہا تھا تو پادش بخیر سر سید اعظم اس جنس گراں مایہ کو (عوام کے جذبات پسندیدگی کا عام احساس کرتے ہوئے) بازار میں لائے اور نہایت درجہ جفاکشی، آزاد منشی اور روشن خیالی سے اہل ملک سے برسرپیکار رہے اور خود اعتمادی اور

خودداری سے معترضین کو شکست قبول کرنے پر مجبور کیا ——— لیکن کسی مشکوک صدائے نحیف سے نہیں ——— بلکہ پیغمبرانہ عزم و استقلال سے اس گوہر تابناک کو بازار میں بابانگ دہل پیش کیا۔ اور یہ ثابت کردیا کہ کوئی شخص بغیر اس سلاح کے اس کا مطلقاً مستحق نہیں ہے کہ وہ کسی دنیوی لائحہ عمل میں حصہ لے سکے۔ اُنکو کامرانیاں دوچند ہوئیں۔ اُنھوں نے اُردو نثر نگاری میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ اور اسکے لامتناہی امکانات کے پہلو کو عوام کے روبرو پیش کیا۔ اور اصلاحات اور روشن خیالی کا مطالبہ کیا۔ غالباً اُنکی تعلیمات و معتقدات اس قدر جلد اثر پذیر نہ ہوتے اگر اُنکو الطاف حسین حالی نہ ملتے۔ حالی غالب کے تربیت یافتہ تھے۔ ۴۰ سال کے سن میں سرسید کے پرچم کمال میں پناہ گزیں ہوئے اور یہیں اُنھوں نے اپنی مافوق الفطرت شاعرانہ بلاغت اور موثر خطابت کو اُس غیر معمولی زعیم الملت اور ہم ملک و ہم مذہب و ہم مشرب کے نام نامی پر معنون کردیا۔ ان کا مسدس ایک لافانی تحفہ ہے جو اُنھوں نے قوم کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ اپنے عہد کی زندہ یادگار ہے۔ [Childé Herald کا جواب ایشیا میں مسدس ہی ہو سکتا ہے] صاعقۂ ہوشربا کی طرح وہ خرمنِ قلوب پر گری اور اکناف ہند میں اُس نے اپنی شعلہ نوائی کے طفیل میں آگ لگادی۔ مسدس نے مضمحل، ناتوان، کمزور، اور بیکار دست نبضوں میں حرارت پیدا کردی۔ جوش و خروش اور عمل کا ولولہ پیدا کیا۔ حیات انسانی میں تجدید کی اور جذبہ عمل کی وکالت کی۔ اس سے بھی زیادہ کام یہ کیا کہ یہ پہلا علانیہ اور تیز خراج عقیدت انسانی عظمت و وقار کا تھا جو شاذ و نادر ہی ہمارے ملک میں پیشتر سنایا گیا تھا۔ اور شاید ہی اس سے زیادہ مقبول کوئی اور نظم ہندوستان میں ہو۔

اپنی خود کرتے تھے عزت گر نہ کرتا تھا کوئی
سر ہر اک فرعون کے آگے نہ جھکاتے تھے ہم

اُنھوں نے اپنے اشعار میں خود ایک شاعرانہ معیار (ورڈسورتھ کی طرح!) پیش کیا ہے کہ شاعری وہ ہے "جو سادہ ہو، مبالغہ و کذب سے پاک ہو اور قلوب کو براہ راست متاثر کر سکتی ہو۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ اسکے جذبات میں خلوص ہو"

اس وطنی پُر جوش ادب کا ذکر کرتے ہوئے ہم نذیر احمد کو فراموش نہیں کر سکتے جو بحیثیت نثر نگار کے نایاب خوبی کے مالک ہیں۔ اور فضلاً عبدالحلیم نہ صرف بحیثیت انشاپرداز کے بلکہ بحیثیت محب وطن کے بھی ان کا نام لوگ یاد رکھیں گے۔ اُنکو اپنے وطن سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔ اُنھوں نے بہت غائر نظر

سے اپنے گرد وپیش کے احوال کا مطالعہ کیا اور بہت صفائی سے تمام عیوب کو مضحک تمثیل کے ذریعہ سے آشکارا بھی کر دیا۔ انکی سنجیدہ ہلکی ظرافت کے پردہ میں دانشمندانہ مشورے اور مشفقانہ پند ونصائح ملتے ہیں ـــــ لیکن کیا اس کی امید ہے کہ اُنکے ہم ملک اُنکی نصیحتوں کو قبول کریں گے اور اُس پر عمل پیرا بھی ہونگے

خدا شاہد ہے میرے دل میں گر کچھ بھی شرارت ہو
گر دیکھا نہیں جاتا کہ اپنی قوم غارت ہو

اسی نے میں اُنکی نظم شروع ہوتی ہے۔ جس میں ذکاوت، ظرافت، سنجیدگی، طنز، انکار، نصیحت، تنقید، مشورہ اور ہدایت کی لڑیاں نہایت ہوشیاری، خوش اسلوبی اور دانشمندی سے حسن ولطافت کے سہرے میں پروئی ہوئی ہیں ـــــ آج اسی علمداری میں اقبال (رگل سرسبد متاخرین) عظمت وجلال کا شاندار فلک نما مینار بالکل علٰحدہ جداگانہ حیثیت سے بنائے ہوئے ہیں۔ اُنکی شاعری سرود وطن ہے۔ جس میں ہر جگہ پُر شوق، شعلہ خو، پُر جوش اور وطنی عشق کی لافانی چنگاریاں موجود ہیں۔ جس سے ہمارے قلوب میں گرمی اور جسموں میں سنسنی اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور شنین کی طرح ہم کو بھی یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ "اختتام سے قبل کچھ اور بھی ہونا چاہیے۔ اور کچھ اعلیٰ پیمانہ کا قابل ذکر کام ابھی اور بھی سرانجام دینا ہے"۔ سنیئے

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

نشانِ برگ گل تک بھی نچھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اسکو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد کر پیدا
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اس قدر بعید القیاس کم وقت میں (ایک صدی یا کچھ زیادہ شاید گزری ہے) اللہ اکبر ہم لوگوں نے کس درجہ شاہراہ ترقی پر گام زنی کی ہے۔ ولی؛ اقبال کے سنین میں ہندوستان یادداشت و یادگار سے بھی ماورا ہو گیا ہے۔ زمانہ بدل گیا، ماحول میں تبدیلی ہو گئی، فضا وہ نہ رہی جس کائنات کا (خواب وخیال میں بھی) ولی؛ ودُ مسلکے دیگر مصنفین کو اندیشہ اور وہم بھی نہ ہوا ہوگا وہ آج موجودات کا جزو ہے۔ گزشتہ سے نیاگ (انقطاع) اُس دَور کا مکمل لفظ تھا اور استقلال اور اپنے حسب خواہش زندہ رہنے کا عزم دورِ حاضر کی دنیائے جدید کا سکۂ رائج الوقت تسلیم کیا جائے گا۔ خواجہ میر درد کا دعوٰے

در حقیقت دروگوے اختیارم کردہ اند — اتہام اختیاری نیز بر من کردہ اند[۱]

کی تردید اقبال کرتا ہے کہ

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا — چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

اور یہی روح خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی اور حالی تک سینہ بسینہ پہونچی جو حقیقتاً ہند جدید کے مبلغ اعظم تھے اور یہی روح نہایت درجہ جاہ و جلال سے اقبال کے نامۂ کمال پر روشن ہے۔ قرون اولی کی شاعری شخصی ذاتی اثرات سے مسحور رہتی۔ اور ابعد کی شاعری عالمگیر نغمات سے تعبیر کی جا سکتی ہے جس میں سرود وطن سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ دور حاضر کی شاعری طوفانی و مشکلاتی عصر کی شاعری ہے اور اس شاعری میں وہ جملہ محاسن موجود ہیں جو اس طوفانی شاعری میں ہونا چاہیے۔ اب آپ کو اس شاعری میں عاشق ناشاد اپنے خیالی محبوب کے قدموں پر لوٹتا نظر نہیں آتا۔ نہ تو اس میں گل و بلبل کا افسانہ ہے اور نہ اندوہ و غم کا دردناک ترانہ۔ نہ عاشق گل کے موثر دردناک نغمات کا ذکر ہے اور نہ کنول کے بن کھلے غنچوں اور گلاب کے کھلے ہوے پھولوں کا تذکرہ ہے اور نہ عشاق کی تکلیف دہ دُور از خیال سفر کی مشکلات کا رونا ہے جو اس کو عشق میں کانٹوں اور جھاڑیوں سے گزر کر محبوب کی خواب گاہ تک لے جاتا ہے۔ نہ تو اب شاعری میں فیاضی کے لیے بعید از قیاس مبالغہ کی ضرورت ہے اور نہ کسی ادب پرست قدردان کی مدح وثنا کا بازار گرم نظر آتا ہے بلکہ اب اس قسم کی شاعری کی فضا میں انقلاب ہو گیا ہے۔ آج کی شاعری بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اب شاعری کا رنگ زیادہ تر تند، تیز، تندرست، خوددار اور آزادی کی خوشیوں سے مملو ہو گیا ہے۔ اور یہ روح بے شبہہ حالی اور نذیر احمد کی شاعری میں نظر آتی ہے، اور بہت سختی سے یہی آواز اقبال میں سنائی دیتی ہے۔ خدا کرے یہ روح زیادہ ترقی کرے اور جیسے جیسے دن گزرتے جائیں اس روح کا بول بالا ہو اور یہ اس امر کی پیشگوئی کرتی ہے کہ نہ صرف نثر و نظم میں سنجیدگی سے اس کا اثر پڑے گا بلکہ ہر حیثیت سے یہی شاعری ہر فضا و ماحول میں کارفرما نظر آئیگی۔ جنگ عظیم کے دور کی اردو شاعری پر نظر ڈالیے، اندرونی جذبات کا محاسبہ کیجیے۔ اب شاعری میں وہ خیالات نظم ہونے لگے جن کا اعادہ ۱۰ سال قبل خوفناک تھا اور اب بھی انکی نشر و اشاعت خطرناک ضرور ہے۔

---

[۱] ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا (میر)
شاید ایک چراغ سے سو چراغ جلنا ایسے ہی مواقع پر بولا جاتا ہے۔ — ناظر

اُردو ادب کو ہم بہت آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ تخیلی اور ترجمہ - تخیلی ادبیات میں نظم، نثر، فسانے، ڈرامے آسکتے ہیں - اور ترجمہ میں مشرقی اور مغربی تصانیف کے تراجم آتے ہیں - جنھوں نے ادب اُردو کو مالامال کردیا ہے - جملہ شاعریوں کی طرح اُس عہد کی شاعری میں بہت وسیع میدان ہے جس میں رزمیہ شاعری خطابیہ شاعری، عشقیہ شاعری، نعت، منقبت، مراثی، مدحیہ شاعری اور طنزیات کثرت سے پائے جاتے ہیں - اُس دور کی نثر بھی کافی مالامال اور مسائل سے پُر ہے - اور تخیلات کی دولت اور اظہار جذبات سے مالامال نظر آتی ہے - یہ نقاب اُٹھاتی ہے اور اشیا کی صحیح تصویر کو منکشف کرتی ہے - اور عمرانی سماجی حالت کا سچا منظر ہمارے سامنے آتا ہے اور نہایت واضح، متحرک اور سنسنی پیدا کرنے والی تصاویر پردہ پر چلتی پھرتی نظر آنے لگتی ہیں - یہ شاعری پُرجوش تاریخ سے زیادہ قابل وثوق اور سرکاری یادداشتوں سے زیادہ محفوظ ہے اور اُس کی دستاویزیں زیادہ قابل اعتماد، اسکے رجسٹر داخلی کیفیات کے آئینہ دار اور ہند کے نصف ادا کیے ہوئے جذبات کا صحیح مرقع ہیں - مورخ مستقبل یقیناً اس طرف حقیقت و صداقت کی جستجو میں توجہ منعطف کریگا اور کون ہے جو حالی، نذیر احمد، سرسید احمد خاں یا اُنکے معاصرین کی اُن تصنیفات کو پڑھے گا جو یقیناً ہندوستانی نقطۂ نظر کی مظہر ہیں اور بہ یقین نہ کہے گا کہ یہ لافانی کڑیاں ماضی کو حال سے جوڑے ہوئے ہیں اور آج کے امور تنقیح طلب کل کے ناقص ادھورے امور کی تفتیش میں مصروف ہیں - ہمارے پاس ورثہ بڑا ہے - ہم بغیر کسی امتیاز کے نہایت درجہ بے پروائی، بے غرضی، اور سادہ لوحی سے اپنے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیں گے اگر اپنے حقیقی وارثوں کے اس متبرک ورثہ کو زیادہ زرخیز، زیادہ شاداب اور زیادہ مالامال حیثیت سے نہ سونپیں گے -

---

مولانا سید سلیمان ندوی نے ابھی بہت سخت الزام ہمارے خلاف لگایا ہے اور یقیناً وہ آپ لوگوں کے خیال میں لاجواب بھی ہے - اُنکے خیال میں سوا مخدوم الملک بہاری کی سوانح حیات و تصانیف کے بقیہ گنج شائیگاں کو ہمنے بے اتفاقی و گمنامی سے اُبھرنے نہیں دیا - اور وہ اس الزام کی تائید میں یہ بھی ثابت کہتے ہیں کہ شیخ بارہ جو بہار کے مشاہیر علما میں سے تھے اُن کا تذکرہ چند سطور میں کیا گیا ہے - ایک ممتاز خاندان جو روایات قدیمہ کا حامل تھا وہ نظر انداز ہو گیا اور محض اس واقعہ کی بنا پر کہ ایک دستاویز چند خاندانی افراد کے دستخطوں سے پھلواری کے خزائن مخطوطات میں دستیاب ہو گئی تھی اُس کا بھی تذکرہ کیا گیا - اس امر کی بھی مطلقاً اطلاع نہیں ہے کہ فتاوٰی عالمگیری کے بہاری مددگار کون حضرات تھے اور نہ اسی طرح سلم و مسلم کے مصنفین کا بھی پتہ چلتا ہے - محب اللہ بہاری کا ذکر تو خیر آزاد بلگرامی کی سبحۃ المرجان میں موجود ہے، لیکن

غلام یحییٰ بہاری کا تذکرہ کہیں نظر نہیں آتا - گو فلسفہ میں انکی تصنیف بہت بلند پایہ تھی اور ہماری لاتعداد طلبا کی نسلیں اُن سے مستفید ہو چکی ہیں - آزاد کے تذکرۂ آبِ حیات میں ظہور جان جاناں کے حالات میں تذکرۃً اُن کا بھی ذکر آگیا ہے - اگر سابقین کی نسلوں کو ایسی بے التفاتی سے واسطہ رہا ہے تو دَورِ حاضر کے موجودہ اکابر کو بھی اس سے زیادہ متوقع نہیں رہنا چاہیے ——— یہ تنقید چونکہ ہماری جماعت کے کے ایک عالم و فاضل شخص کی طرف سے ہوئی ہے اس لیے ہر آئینہ قابلِ توجہ ہے -

---

اگر ہم کو دنیا کے سامنے اپنی بے گناہی ثابت کرنا ہے تو ہم کو کیا کرنا چاہیے - ہمیں دنیا ہی کے سامنے نہیں خود اپنے ضمیر (کے مجّی وکالے) سامنے بھی ہم کو اپنی صفائی پیش کرنا ہے - یقیناً دل بہلانے کے لیے یہ کہنا کافی ہے کہ اس دَور میں جامعہ عثمانیہ کا دارالترجمہ اورنگ آباد کی انجمن ترقی اُردو اور اعظم گڑھ کی انجمن دارالمصنفین بہت شاندار حقیقیت سے آپ کے علم و ادب کی بڑی شاندار خدمات انجام دے رہی ہیں - لیکن ہم کو اپنی زبان اور اپنے ادب کی نشو ونما کے لیے اس سے زائد اور وسیع میدانِ عمل کی احتیاج باقی رہتی ہے - کیا ہم بغیر کسی جذبۂ شرم کے یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ہماری ادبیات ناممکن الحصول ہو جائے - یا صرف ممکن الوصول نسخے جو انکی شان کے شایاں نہیں شایع ہو جایا کریں - اور یہ سوچ کر کون شرم نہ کرے گا کہ ہمارے اکابر کی نہ تو شایاں یادگاریں ہیں اور نہ ان کی یادگار سوانحعمریاں ہیں -

---

کوئی مصلحِ غیب زیادہ دلکش زیادہ پُرجوش ہمارے اکابر کی سوانح سے زیادہ نہیں ہے - ہم کو جو الہام غیبی ان تذکروں اور اپنی ادبیات کے ذریعہ سے ملتا ہے اُس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا - اور اس الہام سے ہم کو اس امر پر مجبور کیا جائے گا کہ اس شمعِ ادب کو جسے ہمارے پیشرو پہلے فروزاں کر چکے ہیں ہم زیادہ مضبوطی سے پکڑیں اور متفقہ جد و جہد سے مہمیز لگائیں - سوا اسکے نہ کچھ ہو سکتا ہے اور نہ ہو گا -

---

جب میں گزشتہ ستمبر میں ہماری طلبا کو خطبہ دینے کے لیے یہاں آیا تھا تو میں انکے وطنی جوش و خروش سے بہت متاثر ہوا تھا - یہ بہت تابناک امید افزا اور پُرامید نشانی ہے - انکو رہنمائی کی ضرورت ہے اُنکو آپ اپنا ادب پڑھایئے اور اُس الہام سے ان کا قلب معطر کر دیجیے جو ادبیات سے حاصل ہوتا ہے - انکو اس امر کی تعلیم دیجیے کہ وہ جملہ اشیا سے محبت کرنا سیکھیں - اُنکو فرائضِ منصبی اور ذمہ داری کے حسیات کی تعلیم دیجیے - اُنکو امانت کی بھی تعلیم دیجیے کیونکہ زمانہ آیندہ میں یہی نسل ہماری روایاتِ رفتہ کی بہترین امین ہونے والی ہے - وہ انکی

نصف ہوچکی ہے۔ کیا کوئی وطنی عقیدت یا وطنی عشق کی صاعقۂ ہوش فرا کی صدائے بازگشت کو ضایع کرسکتا ہے؟ اپنی ہستی، اپنی روح اور اپنے قلب کو علم کے کلیسہ کی تکمیل کے لیے وقف کردیجیے جہاں خود آپ کی زبان (اُردو) دیوی کی حیثیت سے صدارت عظمیٰ کے معزز عہدہ پر فائز نظر آئیگی۔

اس ——— کلیسۂ علم اجسکو ہم سب لوگوں نے متحدہ مساعی سے تعمیر کیا ہے۔ کیونکہ ہمارا ادب ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے متحدہ مساعیِ جلیلہ کا خوشگوار انجام کہا جاتا ہے۔ اور تخلیق و مشابہت کی قوتیں جو ہمارے ادب میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں وہ انشاء اللہ زیادہ وسیع وکشادہ زاویہ پائیں گی۔ عام شغل کے تعاقب میں ہم زیادہ مشترک حیثیت سے تگ و دَو کرتے نظر آئیں گے اور یہ ہماری بین الاقوامی زبان ایک حقیقی اور واضح اتحاد کی فضا پیدا کرگی اور وہیں سے شیرینی اور رجنی کا قومی کلیسہ ایک جدید بشری انجیل کی تبلیغ کریگا جو خس و خاشاک کی حدود سے گزرتی ہوئی ہم کو ایک شائق و محبوب معانقہ میں متحد کردیگی!

نوائے ثاقب

(جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی)

اُن کی آرائش سے میرے کام بنجا ئینگے کیا — دل کی گتھی شانہ ہائے زلف سلجھا ئینگے کیا

وصل کے وعدے سے خوش ہوکر نہ مرجائینگے کیا — نامہ بر ہنستا ہوا آتا ہے، خود آئینگے کیا

قیدیِ غم تربتوں میں، اور اُنکو یہ خیال — کاٹنے میں اک شبِ فرقت کے مرجائینگے کیا

کام اپنا کر چکے اہلِ وفا، شک ہے تو ہو — سر نہیں باقی شہیدوں کے قسم کھائینگے کیا

عرضِ مطلب کے لیے دل زباں کھلتی نہیں — کچھ اشارے میں کرونگا وہ سمجھ جائینگے کیا

ہاتھ اُدھر اُٹھتا نہیں ہے تار ادھر باقی نہیں — دینگے وہ کیا اور ہم دامن کو پھیلائینگے کیا

قصۂ فرہاد و مجنوں کیوں سناتے ہو ہمیں — حسب پریشانی سے مطلب ہے تو گھبرائینگے کیا

میہمانِ کوئے جاناں ہوکے دل بیتاب ہے — میں تو سمجھاتا نہیں وہ بھی نہ سمجھائینگے کیا

مست رہتے ہیں ہمیشہ فروشانِ جمال — ہم تو مانگینگے کوئی ساغر وہ فرمائینگے کیا

نکہتِ گل کا خدا حافظ چلے ہم باغ سے — الوداع اے آشیاں اب جاکے پھر آئینگے کیا

دل کی بیماری کا عقدہ کھولنا دشوار ہے
جو نہیں سمجھے وہ ثاقب مجھکو سمجھائینگے کیا

ایک غلط فہمی کا ازالہ

(جناب مولوی عبد الستار خاں صاحب ستار شروانی ناظم انجمن اشاعۃ الدین مدرسہ عربیہ نیازیہ خیرآباد)

جس طرح شعر کہنا، مصرعوں کا موزوں کر لینا اور فن شعر جاننا عروض و قوافی کا سمجھنا دو جدا جدا باتیں ہیں اسی طرح صاحب فن ہونا اور شاعر ہونا الگ الگ دو چیزیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص شعر کہہ لیتا ہو وہ معائب و محاسن شعر سے بھی آگاہ ہو یا قواعد فن عروض بھی جانتا ہو خصوصاً اس ترقی کے زمانے میں جبکہ شاعری الشعر اول الجہل بجائے الشعر آخر العلوم کا مصداق ہو رہی ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد یہ گزارش ہے کہ میرے محترم منشی انعام اللہ خاں صاحب عارف پنشنر سررشتہ دار بند و بست ساکن بہادر گڑھ ضلع میرٹھ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ موصوف حضرت داغ کے خاص تلامذہ سے ہیں حضرت داغ کے بعد آپ نے لسان الملک خیام العصر حضرت ریاض مرحوم سے رجوع کیا اور برابر مشورۂ سخن کرتے رہے۔ جناب نیاز برادر حضرت ریاض سے برادرانہ تعلقات ہیں۔ مدتوں سلسلۂ ملازمت ساتھ رہا ہے۔ لسان الملک حضرت ریاض مرحوم کی ذات سے جو تعلق موصوف کو ہونا چاہیے اسکے بیان کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ استاد کی وفات پر شاگرد نے دل کھول کر ماتم کیا اور "ماتم لسان الملک حضرت ریاض" کے نام سے ایک ڈیڑھ جزو کا رسالہ بھی شائع کیا جس میں اپنے تعلقات اور مرحوم کے حالات اور حسن اصلاح کو دکھلایا ہے۔ شروع سے آخر تک حسن عقیدت جلوہ گر ہے اور غالباً کہیں مبالغہ نہیں پایا جاتا۔ ان تمام محاسن کے باوجود کچھ فرد گزاشتیں بھی موصوف سے ہو گئی ہیں جن میں بعض خاندان ریاض سے متعلق ہیں۔ مجھے اس سے بحث نہیں نہ وہ کوئی ادبی بحث ہے۔ اس کے متعلق مرحوم کے اہل خاندان بہتر سمجھتے ہیں۔

صفحہ ۲۱ پر موصوف نے اپنے ایک شعر کی تقطیع کی ہے جس میں ضمناً حضرت ریاض کا بھی ذکر ہے چونکہ حضرت ریاض سے مجھے بھی وہی نسبت ہے جو عارف صاحب کو۔ اس لیے میں مجبور ہوا کہ استاد محترم کی نسبت جو سوء ظنی اس شعر سے پیدا ہوتی ہے وہ دور ہو جائے۔ اسی ضمن میں شعر مبحوث فیہ کی بحر سے متعلق بھی کچھ تفصیل کروں گا۔ چونکہ یہ ایک ادبی لغزش ہے اس کا اظہار نہ کرنا اور پردۂ کتمان میں رکھنا ادبی جرم ہے اس واسطے مجھے چند سطریں لکھنے کی جرأت ہوئی۔ دوسرے اگر استاد محترم کی ذات کا تعلق نہ ہوتا جب بھی شاید مجھے ادھر متوجہ ہونے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

پہلے میں عارف صاحب کی چند سطریں نقل کرتا ہوں تاکہ ناظرین کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ عارف صاحب صفحہ ۱۲ و ۱۳ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت احسن مارہروی نے جو حضرت داغ کے ارشد تلامذہ سے ہیں اور میری سلسلے میں بجانشینی داغ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں میرے ایک شعر پر مجھے لکھا کہ تقطیع سے گرتا ہے۔ وہ شعر یہ تھا

خسرو و جم سب کیا ہوئے لعل و گہر نے کیا کیا

جاہ و حشم سب کیا ہوئے کثرت زر نے کیا کیا

میں نے حضرت ریاض کو احسن صاحب کی تحریر بھیجکر لکھا کہ جناب اپنی عادت ترک فرماکر مجھے صاف طور پر یہ لکھیں کہ حضرت احسن کا اعتراض صحیح ہے یا کیا۔ حضرت ریاض نے اسکے جواب میں مجھے لکھا

حضور اقدس۔ تسلیم۔ والانامہ پہونچ گیا۔ اتوار کو حاضری کا قصد ہے۔ خدا کرے کوئی سبب مانع نہ ہو۔ احسن صاحب نے خسرو و جم کو ناموزوں کہا۔ خدا جانے کیوں۔

ریاض۔ ۲۳۔ جون ۲۱ء

حضرت ریاض اتوار کو تشریف لائے میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ ہر امر کو ٹال دیتے ہیں۔ میں اس شعر کی تقطیع کرتا ہوں۔ اب جو نقص ہو اُسکو صاف بتا دیجئے اور بتائیے کیا اسی کاغذ پر تحریر فرما دیجئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس پرچہ کی نقل مع حضرت ریاض کی تحریر کے ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

خسرو و جم	سب کیا ہوے	لعل و گہر	نے کیا کیا
فعل و فعولن	فعل و فع	فعل و فعول	فعل و فع
جاہ و حشم	سب کیا ہوے	کثرتِ زر	نے کیا کیا
فعل و فعولن	فعل و فع	فعل و فعول	فعل و فع

حضرت ریاض نے اس پرچہ پر تحریر فرما دیا کہ حضرت احسن نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ رمضان المبارک میں تحریر فرمایا ہے۔ میں اب تک اس کو سمجھا نہیں ہوں۔ ہائے کس وضع کا فرشتہ خصلت بزرگ تھا جسنے یہ کہنا گوارا نہ کیا کہ حضرت احسن سے غلطی ہوئی ہے"

یہاں تک جناب عارف کی عبارت ہے۔ تعجب ہے کہ مدتوں ساتھ رہنے کے باوجود عارف صاحب حضرت ریاض کے مزاج آشنا نہ ہو سکے مجھے زمانۂ تعلیمی ہونے کی وجہ سے بہت کم حضوری کا موقع نصیب ہوا اور صرف تین برس کے عرصہ میں، وہ زمانہ نہیں ہفتہ وار حاضری ہوتی تھی۔ اس پر بھی استاد محترم کی

اکثر عادات سے واقف ہوگیا تھا۔ حضرت ریاضؔ کی یہ عادت تھی کہ جب موصوف کسی بات کا کسی مصلحت سے جواب دینا یا اس کی تشریح کرنا نہ چاہتے تھے تو ایسے الفاظ فرماتے تھے جو دونوں پہلو لیے ہوں۔ اور سائل کی دلشکنی کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی دوسری مجلس میں حضرت ریاضؔ نے شافی جواب دیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ گزشتہ سال سیتاپور ہائی اسکول کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیا رنگِ محفل ہوگیا۔ مصرعۂ طرح تھا۔ میں نے بھی غزل لکھی۔ اُستادِ محترم نے اصلاح فرما کر جب غزل واپس فرمائی تو غزل کے خود ہی ۱۲ اشعار منتخب فرما دیے کیونکہ اتنے ہی اشعار پڑھنے کی مشاعرہ میں اجازت تھی۔ میرا ایک شعر تھا ؎

اُس پری پیکر کے آتے ہی بڑھا جوشِ جنوں — حشر کا میدان دیوانوں کی محفل ہوگیا

یہ شعر مجھے بہت پسند تھا حضرت ریاضؔ نے اسکو انتخاب میں نہیں لیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ شعر مجھے بہت پسند ہے، فرمایا کہ میں نے اپنی پسند کے مطابق منتخب کیے ہیں انھیں کو پڑھنا۔ میں نے دوبارہ اس شعر کے پڑھنے کی اجازت چاہی سکوت فرمایا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ سکوت غالباً دل شکنی کی وجہ سے تھا۔ مجھے پہلے ہی فقرہ سے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ میں نے اپنی پسند کے مطابق منتخب کیے ہیں۔ جب مشاعرہ ہوگیا تو مسکرا کر فرمایا کہ دیوانوں کی محفل نہیں ہوا کرتی۔ اس وقت میری غزل مع اصلاح کے واپس فرمائی۔ چنانچہ مندرجۂ بالا شعر پر چہ پارہ بنا تھا۔ اور یہی وجہ لکھی ہوئی تھی۔

عارفؔ صاحب سے بھی اس موقعہ پر یہی الفاظ فرمائے۔ یعنی حضرت احسنؔ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ رمضان المبارک میں تحریر فرمایا ہے میں اُس کو اب تک سمجھا نہیں ہوں۔ واقعہ بھی یوں ہی تھا کہ رمضان المبارک میں لکھا تھا — اس جملہ سے حضرت ریاضؔ نے وہ فائدہ اُٹھا لیا جو عام طور پر مشہور ہے کہ رمضان میں دماغ صحیح نہیں ہوتا۔ اور یہ ذومعنی فقرہ لکھ کر عارف صاحب کی تشفی کر دی۔ اب رہا یہ جملہ کہ میں اب تک نہیں سمجھا ہوں' اس سے یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ آپ کی تقطیع نہیں سمجھا۔

شعر کے تقطیع میں ہونے یا نہ ہونے سے قطع نظر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عارف صاحب نے یہ اوزان کہاں سے نکالے ہیں۔ اور کس بحر کی تقطیع فرمائی ہے۔ دنیا کا کوئی شاعر ان کو اوزان نہیں کہہ سکتا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ اوزان بھی شعر کے مقابلہ میں صحیح نہیں۔ مثلاً سب کیا ہوئے کا وزن فعل وفع قائم کیا گیا ہے جو سب کیا ہو پر ختم ہو جاتا ہے اور (ئے) بچ رہتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کسی وزن کی چول درست نہیں۔ نیز اگر اصل مادہ (فعل) بھی ہر جزو میں باقی رہتا تاہم غنیمت تھا۔ عارف صاحب کے یہاں تو لفظ فع بھی تقطیع کا جزو ہے۔

اگر اس میں اُستاد محترم حضرت ریاضؔ کا ذکر نہ ہوتا تو میں ہرگز ادھر متوجہ نہ ہوتا۔ معلوم نہیں کہ اس رسالہ ماتم نے میری طرح کتنوں کو نئے ماتم میں مبتلا کر دیا ہوگا۔ اور کتنے حضرات ہونگے جنکو سوءظنی پیدا ہوگئی ہوگی میں اس شعر کی بحر کی طرف توجہ کرنے سے قبل یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضرت احسنؔ نے صحیح فرمایا کہ شعر تقطیع سے گرا ہوا ہے۔ اور حضرت ریاضؔ نے جو کچھ اس کے متعلق فرمایا وہ عارف صاحب کی دلشکنی کی وجہ سے تھا جسکا مرحوم کو عددرجہ پاس تھا۔ مرحوم نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ جب تقطیع کے صحیح اوزان تک عارف صاحب کو معلوم نہیں تو غلط کہہ کے تمام فن عروض سمجھانے سے کیا حاصل۔ اس موقعہ پر میرا بے اختیار دل چاہتا ہے کہ عارف صاحب نے جو الفاظ حضرت ریاضؔ کے متعلق تحریر فرمائے ہیں اُنکا اعادہ کروں۔

"ہائے کس وضع کا فرشتہ خصلت بزرگ تھا جسنے یہ کہنا گوارا نہ کیا کہ جناب عارف کو تقطیع کے صحیح اوزان تک معلوم نہیں۔"

عارف صاحب کے اس شعر کا تعلق بحر رجز سے ہے۔ اس بحر کا اصل عربی وزن مستفعلن مستفعلن مستفعلن چھ بار ہے اور عربی میں اس کی تین تقطیع ہیں۔

۱۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن — رجز مسدس سالم
۲۔ مستفعلن مستفعلن — رجز مجزو صحیح
۳۔ مستفعلن مستفعلن مفعولن — رجز مسدس مقطوع

فارسی شعراء نے اس بحر میں کافی تغیر تبدل کیا۔ دو اجزاء اور بڑھائے زحافات وغیرہ کے بعد نو تفاعیل قائم کیں

۱۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن — رجز مثمن سالم
۲۔ مستفعلن مستفعلن — رجز مجزو صحیح
۳۔ مفتعلن مفتعلن مفتعلن مفتعلن — رجز مثمن مطوی
۴۔ مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن — رجز مثمن مطوی مخبون
۵۔ مفاعلن مفتعلن مفاعلن مفتعلن — رجز مثمن مخبون مطوی
۶۔ مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفعولن — رجز مثمن مطوی مخبون مقطوع
۷۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن — رجز مسدس سالم
۸۔ مفاعلن مفاعلن مفاعلن — رجز مسدس مخبون
۹۔ مفتعلن مفتعلن مفتعلن — رجز مسدس مطوی

اُردو شعراء نے ان میں سے تین تقطیعیں لیں اور کثرت سے اسی میں غزلیں لکھیں۔ ان تین کے علاوہ شاذ و نادر ہی کسی نے اس بحر میں غزل لکھی ہو۔

۱۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن رجز مثمن سالم

۲۔ مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن رجز مثمن مطوی مخبون

۳۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلان رجز مثمن مذال

اس تطویل کے بعد اب میں اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ عارف صاحب کا شعر ہے

خسرو و جم سب کیا ہوے۔ لعل و گہر نے کیا کیا
جاہ و حشم سب کیا ہوے۔ کثرتِ زر نے کیا کیا

اسکے پہلے مصرع کی تقطیع یوں ہوگی خسرو و جم سب کیا ہوے لعل و گہر نے کیا کیا

مفتعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن
مفتعلن

دونوں صورتوں میں بحر رجز کی تفاعیل مقررہ سے یہ کوئی تقطیع نہیں۔

اب دوسرے مصرع کو لیجیے: جاہ و حشم سب کیا ہوے کثرتِ زر نے کیا کیا

مستفعلن مستفعلن مفتعلن مستفعلن
مفتعلن

اس میں بھی دونوں صورتوں میں کسی مقررہ تقطیع کے تحت مصرع نہیں آتا۔ اور اس بحر کا آج تک کوئی قائل نہیں ہوا۔ لہذا دونوں مصرعے تقطیع سے گرتے ہیں۔ اِس مصرع اولیٰ میں ایک تاویل ہوسکتی ہے کہ خسرَو و جم کے بجائے خسرَو وَجم پڑھا جائے۔ پھر سوال یہ ہے کہ دوسرا مصرع کس طرح

مفتعلن مستفعلن

موزوں کیا جائے۔ دوسرے اس تاویل میں غریب اُردو کی مٹی خراب ہو جائے گی۔ ہم اُردو کُشی پر بھی صبر کرنے کو تیار ہو جاتے اگر عارف صاحب نے صحیح اوزان تقطیع ہی لکھ دیے ہوتے۔ عارف صاحب نے تقطیع کرنے میں جو جدت کی ہے اُس کی داد اہل فن اور عروض داں حضرات ہی دے سکتے ہیں۔

میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا وہ صداقت و خلوص پر مبنی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے محترم جناب عارف صاحب میری اس گستاخی کو معاف فرمائیں گے اور میرے ہمخیال ہو کر لسان الملک اُستاد محترم حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم کے دامن سے اس بدنما دھبّہ کو تردید کرکے دُور فرمائیں گے۔

سلام

از غیر مطبوعہ کلام حضرت امیر مینائی مرحوم

اے سلامی گر نہیں شیدائے سرور چاندنی ‏ پھر یہ کس کو ڈھونڈھتی پھرتی ہے گھر گھر چاندنی

پرتوِ رخسار و گردن سے دمِ قتلِ حسینؓ ‏ دھوپ تھی بالائے خنجر زیرِ خنجر چاندنی

چاند زہراؑ کا چھپا ہے آج کی شب زیرِ خاک ‏ خاک بر سر پھرتا ہاں ہے کمتر چاندنی

قبر پہ چادر شہیدِ کربلا کی دیکھ کر ‏ آسماں سے گر پڑی بیتاب ہو کر چاندنی

فاطمہؓ کی بیٹیاں بیٹھی تھیں فرشِ خاک پر ‏ شرم سے جاتی نہ تھی زنداں کے اندر چاندنی

بانو چلاتی تھیں ہے ہے چاند میرا کیا ہوا ‏ جب نظر آتی تھی بعدِ قتلِ اکبرؑ چاندنی

دھوپ میں جلتی تھی دن بھر نعشِ عریانِ حسینؓ ‏ رات کو آ کر اُڑھا جاتی تھی چادر چاندنی

رہروانِ روضۂ شاہِ شہید ان کے لیے ‏ فرش کرتا ہے قمر اک اک قدم پر چاندنی

بنگلے گھر کی لونڈیوں کے واسطے ہر رات کو ‏ بچھتی تھی چادر پہ چادر چاندنی پر چاندنی

ق

وائے قسمت بیبیاں اُن کی جب آئیں شام میں ‏ تانے کو بھی نہ تھی اُن کو میسر چاندنی

بانو کہتی تھیں سیہ خانے سے میرے ڈر گئی ‏ جاتی ہے زنداں سے جو باہر ہی باہر چاندنی

دھوپ میں دن بھر رہی آہ بنی ہاشم کی لاش ‏ لوٹتی ہے خاک پر اس غم سے شب بھر چاندنی

جلوہ فرما تھے وہاں برجِ شرف کے آفتاب ‏ دخل پاتی شام کے زنداں میں کیونکر چاندنی

روضۂ شہ تک جو ہوتا ماہِ تاباں کا گزر ‏ چاندنی کا پھول بن جاتی سمٹ کر چاندنی

کس مہِ برجِ امامت کی شہادت ہے امیرؔ ‏ بجھ گئی مثلِ صفِ ماتم جو گھر گھر چاندنی

عیاں ہیں سالِ وفات اس سے پنجتن کے امیرؔ ‏ شرف عجیب یہ حاصل ہے یاسمن کے لیے

تاریخ وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و جناب فاطمہ زہرا علیہا التحیۃ والثنا ۱۱ھ کہ از "یا" پیدا می شود و تاریخ وفات جناب امیر علیہ السلام ۴۰ھ کہ از "م" پیدا می شود و تاریخ وفات جناب امام حسن علیہ السلام ۵۰ھ کہ از "ن" پیدا می شود و تاریخ وفات حضرت امام حسین علیہ السلام ۶۱ھ از "س" پیدا می شود، پس در لفظ یاسمن تاریخہائے وفات پنجتن پاک بر می آید۔

مرسلہ اسمٰعیل احمد مینائی تسنیم

قطعۂ تاریخ وفات لسان الملک خیام العصر حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم و مغفور

(جناب منشی خلیل احمد صاحب شمیم خلف حضرت وسیم خیرآبادی)

ہزار حیف! کہ بزمِ سخن میں آج نہیں — تھی جن کی شعلہ بیانی چراغِ بزمِ ادب
جو موجِ بادۂ کوثر تھا آپ کا ہر شعر — تو ہر غزل کوئی مینائے سرور و طرب
اگر تھی ابرِ گہربار ہر تراوشِ فکر — تو پھول لاکھوں کھلاتی تھی ایک جنبشِ لب
ہر ایک حرف میں پنہاں عجب نکات و رموز — ہر ایک لفظ سے پیدا ہزارہا مطلب
عجیب طرز کی حاصل قبولِ خاطرِ عام — عجیب حسن سے محبوب اہلِ علم و ادب
قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد ست — سمجھ میں آئے حقیقت میں اسکے معنی اب
اُدھر یہ رنگ گزشتہ کہ ذرہ وہ بنے خورشید — اِدھر یہ چرخِ مذاقِ جدید کے کوکب
اُدھر تو مجلسِ صوفی میں انکے ذکر سے وجد — اِدھر کلام پہ انکے نثار اہلِ کلب
جو اُن کی شوخ طبیعت پہ اہلِ دیر کو ناز — تو قائل ان کی متانت کے خانقاہ میں سب
جو قدردان ہر اک یونیورسٹی ان کی — تو لیتے جامعہ سے نام ان کا تا مکتب
جناب شیخ اُدھر تھے جو محوِ مدحتِ [illegible] — تو صرفِ مدح اِدھر رندِ میگسار کے لب
وہ زیرِ لب سہی۔ دشمن بھی تھا ستائش گر — وہ تھا برا سہی۔ حاسد بھی ان کو جب تب
پُر انکے ذکر سے ہر خاص و عام کی محفل — کہ ابتدا ہی سے اُنکا تھا صلحِ کل مشرب[1]
اُدھر یہ رندوں میں شامل باین سپیدی ریش — اِدھر نصیب انھیں اللہ والوں کا منصب

حضرت ریاض:
بے ریاض آپ کبھی پیتے نہیں با ایں ریش سپید — ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاروں میں
دیکھ کر ہنستے ہو کیا تم صورتِ پاکِ ریاض — یہ بڑے پہنچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

متانت ایسی کہ سو شوخیاں فدا جس پر — وہ شوخیاں کہ عیاں جن سے شانِ حسنِ ادب
درست ہے۔ انھیں سحبانِ ہند اگر کہیے — کہ پہونچی ہے سخن تا مشاہرِ عمانِ عرب[2]
تھی ان کی ہستی معروف مستحق اس کی — بہت بجا تھا اگر تھا "لسان ملک" لقب
ہم ان کی ذات کو خیامِ عصر کیوں نہ کہیں — جدا تھا اہلِ زمانہ سے ان کا ذوقِ طلب
ہزار رنگ سے ہوتے تھے اُسکے جلوے عیاں — جب انکی محفلِ رنگیں میں آتی بنتِ عنب

[illegible]

بیاضِ ساقیِ کوثر سے ڈھونڈھ کر نسخہ ۔۔۔ وہ اس کی شکل بدل دیتے تھے بحسنِ عجب

نسخہ بیاضِ ساقیِ کوثر سے مل گیا (رباعی) گھر بیٹھے اب تو بادۂ کوثر بنائیں گے

کبھی تو بزم میں لاتے اسے نقاب برو ۔۔۔ کبھی سکھاتے اسے بے حجابیوں کے ڈھب

ملتی جلتی اک شے تھی آبِ زمزم سے بہت (//) ہم چھپا کر پیتے اہلِ حرم کے واسطے

کبھی بناتے اسے جلوہ دارِ دامنِ طور ۔۔۔ کبھی اسی میں تھی پیدا ضیائے حضرتِ رب

یہ جتنے پینے والے ہیں ریاض ان سب کے مرشد ہیں (//) ہمیشہ جام سے ہیں نورِ حق کا دیکھنے والے

کبھی تھی نورِ خدا سے اسی کی ذات مراد ۔۔۔ کبھی تھا گلشنِ جنت سے میکدہ مطلب

مے نورِ خدا ہوتی دل عرشِ خدا ہوتا ۔۔۔ تھوڑی سی جو پی لیتے کیا جانیے کیا ہوتا ۔۔۔ (حضرت ریاض) ۔۔۔ کبھی ممکن نہیں میخانہ کا ویراں ہوتا ۔۔۔ کبھی ممکن نہیں جنت کا بیاباں ہوتا

کبھی تھا پیرِ مغاں اِن کا ساقیِ کوثر ۔۔۔ کبھی برستی تھی بن کر یہ ابرِ رحمتِ رب

کبھی اسی کا تھا ہر جرعہ دانۂ تسبیح ۔۔۔ کہ چھوٹے دیر و حرم سے نہ رشتۂ مطلب

جرعے دانۂ سبحہ ہیں سب بھر شمار (//) کعبہ ہو میخانہ ہو ہم کام سے غافل نہیں

کہیں تو نور کے سانچے میں ڈھالتے اسکو ۔۔۔ کہیں بناتے اسے موجِ بحرِ رحمتِ رب

ساقی ہمارے سامنے رکھدے تو بھر کے جام (//) لاؤ دخترِ رز کو نور کے سانچے میں ڈھال کے

کبھی تو تھی یہ فقط اک میکدے والی ۔۔۔ کبھی تھا بادۂ تسنیم بھی اسی کا لقب

چھوٹ جو خانہ ساز خدا ساز مل گئی (//) کوثر کی دی مجھے مرے پروردگار نے

کہیں وہ چیز اک دیکھیں تو روح کانپ اٹھے ۔۔۔ کہیں وہ جام اک پی لیں تو آئیں وجد میں سب

نکلی حرام - پی تھی سمجھ کر لطیف شے (//) کیا بدمزہ کیا ہے مئے خوشگوار نے

کہیں مراد ہی بندۂ پاک طینت کی ۔۔۔ کہیں بزرگ تہجد گزار کی یہ طلب

دشمن کے نصف شب کو درِ میکدہ کھلا (//) مانگی ہے اک بزرگِ تہجد گزار نے

کہیں وہ جوہر اعلیٰ پیے جو پیرِ کہن ۔۔۔ تو اک گھونٹ میں حاصل ہو اسکو لذتِ شب

کیا چھلکتا ہوا وہ جام شراب آتا ہے (//) اسے میں قربان مرا عہد شباب آتا ہے

کہیں اسی میں نمایاں وہ بامزہ تلخی ۔۔۔ کہ یاد آئے کریں نوش جام کوثر جب

ارے ساقی ذرا میری شرابِ تلخ تو لانا (//) مئے کوثر تو بالکل انگبیں معلوم ہوتی ہے

کہیں اسی میں وہ شیرینیاں اگر چکھ لے ۔۔۔ تو اک ذرا ہی میں بندھ جائیں ہرن کے لب

کہیں یہی تھی کسی کے شباب کی تصویر

[چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی] حضرت ریاض

کہیں چھلکتے ہوئے جام تخت پریوں کے

[تخت پریوں کے بنیں آج چھلکتے ہوئے جام
لاؤ مینا ہی ویرانہ پریخانہ بنے] (//)

جو خشت خم کہیں بنتی جبیں فرشتے کی

تہ خم ہم کو کعبے کی زمیں معلوم ہوتی ہے

کبھی تھا جامۂ رندی میں ذکر و شغل نہاں

(//) ایک حالت رات دن توبہ بلب ساغر بکف

کبھی تھے ساتھ تواضع کے رند قانع یہ

(//) رند قانع متوکل ہے خدا دیتا ہے

کہیں انھیں ید طولیٰ تھا مے چرانے میں

(//) مے چرانے میں ہمیں ہے ید طولیٰ کیا کیا

کہیں انھیں کا تھا عمامہ رہن بادۂ ناب

[بک گیا عمامہ ہو کر رہن مے
بوجھ اترا سر سے جھگڑا تو چکا]

وہ ان کی وضع وہ دشنام میفروش کا ذکر

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش

کہیں تھی شوخی رنگ خضاب شیخ کی فکر

[ہلکی ہے ریش پر تری نکہت خضاب کی
کیا شیخ کوئی ڈالدے کلی شراب کی؟]

حرم کے گوشے میں ان کا وہ زمزمی رکھنا

(//) بھر کر حرم کے گوشے میں رکھدی تھی زمزمی

جب ایسی سحر بیانی جہاں سے ہو معدوم

کہیں یہی ہیں تو یہ سکون دل کا سبب

[بس تو یہ عالم ہے مرے ساقی ترے میکدے
ٹھہر جاتا ہے دل گردش میں جب پیمانہ آتا ہے]

کہیں تھی خنجر خوں ریز موج آب طرب

[نشے کے پینک میں جانا تھا کہیں پینے کو
موج مے تیغ بنی مل گئی میخواروں میں]

تو زیر خم نظر آتی زمیں کعبۂ رب

کہ خشت خم فرشتہ کی جبیں معلوم ہوتی ہے

ادھر تو جام بکف اور ادھر تھے توبہ بلب

بادہ کش ہوں میں کوئی ذاکر نہیں شاغل نہیں

پییں خود اور پلائیں خوشی سے پائیں جب

جب وہ پاتا ہے تو پیتا ہے پلا دیتا ہے

اڑا کے لائیں اچھوتا سبو بحسن عجب

ہم اڑا لائے سبو آج اچھوتا کیسا

کہیں یہ مفت کی پینے کو جانتے انسب

[نشہ بھی دیرپا ہے تو لذت بھی ہے سوا
وہ نقد میں کہاں جو مزا ہے ادھار میں] (//)

وہ سن کے پی گئے ان کا یہ مفلسی میں ڈھب

ہم سن کے پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

کہیں تھا پینے میں مانع جناب ہی کا ادب

(//) [ادب سے پی نہیں سکتا ہوں بے اجازت شیخ
ذرا یہ سر جو ہلا دے ابھی سبو آئے]

جناب شیخ کا پینا چھپا کے وہ دم شب

(//) پی لی چھپا کے زاہد شب زندہ دار نے

تو گوشہ گوشہ بنے کیوں نہ بزم شور و شغب

ابھی نہ محو ہوا تھا غم فراق نسیم گری ہے جانِ سخن پر یہ اور برقِ غضب

ہجومِ غم میں جو پوچھا کسی نے سالِ وفات

کہا شمیم نے - اُجڑا ریاضِ فنِ ادب

۱۳۵۳ھ

درسِ عبرت

(از جناب مولوی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی اے ایل ایل بی - وکیل)

جس وقت نعش میری غسال دھو رہے تھے
یہ حال تھا فلک پر تارے بھی رو رہے تھے

رِستا تھا آسماں کا ہمیانۂ طلائی
گردوں کے میکدے میں ماتم سے ہو رہے تھے

مہتاب کی شعاعیں دُھندلی سی ہوگئی تھیں
جلوے بھی آنسوؤں میں تنویر کھو رہے تھے

چرخِ بریں پہ بادل آنسو بہا رہا تھا
سیارے کہکشاں میں موتی پرو رہے تھے

از خلد تا بہ سدرہ سیلابِ غم کی شدت
رضواں تو کیا فرشتے بے کیف ہو رہے تھے

جنت میں حور و غلماں مصروفِ آہ و زاری
قدسی بھی اپنے اپنے دامن بھگو رہے تھے

قوسِ قزح وفورِ گریہ سے تھی کبودی
نظارہ ہائے رنگیں رنگت کو کھو رہے تھے

طائر پروں سے اپنا سر دُھن رہے تھے پیہم
تخمِ سرشک صحنِ گلشن میں بو رہے تھے

بے کل تھیں ماہیانِ آبی وفورِ غم سے
پانی میں اپنی عزت موتی ڈبو رہے تھے

جنگل کے وحشیوں میں برپا تھا شور و شیون
رو رو کے جان اپنی آہو بھی کھو رہے تھے

اوراق منتشر تھے ہر سو چمن میں گل کے
نظارہ ہائے قدرت برباد ہو رہے تھے

اشجار پہ خموشی سبزہ نڈھال غم سے
بہنے کی تھی نہ خواہش بہنے کو گو رہے تھے

نہروں میں نالیوں میں کہساروں میں چمن میں
ہر جا نقوشِ فطرت اس غم میں رو رہے تھے

لیکن مرے اعزا دورانِ زندگی میں
ہمدرد و ہمنوا و ہمراز جو رہے تھے

اُن کا یہ حال سُن لو عبرت کا اک سبق ہے
آرام سے گھروں میں بستر پہ سو رہے تھے

نظرے خوش گزرے

اپریل نمبر کے صفحات ۲۸۶ - ۲۸۸ پر جناب حکیم آشفتہ صاحب کے مرثیہ کے جو بند شایع ہوئے تھے اُن میں کتابت کی بعض فاحش غلطیاں رہ گئیں - حکیم صاحب معاف فرمائیں اور ناظرین اپنے اپنے پرچوں میں مقاماتِ ذیل درست فرمالیں :-

پہلا بند یوں ہے :- پہچان لے کہ دھوپ سے تو سنولا گیا ہے رُخ ✻ وہ پیاس ہے کہ پیاس سے سنولا گیا ہے رُخ
نواں " " :- زخمی جو شیر ہے تو زمیں تھرتھراتی ہے ✻ اُڑتا ہے خوں ہوا میں جدھر تیغ جاتی ہے
چودھواں " :- یہ بھیڑ کچھ تو چھانٹ دوں اکبر کے واسطے ✻ فوجیں کچھ اور کاٹ دوں سرور کے واسطے

پنجاب کے نامور شاعر اور ڈراما نویس آغا حشر کشمیری نے چندروز کی علالت کے بعد لاہور میں انتقال کیا - انا للہ وانا الیہ راجعون - مرحوم کو ادب کے جس شعبہ سے شغف تھا اُس میں اُردو کے کسی ادیب وشاعر کو شہرت وقبولیت عامہ کے لحاظ سے غالباً اُنکی ہمسری نصیب نہیں ہوئی اس لیے ایک امامِ فن کی وفات پر بزمِ اُردو میں بجا طور پر عام سوگواری کا اظہار ہو رہا ہے - جو لوگ تھیٹر اور سینما سے ذوق نہ رکھتے ہوں یا اُن میں شرکت کو معصیت جانتے ہوں وہ مرحوم کے کمالاتِ فن کی کیا داد دے سکتے ہیں - البتہ اُنکی یہ وضعداری کبھی فراموش نہیں ہو سکتی کہ اختلافِ مذاق کے باوجود وہ جب کبھی لکھنؤ تشریف لاتے تو دفترِ الناظر کو ضرور سرفراز فرماتے - اور ہمیشہ اپنی عنایت ومحبت کا گہرا نقش دل پر چھوڑ جاتے - ادب اور تاریخ کی عمدہ کتابوں کا بہت ذوق تھا - اکثر فرمایش کرتے رہتے اور جب آتے تو کچھ کتابیں اپنے ہمراہ لیجاتے - مجلسی امور میں عملی حصہ نہیں لیتے تھے مگر ملکی اور اسلامی سیاسیات سے پوری دلچسپی رکھتے تھے - اور بیشتر انھیں مباحث پر تبادلۂ خیالات ہوا کرتا تھا - ایک بڑی خوبی اُن میں یہ تھی کہ اثنائے گفتگو میں کبھی شائبۂ تفاخر نہیں ظاہر ہوتا تھا اور معاصر شعرا وادبا کا ذکر بڑی عزت ومحبت سے کیا کرتے تھے - اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کریں -

---

ایسٹر کی تعطیلات میں مسلم لیگ کا جلسہ تو نہیں ہوا - البتہ علیگڈھ کے ایک قومی دنگل کے بدولت اخباری دنیا میں اچھی خاصی چہل پہل رہی - ۱۹ - و ۲۰ ، اپریل کو مسلم یونیورسٹی کورٹ کا جلسہ بعض ممتاز عہدہ داروں کے

انتخاب دیگر کی غرض سے منعقد ہونیوالا تھا - ایک سابقہ جلسہ میں کہا جاتا ہے کہ سر فضل حسین کی تحریک یا
حکومت کے اشارہ سے گیارہ "سر" دور دراز مقامات سے آکر جمع ہو گئے تھے کہ پرو وائس چانسلر کا عہدہ
توڑ دینے کی تجویز کو کامیاب نہ ہونے دیں - بعض راویوں نے یہاں تک بیان کیا کہ وائسرائے کا ذاتی
ہوائی جہاز ان میں سے ایک "سر" کو علی گڑھ تک اڑا لیگیا تھا - مگر کسی سبب سے اکثریت اسی فریق
کی رہی جو اس عہدہ کو توڑنا چاہتی تھی - اس لیے سروں کی یہ جماعت اپنے منصوبہ میں کامیاب ہوئی
اسی بار علاوہ دیگر عہدہ داروں کے وائس چانسلر کے انتخاب کا مرحلہ بھی درپیش تھا - وہ فریق جو پرو وائس چانسلر کا عہدہ توڑ کر صرف
وائس چانسلر کو ذمہ دار اور حاکم اعلیٰ بنانا چاہتا تھا اس عہدہ کے لیے قائم مقام وائس چانسلر نواب اسمٰعیل خاں صاحب کو موزوں سمجھتا تھا اور
جو لوگوں کو اندرونی حالات کی خبر تھی وہ سمجھتے تھے کہ کسی ایسے شخص کے امیدوار نہ ہونے کی صورت میں جو نواب صاحب سے
زیادہ با اثر ہو، انکے انتخاب میں کوئی دشواری نہ ہوگی - کہ یکایک ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب اس شان
سے نمودار ہوئے کہ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے اکثر ارکان انکے منتخب کیے جانے کے محرک تھے - نواب صاحب
کے حامیوں نے حتی المقدور بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر اتنے ووٹ بھی حاصل نہ کرسکے جتنے ڈاکٹر صاحب
کے محرکین ابتدائی تھے اور بالآخر ڈاکٹر صاحب وائس چانسلر منتخب ہو گئے -

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب بحیثیت ماہر فن تعلیم ہندوستان میں اپنی نظیر آپ ہیں اس لیے مسلم یونیورسٹی
کیا معنی ہندوستان بھر کی جس یونیورسٹی کے وائس چانسلر منتخب کیے جاتے انکے لیے ان کا وجود گرامی باعث
فخر ہوتا - اور اس لحاظ سے نواب اسمٰعیل خاں صاحب کو انکے مقابلہ میں کوئی ترجیح نہیں ہو سکتی تھی - مگر
بدقسمتی سے ڈاکٹر صاحب کی سابقہ روایات ایسی مہیب تھیں کہ ابھی چند ہی سال قبل رحمت اللہ کمیٹی نے
انکے ان تمام کمالات کے باوجود مسلم یونیورسٹی سے انکا تعلق قائم رہنا یونیورسٹی کے مفاد کے لیے مضر تجویز کیا
اور ان کو پرو وائس چانسلری کے عہدہ سے دست بردار ہونا پڑا تھا - مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے
ڈاکٹر صاحب کی بے ضابطگیوں کے خلاف جو پمفلٹ شایع کیا تھا اس کے ضروری اجزا اسی زمانہ میں
درج الناظر کیے گئے تھے - سنا جاتا ہے کہ رحمت اللہ کمیٹی کے روبرو جو شہادتیں گزریں ان میں اس
پمفلٹ سے بھی زیادہ سنگین قسم کے الزامات عاید کیے گئے تھے - واللہ اعلم - کمیٹی کی رپورٹ بصیغہ راز
رہی - اس لیے سنی سنائی باتوں کا کیا اعتبار - البتہ یہ واقعہ سب کے علم میں آیا کہ اسکے بعد ہی ڈاکٹر صاحب
یونیورسٹی سے تشریف لے گئے -

دنیا میں ایسے حادثات پہلے بھی پیش آئے ہیں - عہدوں کا عزل و نصب کوئی نئی چیز نہیں اور جس
قسم کے جمہوری نظامات اس ملک میں رایج کیے گئے ہیں انکا تو لازمی نتیجہ یہی ہے - ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب

کا تقرر غلط ہوا ہو مگر بقول مہاتما گاندھی کے جمہور کو غلطی کرنے کا حق ہے اور اُن کو غلطیاں کرنے دو۔ اگر ڈاکٹر صاحب نے گزشتہ سے سبق حاصل کیا ہے اور اب اُس روش کی پابندی نہ کریں گے جس کے لیے وہ سابق میں بدنام تھے تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔

جہاں تک حکومت، والیانِ ملک اور حکومت کے سَروں کی اعانت حاصل کرنے یا علیگڑھ کے تعلیم یافتگان کو ملازمتیں دلانے کا سوال ہے بے شبہ ڈاکٹر صاحب کو نواب صاحب کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہونا چاہیے اور چونکہ یہی دو امور مسلم یونیورسٹی کے مہمات میں داخل ہیں اس لیے کم سے کم ہمیں کچھ زیادہ چون وچرا کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

باقی رہے حسیاتِ قومی، مفادِ عامہ اور اصول وآئین وغیرہ تو یہ وہ دقیانوسی باتیں ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اکثر و بیشتر افراد ہر لمحہ اُن کی پامالی کے لیے تیار رہتے ہیں۔ نواب صاحب کے ہواخواہوں میں بھی چند ہی افراد ایسے نکلیں گے جن کو سنجیدگی کے ساتھ ان چیزوں سے دلچسپی ہو۔ صرف پرچار کی غرض سے کچھ الفاظ زبان وقلم پر آجاتے ہیں جن کے معانی ومطالب اور نتائج وعواقب پر نظر رکھنا کسی کے نزدیک بھی خردمندی نہیں۔ ساتھ ہی اسکے اُن اصحاب کو جو نواب صاحب کے حامی تھے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے حامیوں کی جماعت میں بہت سے اصحاب ایسے ہیں جو مسلم یونیورسٹی کے معاملات سے ایسی گہری وابستگی نہیں رکھتے کہ آئے دن اُن کی سرگرمی ومستعدی کا اظہار ہوتا رہے۔ کچھ دنوں بعد جب یہ حضرات محوِ خوابِ غفلت ہوجائیں تو پھر نتیجہ آزمائی کیجا سکتی اور یونیورسٹی کے نظم ونسق پر قابو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مسلم لیگ کا جلسہ ملتوی کرکے مسلمان سیاسیین نے ایک بار پھر اپنے تدبر وفرض شناسی کا ثبوت پیش کیا۔ جس جماعت کے حقوق کی حفاظت کے لیے لندن کے ملاءِ اعلیٰ میں مسٹر میکڈانلڈ اور سر سیموئیل ہور مامور ہوں اُسکو ناحق کی دردسری مول لینے کی کیا حاجت ہے۔ ایک مقامی روزانہ اخبار نے نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ شکوہ کیا ہے کہ مسلم لیگ کا جلسہ محض مسٹر جناح کے اشارے پر کیوں ملتوی کردیا گیا۔ اگر معاصر عزیز نے تجاہلِ عارفانہ سے کام نہیں لیا ہے تو ہندوستان کے تابناک آفتاب کی روشنی میں یہ امر اچھی طرح واضح ہوجانا چاہیے کہ عہدِ حاضرہ میں مسلمانوں کی سیاست کا مرکزی نقطہ شخصیت پرستی ہے۔ مسلم لیگ ہو یا جمعیۃ خلافت یا مسلم کانفرنس سب کی بے عملی و بیچارگی کا یہی راز ہے۔

تعارف

تعلیمی ہند۔ حجم ۹۶ صفحے۔ پیانہ شل بانگ درا۔ قیمت ۱۲ار ملنے کا پتہ:۔ ناظم صاحب مجلس قاسم المعارف۔ دیو بند ضلع سہارن پور۔

اراکین مجلس قاسم المعارف دیو بند نے یہ رسالہ اُن یادداشتوں سے مرتب کیا ہے جو حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، جانشین حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی محنت وجانفشانی سے جمع کی ہیں۔ اور جن کے مطالعہ سے ہر شخص کو آسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ اہل ہند کی تعلیمی حالت عہد سابق کے مقابلہ میں یا اس عہد کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں کتنی پست ہے۔ حضرت مولانا اگرچہ انگریزی سے واقف نہیں مگر اعداد وشمار سے خاص ذوق رکھتے ہیں۔ اُنکی فراہمی میں اہتمام بلیغ فرماتے اور پھر اُنکو نہایت خوبی کے ساتھ اپنی تقریروں میں بیان فرماتے ہیں۔ اور ہمیں اس بات کا دلی ندامت سے اعتراف ہے کہ جو کام ہم انگریزی دانوں کے کرنے کا تھا اُسے مولانا نے اپنی علو ہمت سے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

تعلیمی ہند میں کیا ہے؟ اس کا اندازہ حسب ذیل عنوانات سے ہو سکتا ہے:۔ موجودہ حکومت سے پہلے ہندوستان کی تعلیمی حالت۔ ہندوستانیوں کی تعلیم سے دلچسپی۔ تعلیم میں روڑے اٹکانے کا اقرار۔ حکومت نے ہندوستانیوں کو کیوں جاہل رکھا۔ تاریخ تعلیم۔ تعلیمات سے حکومت کی عدم توجہی۔ تعلیمی حالت صوبہ وار۔ مختلف صوبوں میں بالغوں کی تعلیم۔ پست اقوام کی تعلیمی حالت۔ ہندوستان کی تعلیمی حالت عمومی۔ ہندوستان کا مقابلہ ممالک غیر سے۔ تعلیمی حالت قوم وار۔ ہندوستان کی تعلیم گاہیں اور معلمین۔ ابتدائی تعلیم۔ تعلیم پر خرچ اور اُس کی تفصیلات۔ کالے گورے کا تعلیمی امتیاز۔ تعلیم یافتوں کی بیکاری۔ اخبارات ورسائل۔ مسلمانوں کی تعلیمی پستی۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے پیشے۔ ہندوستان میں تعلیم کے رواج سے انگریزوں کا مقصد۔

ہر عنوان کے تحت میں حسب ضرورت اعداد وشمار دیے گئے ہیں جن کی خاموش شہادت اس عہد میں سب سے زیادہ وزن رکھتی اور کسی کم تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ میں بے چون وچرا تسلیم کرلی جاتی ہے۔

مولانا نے کمال دیانت سے جا بجا اپنے مآخذ کے حوالے بھی دیدیے ہیں اور یہ کچھ کم قابل قدر نہیں کہ اکثر وبیشتر خود انگریزوں کی کتابوں سے یا سرکاری رپورٹوں سے استناد کیا ہے۔

کتاب کی لکھائی چھپائی صاف اور روشن ہے، البتہ فہرست مضامین نظر انداز ہوگئی جسے مرتب کی مولویت کے لیے سند تصور کرنا چاہیے۔

مجاہدین مراکش (باتصویر) جنگ ہسپانیہ و ریف کے
اصلی اسباب، سرزمین مراکش پر یورپین سیاست کے
داؤں پیچ مع اصلی تصاویر میدان جنگ، نقشہ جات
مراکش و ریف اور غازی عبدالکریم اور مجلس انتظامیہ جمہوریہ
ریف کے مکاتیب کے۔ از ملک عبدالقیوم بیرسٹر ۱۲ر

تذکرہ کاملان رامپور۔ مولانا حافظ احمد علی خاں شوق
رامپوری نے اس ضخیم تذکرہ میں اُن تمام باکمالوں کے
حالات بڑی جستجو و تلاش سے لکھے ہیں جو رامپور میں پیدا
ہوئے یا وہاں مقیم رہے۔ علما، مشائخ، ادبا و شعراء،
اطبا و خطاط، غرضکہ ہر قسم کے ماہرین فن کا یہ قابل دید
مرقع ہے۔ آخر میں مصنف نے اپنے خاندان کے حالات
درج کیے ہیں جسکے ضمن میں علی برادران کے خاندانی
حالات بھی آگئے ہیں۔ حجم ۵۰۸ صفحے۔ قیمت ے ر

تذکرہ مشاہیر کاکوری۔ اودھ کے مشہور مردم خیز
قصبہ کاکوری کے دو سو پچاس ارباب فضل و کمال کا
تذکرہ۔ جس میں عالم و فاضل، مشائخ و درویش، امرا و
روسا، ادیب و شاعر سب طرح کے بزرگوں کے حالات ہیں
شاہ تراب ولی اللہ، حضرت محسن نعت گو، منشی امتیاز علی
وزیر بھوپال، منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کاکوری ہی کے
رہنے والے تھے۔ قیمت ے ر

سفرنامہ مصر۔ اسکے ملاحظہ سے مصر کے عام جغرافی،
تمدنی، اقتصادی و سیاسی حالات معلوم ہونے کے
علاوہ وہاں کے باشندوں کے طرز معاشرت، اخلاق اور
مذہبی و سیاسی خیالات کا علم ہو جائیگا۔ کتابت و طباعت
اعلیٰ، درمیان کی ۶۰ سے زائد سادہ و رنگین عکسی تصاویر۔ للعہ

سفرنامہ اندلس۔ جس میں اندلس کی تقریباً ایک سو
مشہور اسلامی بستیوں قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، القہ، طلیطلہ،
بلنسیہ، برشلونہ، فارس وغیرہ کے چشم دید حالات اور متعدد
نقشے نقشہ روضات و قلعہ جات کی ۲۶ عکسی تصویریں
درج ہیں۔ طباعت اعلیٰ۔ قیمت ے ر

سفرنامہ حرمین الشریفین (از مولوی محی الدین حسین
دہلوری) آداب سفر زیارات شہر مدینہ کے حالات، اسکے
آثار مشہورہ و مقامات متبرکہ، اہل مدینہ کی معاشرت، تمدن،
وہاں کے مدارس، حمام، ماکولات، فواکہات و لباس،
وزن و سکہ جات، اہل مکہ کے اخلاق اور انکا سلوک،
اداے فریضہ حج کی کیفیت و حالات۔ سفر بری و بحری
حجم ۵۴۳ صفحے۔ قیمت عا ر

عرب اور انکا مستقبل۔ سید مقبول احمد بی اے نے
عراق عرب میں چار سال سفر و قیام کرنے کے بعد یہ کتاب
لکھی ہے اور اس میں اپنے نقطہ نظر سے عرب قوم کے ماضی و
حال سے بحث کرکے آیندہ کے متعلق توقعات قائم
کی ہیں۔ قیمت ۸ر

ترجمہ تاریخ فرشتہ۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں
حکومتوں اور مشائخ کے حالات میں تاریخ فرشتہ نہایت
مشہور و مستند کتاب ہے۔ اُسی کا ترجمہ بڑے اہتمام سے
دو جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ حجم ۱۴۰۰ صفحے قیمت للعہ ر

معین الآثار۔ مولفہ مولوی معین الدین احمد اکبرآبادی
جس میں آگرہ کی مشہور و معروف عمارت روضہ تاج محل
کی مبسوط تاریخ اور شاہجہاں کی چہیتی بیگم ممتاز محل ارجمند
بانو بیگم کی سوانحعمری کے علاوہ دیگر عمارات ملحقہ کے حالات
ہیں۔ کتاب متعدد عکسی تصاویر و نقشہ جات سے
مزین ہے۔ قیمت عا ر

نفحات العنبریہ۔ شیخ عبدالعزیز مکی سے لیکر شاہ علی نور قلندر
تک پیران سلسلہ قلندریہ اور انکے خلفاء کے حالات اور
ہندوستان میں اس سلسلہ کی اشاعت کی تفصیلات
قیمت ے۔ وعہ ر

سیرۃ

سیرۃ رسول اللہ - نامور فاضل اور مشہور ادیب جناب سید نواب علی رضوی ایم اے پرنسپل بہاء الدین کالج جوناگڑھ مصنف تذکرۃ المصطفےٰ و معارج الدین وغیرہ نے احادیث و سیر کے قدیم ماخذوں کی مدد سے حضور رسول مقبول صلعم کے حالات پاک میں یہ قابل قدر کتاب لکھی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت دیدہ زیب۔ قیمت ے ر

سرور عالم - حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس سوانح حیات اس ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں کہ ہر واقعہ کے متعلق سنہ ولادت سنہ نبوت سنہ ہجرت اور سنہ عیسوی تا امکان جملہ متعین درج کیے ہیں۔ انداز تحریر بھی مخصوص طور پر دلکش ہے۔ عرب کا نقشہ اور غار حرا کی تصاویر مستزاد۔ قیمت ۱۲/

اسلامی خلافت کا کارنامہ - پہلا حصہ - اسلام سے پہلے دنیا کی مذہبی و اخلاقی حالت۔ تاریخ کی ورق گردانی کے بعد نہایت تحقیق سے لکھی ہے۔ قیمت عہ

دوسرا حصہ - جلد اول - موسوم بہ "مولود ہمایوں" جس میں نبی کریم کے اجداد کے حالات، حضور کی ولادت باسعادت، مذہبی و اخلاقی اصلاحات کے لیے جد و جہد، کفار کی ایذا دہی اور ہجرت کا حال وضاحت سے درج ہے

قیمت عہ

ایضاً جلد دوم - موسوم بہ "مصطفائی کمال" اس میں ہجرت کے بعد جو جو واقعات پیش آئے ہیں اور جن سے مذہبی و اخلاقی و انتظامی اصلاحیں فرمائی گئی ہیں وہ سب [illegible] کا ذکر ہے۔ قیمت عہ

الدر المنظم فی مناقب غوث الاعظم - مولانا شاہ علی انور قلندر نے اس بسیط کتاب میں علم تصوف اور صوفیہ کے متعلق کثیر معلومات فراہم کی ہے اور حضرت غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی آپ کے مواعظ و خطبات و تعلیمات کی خصوصیات اور آپ کی ازواج و اولاد اور خلفاء کا تذکرہ لکھا ہے۔ نیز آپ کا حسب و نسب، آپ کے متعلق بزرگان متقدمین کے اخبارات و بشارات اور ان بزرگوں کے حالات درج ہیں۔ ۲ جلد قیمت عہ

درر الجواہر - صوبہ بہار کے ایک مخلص و محترم بزرگ جناب سید محمد یعقوب صاحب قادری مجیبی ڈپٹی مجسٹریٹ گیا نے حضرت غوث اعظم سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب میں یہ قابل دید رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ ۱۱/

سلطان نور الدین محمود - چھٹی صدی ہجری کا وہ نامور فاتح جس نے ملک شام و مصر سے عیسائیوں کو شکست دیکر خارج کیا اور سلطان صلاح الدین کو قابل قدر اعانت پہنچائی۔ قیمت عہ

حیات سلطان صلاح الدین - جنگہائے صلیبی میں مسیحی حکومتوں اور فوجوں کو پے بہ پے شکست دینے والے مسلمان تاجدار سلطان صلاح الدین ایوبی کی قابل دید سوانحعمری۔ قیمت عہ

حیات حافظ رحمت خاں - روہیلکھنڈ کے مشہور حکمراں حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی مفصل سوانحعمری مرتبہ الطاف علی بی اے بریلوی مع ۶ تصاویر دو جلد۔

قیمت ے ر

باسم خداوند جان آفرین

رجسٹرڈ نمبر ا | اے ۴۷۸

جامعیت جہاں نماے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجراء الناظر) ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر
لکھنؤ

ایڈیٹر:- ظفر الملک علوی

نمبر ۶ | جون ۱۹۳۵ء | [illegible]

(فہرست)

[illegible] عام (رنگین سرورق چکنا کاغذ)	[illegible]	سالانہ مع محصول ڈاک	فی پرچہ ۵ر
[illegible] ایڈیشن (بادامی سرورق کھرا کاغذ)	[illegible]	" "	" ۲ر

تاریخ

تاریخ ابن خلدون - علامہ ابن خلدون مغربی کو اہل یورپ بھی فن تاریخ کا امام مانتے ہیں۔ یہ انھیں کی مشہور و معروف مستند تاریخ عہد اسلامی کا ترجمہ ہے۔

مقدمہ (۳ جلد) جس میں مصنف نے اپنا فلسفۂ تاریخ اور وہ اصول تاریخ نویسی لکھے ہیں جو آج یورپ کے مورخین کے لیے شمع ہدایت بنے ہوئے ہیں۔ قیمت عہ ر

جلد اول حضرت نوح کے زمانے سے چھٹی صدی عیسوی تک کے حالات۔ قیمت ۸ر

جلد دوم - ملوک فارس، یونان، روم اور سلاطین قسطنطنیہ کے حالات۔ قیمت ۸ر

جلد سوم - حضور خاتم المرسلینؐ کی ولادت سے عہد خلافت حضرت صدیقؓ تک۔ قیمت ۸ر

جلد چہارم - حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے سے حضرت امام حسنؓ کے تفویض خلافت تک۔ قیمت ۸ر

جلد پنجم - حضرت معاویہؓ کی خلافت سے حضرت عمر بن عبدالعزیز تک۔ قیمت ے ر

جلد ششم - خلفاے بنی امیہ کے آخری تاجداروں سے مہدی عباسی تک۔ قیمت ۸ر

جلد ہفتم - مشہور خلفاے عباسیہ ہارون الرشید، امین و مامون معتصم و واثق کا عہد۔ قیمت ے ر

جلد ہشتم - زمانہ انحطاط دولت عباسیہ کے ۱۰ تاجداروں کا عہد۔ قیمت ے ر

جلد نہم - خلفاے عباسیہ کا آخری دور اور دولت مصریہ و عبیدیہ۔ قیمت ے ر

جلد دہم - اندلس میں شاندار اسلامی حکومت کے ابتدائی حالات۔ قیمت ے ر

جلد یازدہم - اندلس کا آخری دور - کامل حکومت اسلامی کا قیام۔ قیمت ے ر

جلد دوازدہم - سلجوقیوں سامانیوں اور غزنویوں کا دور حکومت۔ قیمت ے ر

جلد سیزدہم - غوریوں، دیلمیوں اور تاتاریوں کا عہد حکومت۔ قیمت ے ر

جلد چہاردہم - چنگیز خاں کا خروج - ممالک اسلامیہ کی تباہی و بربادی۔ قیمت ے ر

اخبار الاندلس (۳ جلد) اندلس کی اسلامی حکومت کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ یورپ کی موجودہ تمام ترقیوں کی بنیاد وہیں پڑی۔ اس عہد کی تاریخ پر بعض بڑی معتمد کتابیں اردو میں نکلیں مگر امریکہ کے مشہور مورخ اسکاٹ کی تاریخ سب سے زیادہ مفصل ہے جسے اندلس کے شیدائی مولوی خلیل الرحمن صاحب نے بڑی عرقریزی و جانفشانی کے بعد اردو میں منتقل کیا ہے۔ حجم ڈھائی ہزار صفحات کے اوپر قیمت عہ

مختصر تاریخ اسلامی - یعنی علامہ محی الدین خیاط مصری کی دروس التاریخ کا خلاصہ و ترجمہ۔ جسکے مطالعہ سے اجمالی حالات معلوم ہو جائیں گے۔

جلد (۱) رسول کریم - رسول مقبول صلعم کی سیرت پاک ۸ر

جلد (۲) خلافت راشدہ - حضرات خلفاے راشدین کے حالات ۹ر

جلد (۳) خلافت بنو امیہ - خلفاے بنو امیہ " " ۱۰ر

جلد (۴) خلافت بنو عباس - خلفاے بنو عباس " " ؎

مرآۃ محمدی - مسلمان سلاطین گجرات کے مستند حالات مصنفہ شیخ غلام محمد مصنف مرآۃ عالمگیری۔ قیمت ۸ر

نئی کتابیں

مجموعۂ نغز

حکیم قدرت اللہ قاسم کا نایاب تذکرۂ شعرائے اردو پہلی بار پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے مرتب کر کے شایع کرایا ہے ۔ یہ قدیم تذکروں میں سب سے زیادہ ضخیم ہے ۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ شمس العلما آزاد کی آب حیات کی تعمیر اسی کی بنیاد پر ہوئی ہے ۔ حجم ۹۰۰ صفحے ۔ تقطیع کلاں ۔ دیدہ زیب جلد قیمت ۶ ر

تاریخ حریتِ اسلام

پنجاب کے مشہور ادیب و مورخ منشی محمد الدین صاحب فوق کی قابلِ قدر کتاب کا تیسرا اڈیشن ۔ اس میں زمانۂ رسالت، عہد خلافت راشدہ، دور خلفائے بنی امیہ و بنی عباس، بنی بویہ و سلجوقیہ، دولتِ ہسپانیہ و غزنویہ کے علاوہ ترکی، مصر، الجزائر و مراکش فرماں روایان ہند (افاغنہ، غلامان و مغلیہ) بادشاہان دکن، سندھ و کشمیر کے عہد ہائے گزشتہ کے راستباز۔ حق پرست اور حق گو بزرگوں کے حیرت خیز، جرأت آفریں اور ولولہ انگیز استقلال، جوش و ایثار کے حریت آموز حالات اور عدل و انصاف، حریت و مساوات، خدا ترسی و پاکیزہ نفسی کے حامی بادشاہوں کے سبق آموز واقعات کے علاوہ پرستار حق ہمدرد قوم اور فدائے مذہب و ملت خواتین کے سوانحات درج ہیں ۔ حجم ۷۶۴ صفحے ۔ خوشنما جلد ۔ قیمت ے ر

ہندوستان کی پولیٹکل اکانومی

معاشیاتِ ہند پر مسٹر امرناتھ بالی ایم اے معلم اقتصادیات ڈی اے وی کالج لاہور کی قابل قدر کتاب جسکے مطالعہ سے ہندوستان کی اقتصادی حالت سے پوری طرح واقف ہونے اور حکومت کی پالیسی اور قوم کی ضروریات کا صحیح اندازہ لگانے کا موقع ملیگا ۔ حجم ۳۱۲ صفحہ ۔ قیمت عہ

پیغام آزادی

مسٹر تلک کی انگریزی اور مرہٹی زبان کی سیکڑوں تقریروں میں سے منتخب تقریروں کا ترجمہ منشی رام رچھپال سنگھ صاحب شیدا نے اردو میں کیا ہے جسکا مطالعہ سیاسیات ملکی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ہوگا ۔ حجم ۳۲۴ صفحے ۔ قیمت عہ

آئینۂ ہندوستان

ایک انگریز اخبار نویس مسٹر ایچ این بریلسفورڈ ہندوستان اس غرض سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات کا بذات خود مشاہدہ کریں اور اپنے نتائج کتابی صورت میں شایع کیے جسکا ترجمہ حاضر ہے عہ

قوم کی آواز

مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس کے موقع پر جب انگلستان گئے تھے وہاں انھوں نے جو تقریریں کیں انکا ترجمہ جامعہ ملیہ نے شایع کیا تھا جسکی قیمت عہ تھی یہ دوسرا اور ارزاں ترجمہ لاہور سے نکلا ہے اسمیں دو عکسی تصویریں بھی شامل ہیں ۸۰ صفحے قیمت عہ

ملنے کا پتہ ۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

لکھنؤ کے تحفے

راحت روح

یہ لاجواب عطر شاہی زمانہ کی ایجاد ہے جو اب صرف یہاں کے ایک قدیم کارخانہ عطر میں تیار ہوتا ہے اور خوش مذاق رئیسوں اور بڑی سرکاروں میں پسند کیا جاتا ہے فی تولہ [illegible]

مخلوط آصفی

نواب آصف الدولہ کے عہد میں یہ بےنظیر عطر تیار ہوا تھا اور انھیں کے نام سے موسوم ہے۔ جرمنی اور جاپان کے آئے ہوئے عطر خوشبو کی تیزی پائداری میں اسکا مقابلہ نہیں کر سکتے فی تولہ [illegible]

عزیز ناز

یہ عطر یہاں کے ایک مشہور کارخانہ کی سالہا سال کی کوشش کا ثمرہ ہے اور بھینی بھینی خوشبو والے کئی قسم کے پھولوں کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ قیمت فی تولہ [illegible]

- عطر حنا فی تولہ عہ سے [illegible]
- عطر جوہی عہ ،، [illegible]
- عطر چنبیلی [illegible] ،، [illegible]
- عطر بیلا [illegible] ،، [illegible]
- عطر کیوڑا [illegible] ،، [illegible]
- عطر بیلا [illegible] ،، [illegible]
- عطر چمپا [illegible] ،، [illegible]
- عطر نرگس [illegible] ،، [illegible]
- عطر مولسری [illegible] ،، [illegible]
- عطر سہاگ [illegible] ،، [illegible]
- عطر مشک [illegible] سے [illegible]
- عطر زعفران [illegible] ،، [illegible]
- عطر عنبر [illegible] ،، [illegible]
- عطر عود [illegible] ،، [illegible]
- عطر بانس [illegible] ،، [illegible]
- عطر مخلوط عنبری [illegible] ،، [illegible]
- عطر شمامۃ العنبر [illegible] ،، [illegible]
- عطر فتنہ [illegible] ،، [illegible]
- عطر مجموعہ [illegible] ،، [illegible]
- عطر مٹی [illegible] ،، [illegible]

عینک توڑ سرمہ

یہ سرمہ مختلف دھاتوں سے مرکب ہے۔ اسکے استعمال سے بینائی کی قوت میں اتنی ترقی ہو جاتی ہے کہ عینک لگانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ قیمت فی تولہ [illegible]

پان کا مصالحہ

مشک و زعفران وغیرہ کی آمیزش سے نہایت خوشبودار ہو جاتا اور پان کو لذیذ اور خوش ذائقہ بناتا ہے فی ڈبیہ ۳ ، فی شیشی [illegible]

تمباکوے خوردنی

(زردہ)

- پتی فی سیر [illegible]
- مشکی [illegible]
- دانہ دار [illegible]
- نقرئی [illegible]

(گولیاں)

- طلائی فی تولہ [illegible]
- نقرئی ،، ۶ ، ۸ ، ۱۰
- سادہ ،، ۴

(قوام)

- مشکی فی تولہ ۲ ، ۴ ، ۵ ، ۶ ، [illegible]
- زعفرانی ،، ۲ ، ۴
- برقی ،، [illegible]
- افشانی ،، [illegible]

شاہی برنجی قوام

یہ خوشبودار مصالحہ قوام کی شکل میں ہے۔ تمباکو اس میں بالکل نہیں۔ صرف پان کو لذیذ و خوش ذائقہ بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ فی تولہ [illegible]

خوشبودار کتھا

کیوڑے کے پھولوں سے بسایا ہوا کتھا۔ فی سیر [illegible]

چکنی ڈلی

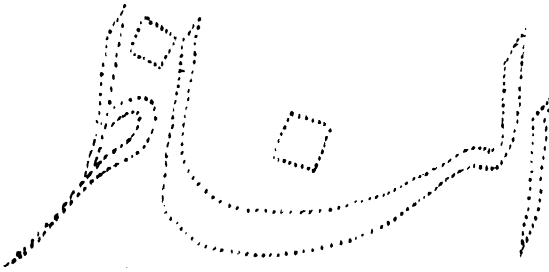
- ایک رخی فی سیر [illegible]
- دو رخی ،، [illegible]
- چورا [illegible]

تمباکوے کشیدنی

خوشبودار خمیرہ فی سیر [illegible] ، ۸ ، ۲ ، ۴

ظفر الملک اینڈ سنس لکھنؤ

بنام خداوند جاں آفریں



نمبر ۶ جلد ۳۹ جون ۱۹۳۵ء

زوالِ بنی اسرائیل

(جناب الحاج مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے۔ ڈپٹی کلکٹر)

وفات حضرت سلیمان کا اعلان' زوالِ سلطنت بنی اسرائیل کی عبرت ناک داستان کا عنوان تھا۔ فلاکت و مصیبت کے بادل عہدِ زریں کے تمام ہونے سے پہلے ہی جمع ہونے لگے تھے۔ ایک روشن ضمیر حکیم "اہیجا" نام قبیلۂ افرائیم کے سردار" یربعام" کو سلطنت کی بشارت دے چکا تھا۔ اور شاہ موعود عقوبتِ سلطانی کے خوف سے فرار ہوکر مصر میں پناہ گزیں تھا۔ وہاں اب اُس فرعون کی حکومت نہ تھی جس نے اپنی بیٹی شہنشاہ بنی اسرائیل کو نذر کی تھی اور جس کی شادی کا جشن بڑے دھوم دھام سے یروشلیم میں منایا گیا تھا بلکہ اُس کا جانشین "شیشاک" فرمانروائے ارض مصر تھا جو اسرائیلیوں کی سلطنت کو اپنا حریف اور رقیب تصور کرکے اُس کو تباہ کرنے اور ہیکل سلیمانی کے گراں بہا خزانے تاراج کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

یربعام سے پہلے ادوم کے تباہ شدہ شاہی خاندان کا ایک رکن "ہدد" نام مصر میں پناہ لے چکا تھا۔ اور فرعونِ وقت کی سالی سے شادی کرکے صاحبِ مال و منال ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب داودی سپہ سالار "یوآب" نے ادومیوں کا قتل عام کیا تھا تو یہ بچہ محافظوں کی جاں نثاری اور وفا شعاری سے مدین اور فاران کے علاقوں میں پوشیدہ رکھا گیا۔ بالغ ہوا تو مصر پہونچا۔ اپنی شجاعت وجاہت اور دانشمندی سے فرعون کا منظورِ نظر ہوکر اُس کا ہم زلف بنا۔ اور موقع کل دیکھ کر وطن واپس

آیا۔ غارت گروں کا ایک انبوہ فراہم کرکے شہنشاہ کے عاملوں سے نبرد آزمائی کرنے لگا اور بحیرۂ احمر کی اسرائیلی تجارت خطرے میں ڈال دی۔

شمال میں دمشق کے قدیم شاہی خاندان کا ایک ملازم "رزان" علمِ بغاوت بلند کیے تھا اور شاہی سپاہیوں کو شکست دے کر دمشق اور اُس کے ملحقات پر متصرف ہو گیا تھا اور ماورائے ریگستان سے کنعان کی تجارت کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

ھداد اور رزان کی کامیابیاں دیکھ کر عمونیوں اور موآبیوں نے بھی کروٹ بدلی تھی اور پچھلی سفاکیوں کا عوض لینے کے لیے وقت کے منتظر تھے۔

شمال مغرب میں ایک زبردست طاقت دارالحکومت نینوا میں تیار ہو رہی تھی جو دمشق اور شام کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور چند روز میں دُنیا کی تاریخ کا ورق اُلٹنے والی تھی۔

جب تک عظمت و اقبالِ سلیمانی کا آفتاب درخشاں رہا کسی بادلوں کی طرف کسی کی آنکھ نہ اُٹھی۔ مگر سلطانِ السلاطین کی خبرِ وفات مشتہر ہوتے ہی آفات و بلیات کی گھنگھور گھٹائیں دنیائے بنی اسرائیل پر چھا گئیں اور زمین و آسمان تیرہ و تار ہو گیا۔

۹۳۳ قبل مسیح میں رحبعام بن سلیمان اپنے والد ماجد کے تخت پر جلوہ افروز ہو کر روسائے قوم سے حلفِ وفاداری لینے سکم گیا۔ رعایا نے یربعام کو مصر سے بلوا لیا اور اُس کو سردار بنا کر نئے بادشاہ سے محصولوں میں کمی کا مطالبہ کیا۔ رحبعام نے کہن سال و جہاں دیدہ بزرگوں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے "سپر با یدانداختن" کی صلاح دی۔ نوجوان ارکانِ حکومت نے اس رائے سے اختلاف کیا۔ ناتجربہ کار بادشاہ نے اپنے ہمسنوں کی بات مانی اور روسائے سلطنت کو جواب دیا کہ

"میرے باپ نے تم کو کوڑوں سے ٹھیک کیا تھا۔ میں تم کو بچھوؤں سے ٹھیک کروں گا۔"

سرکشی کی چنگاریاں پہلے سے سُلگ رہی تھیں۔ یکایک آگ بھڑک اُٹھی۔ اسرائیلیوں کے طاقتور قبیلے باغی ہو گئے اور "سلطنتِ اسرائیل" کے نام سے شمال میں جداگانہ حکومت قائم کر لی۔ صرف دو اسباط یہودا اور بنیامین وفادار رہے اور وہ شوکت و جبروت کی سلطنت جو حضرت داؤد نے اپنی جواں مردی اور شجاعت سے قائم کی تھی جس کو حضرت سلیمان کی اقبالمندی نے محسودِ عالم بنا دیا تھا دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔

شمالی حصہ زرخیزی اور سرسبزی کی وجہ سے فلسطین کا باغ مشہور تھا۔ یافہ سے صیدون تک ساحلِ بحر اس کے علاقہ میں تھا۔ دریائے فردن وسطی حصہ کو سیراب کرتا تھا۔ وادئ دان اور کوہ ہرمن کی ترائی تک اس کی وسعت تھی۔ دس اسباط اس وسیع خطۂ ارض میں آباد تھے اور اُن سب نے

بالاتفاق یربعام کو اپنا بادشاہ بنایا۔

جنوبی حصہ رقبہ میں مختصر اور دولت میں کمتر تھا۔ پہاڑیوں کا سلسلہ تقریباً سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا موآبیوں اور ادومیوں کے صوبوں سے سرحد ملی تھی۔ لیکن یروشلم کا مقدس شہر اسی حصہ میں واقع تھا اور رعایا نسبتاً بہادر اور جفاکش تھی۔ یہاں کی حکومت رحبعام کے تصرف میں رہی۔

ایک اقلیم میں دو بادشاہوں کا صلح و آشتی سے رہنا مشکل ہے فلسطین نے مختصر ملک میں دو متقابل حکومتیں امن و عافیت سے کیونکر بسر کر سکتی تھیں۔ خانہ جنگی شروع ہوئی۔ دشمن شاد دوست پائمال ہوئے۔ سلطنت کا نام ۲۴۴ سال تک قائم رہا لیکن سوائے تنزل و تباہی کے ترقی کا خواب دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔

مورخین نے اس طویل مدت کو چار دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور "مخالفت" کا تھا جس میں رحبعام اور اس کے جانشین "سلطنت اسرائیل" کو برباد کرنے اور کھوئے ہوئے علاقوں پر دوبارہ متصرف ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کی میعاد ۶۰ سال تھی۔

دوسرا دور "ظاہری اتحاد" کا تھا۔ جس میں شام کی بڑھتی ہوئی قوت سے مقابلہ کرنے اور اپنے مرزبوم کو اغیار کے حملوں سے بچانے کے لیے دونوں سلطنتوں نے باہم اتفاق کیا۔ اس عارضی صلح کی میعاد ۸۰ سال تھی۔

تیسرا دور "دشمنی" کا تھا۔ دونوں حکومتیں لڑ لڑ کر کمزور ہو گئیں۔ نینوا اور بابل کا آفتاب اقبال بلند ہوا۔ آخرکار شمالی سلطنت تباہ ہو کر نینوا کا ایک صوبہ بن گئی۔ اس کی میعاد ۴۷ سال تھی۔

چوتھا دور "جانکنی" کا تھا۔ یروشلم کی مختصر حکومت زمانہ متوسطہ کی سلطنت غرناطہ کی طرح ہر طرف دشمنوں سے گھری تھی۔ کبھی نینوا سے ساز کرتی۔ کبھی مصر سے امداد مانگتی۔ اور کبھی دونوں سے لڑتی تھی۔ بالآخر بابل نے اس حکومت کا نام و نشان مٹا دیا۔ اس عالم نزع کی میعاد ۱۳۰ سال تھی۔

ان چاروں کے بادشاہوں کی فہرست صحیفہ "سلاطین" اور صحیفہ "تواریخ" میں موجود ہے مگر ان کی بد افعالیوں کی تفصیل ناظرین کے لیے دلچسپ نہیں اس لیے ہم حذف کرتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ یربعام نے یہودی معبدوں میں بتوں کی عبادت شروع کی۔ بت پرستی کے لیے مصریوں کی طرح طلائی گوسالے بنوائے۔ ہیکل سلیمانی کے جواب میں عالیشان صنم خانے تعمیر کرائے اور فسق و فجور کا دروازہ کھول دیا۔ اس کا بیٹا صرف دو ہی سال حکمراں رہا تھا کہ بعاشا نام ایک سردار فوج نے اس کو قتل کر کے حکومت اپنے ہاتھ میں لی مگر یہ جدید خاندان بھی چند روز میں بے چراغ ہو گیا۔ سپہ سالار عمری سلطنت پر قابض ہوا اور یروشلم کے مقابلہ میں سامرہ آباد کر کے دارالحکومت بنایا۔

دمشق کی اجنبی سلطنت طاقتور ہو چکی تھی۔ اُمری کے جانشین اخی اب نے دوبار شام کی فوجوں کو شکست دی مگر بعد کو نینوا کی روز افزوں شوکت سے نبرد آزما ہونے کے لیے دمشق سے صلح کر لی۔ نینوا کے بادشاہ شالمنیسر دوم نے اسی زمانہ میں سلطنت اسرائیل پر پہلی چڑھائی کی اور قرقار کی لڑائی میں اسرائیلیوں اور شامیوں کی متحدہ قوت کو شکست دی۔

اخی اب کی مشہور آفاق بیگم جزبیل کا نام مسیحی دنیا میں آج تک ظلم و جور کے لیے ضرب المثل ہے۔ یہ خوبصورت اور دانشمند ملکہ صیدون کے بت پرست بادشاہ کی لڑکی تھی۔ اپنے حسن و جمال سے اخی اب کو غلام بنایا۔ اور زیرکی و ہوشمندی سے رعایا کے قلوب ہاتھ میں لیکر "سلطنت اسرائیل" کی نورجہاں بیگم بن گئی۔

اپنے خاندانی معبود "بعل" کی پرستش فرزندان یعقوب کے ملک میں جاری کی۔ اس بت کے ۸۵۰ پجاری روزانہ اُسکے دسترخوان پر شریک طعام ہوتے تھے۔ جزبیل کا نیا شہر آباد کیا۔ جس میں ایک دلکش عمارت ہاتھی دانت سے ملکہ کے رہنے کے لیے بنائی گئی۔ بڑے بڑے مذبح تعمیر کرائے جن پر علی الاعلان "بعل" کے نام پر قربانی ہوتی تھی اور بخور جلائے جاتے تھے۔

کہتے ہیں کہ شاہی محل کے قریب ایک تاکستان تھا۔ بادشاہ اُس اراضی کو خرید کر کے اپنا باغ لگانا چاہتا تھا مگر مالک تاکستان اُس زمین کے جدا کرنے پر کسی طرح رضامند نہ تھا۔ بادشاہ کو آزردہ دیکھ کر ملکہ نے ایک جھوٹا مقدمہ اُس مالک پر قائم کرایا اور اُس کو قتل کرا کے زمین بادشاہ کو دلا دی۔ پیغمبر وقت حضرت الیاس نے بادشاہ کو بہت سمجھایا۔ بڑے بڑے معجزے دکھائے لیکن عورت کی طاقت ہر زمانہ میں مذہب پر غالب رہی ہے' بادشاہ کو سمجھ نہ آئی۔ سیکڑوں بیگناہ موحد پہلے خانماں برباد ہو چکے تھے۔ تاکستان کا مالک بیگم کے اشارے سے قتل کیا گیا تو پیغمبر کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اُنھوں نے بددعا دی۔

"شہر جزریل کی فصیل کے پاس کتے جزبیل کو کھائیں۔ اخی اب کا جو رشتہ دار شہر میں مرے اُسے جانور کھائیں اور جو میدان میں مرے اُسے ہوا کے پرندے چٹ کر جائیں"

نبی کا قول پورا ہوا لیکن جزبیل کا نام مذہبی تواریخ کے صفحوں پر ہمیشہ کے لیے یادگار رہ گیا۔

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔

حضرت الیاس کے بعد ہوسیع نبی نے اسرائیلی بادشاہوں کو بہت فہمائش کی اور صاف الفاظ میں کہا "یہ ملک راستی۔ شفقت اور خداشناسی سے خالی ہو گیا ہے۔ بدزبانی۔ عہدشکنی۔ خونریزی۔

چوری - اور حرام کاری کے سوا سارے ملک میں کوئی فعل پسندیدہ نہیں ہے - دیکھو یہ ملک ماتم کریگا - اس کے تمام باشندے - جنگلی جانور اور ہوا کے پرندے ناتوان ہو جائیں گے یا کہ سمندر کی مچھلیاں بھی نیست و نابود کر دی جائیں گی"۔

مگر اسرائیلیوں کے حاکم نشۂ دولت سے سرشار اور فسق و فجور سے مخمور تھے - نہ رعایا پر اثر ہوا نہ حاکموں کی عقل درست ہوئی - بت پرستی اور بدکاری کا زور بڑھتا ہی گیا - یہاں تک کہ ۷۲۲ قبل مسیح میں نینوا کے بادشاہ سارگون دوم نے شمالی حکومت کے دارالسلطنت سامرہ پر قبضہ کر لیا - یربعام کی بنائی ہوئی ریاست جو فلسطین کا باغ کہلاتی تھی نینوا کا ایک صوبہ ہو گئی اور فرزندان یعقوب کے محلات میں بابل اور اسوریا کے سپاہیوں نے بود و باش اختیار کی ع تصرف زاغ نے با یا ہما کے آشیانے پر۔

بنی اسرائیل کے دس قبیلے جو یہاں آباد تھے جلاوطن کیے گئے اور دریائے فرات کے اس پار مختلف دیہات میں بسائے گئے ۔ وہ ایسی سخت مصیبت، تباہی اور گمنامی میں گرفتار ہوے کہ اُن میں سے دو اسباط کا اس وقت تک پردۂ عالم پر سراغ نہیں مل سکا - نہ یہ پتہ ہے کہ وہ کن اضلاع میں آباد کیے گئے تھے نہ یہ خبر ہے کہ ان کی نسل باقی رہی یا نہیں۔

جنوبی ریاست وسعت اور زرخیزی میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اپنے حریف سے کمتر تھی اُس کا مختصر رقبہ ایک طرف ریگستان اور دوسری سمت بحیرۂ روم سے گھرا ہوا تھا - افرائیم اور دان کے علاقے شمالی سرحد تھے اور جنوب میں ایدومی - عمالقہ اور موآبیوں کی حکومتیں تھیں لیکن یروشلم کا مقدس شہر اس حکومت کے زیرنگیں تھا اور وہ متبرک عبادت خانہ اسی حصہ میں واقع تھا جس میں تابوتِ سکینہ محفوظ تھا - لہذا عزت و توقیر میں یہ چھوٹی ریاست اپنے زبردست ہمسایوں سے بالاتر تھی اور تمام دنیاء توحید کی نظر میں اس ملک کے فرماں روا کی خاص وقعت تھی۔

رحبعام بن سلیمانؑ کی ماں عمونی نسل کی تھی اور اپنے محترم شوہر کی حیرت انگیز رواداری سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر آبائی مذہب پر قائم رہی تھی - اُس کا فرزند یروشلم کا بادشاہ ہوا تو اپنی ماں کے دیوتاؤں کی طرف نظر التفات سے دیکھنے لگا - ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ہنر است - اصنام کی پرستش مضافاتِ شہر اور کوہستان کی چوٹیوں پر ہونے لگی - بدکاری اور فسق کا آغاز ہوا - عمرانیات کے مسلمہ اصول کے مطابق مذہبی سلطنت میں پابندی شریعت کے ساتھ ملکی تنزل شروع ہوا۔

شمالی سلطنت سے جنگ و جدال کا سلسلہ جاری ہی تھا - کارآزمودہ سپاہی اُدھر پھنسے ہوئے تھے

کہ اس بدنصیب بادشاہ کے پانچویں سنہ جلوس میں فرعونِ مصر نے کنعان پر حملہ کر دیا۔ اور بڑھتا ہوا یروشلم تک پہونچ گیا۔ یہود میں مقابلہ اور مجادلہ کا دم نہ تھا۔ فرعون بغیر کسی مزاحمت کے شاہی محل بلکہ مقدس ہیکل کے حدود تک پہونچ گیا۔ شاہی خزانوں کا ایک حصہ لوٹ لیا۔ اور ہیکل کے دروازے پر جو سونے کی ڈھالیں حضرت سلیمان نے نصب کی تھیں اُتار کر دوسرے مالِ غنیمت کے ساتھ مصر لے گیا۔

یہ پہلی دست درازی تھی جو مقدس عبادت گاہ کے مال و زر پر کی گئی۔ حالانکہ اس متبرک مکان کے برگزیدہ معمار کی وفات کو صرف پانچ ہی سال گزرے تھے۔

رحبعام نے اپنی ذلت مٹانے کے لیے پیتل کی ڈھالیں ہیکل کے دروازے پر نصب کیں گویا آبنوس میں پتھر کی پچڑ لگائی لیکن بد اعمالیوں سے باز نہ آیا اور ملکی قوت کو زوال ہی ہوتا گیا۔ البتہ اُس کا پوتا آسا جو تقریباً ۴۱ سال تک تختِ سلطنت پر جلوہ افروز رہا پرہیزگار۔ دانشمند اور خدا ترس تھا۔ اُس نے شہر کے گرد و نواح سے صنم خانے دُور کرائے رعایا کو خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت پر مجبور کیا بلکہ اپنی ماں کو بھی اس قصور پر رُتبہ سے گرا دیا کہ اُس نے ایک نفرت انگیز بت بنایا تھا اور اُس کی پرستش سے باز نہ آئی تھی۔ اُس نے کثیر مقدار میں زر و جواہر۔ ظروفِ طلائی وغیرہ ہیکل کی نذر کیے اور عبادت گاہ کی شان و شوکت بڑھائی نئے نئے شہر غیر محفوظ علاقوں میں بسائے۔ اور اُن کی حفاظت کے لیے فصیلیں اور بُرجیاں تیار کرائیں۔ فوج کو آراستہ کیا اور باپ دادا کی کھوئی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کرنے کی سعی بلیغ کی۔

اُس کا فرزند یہوسفط اپنے باپ سے بھی زیادہ مستعد اور قابل ثابت ہوا۔ اُس نے حکومت کے رقبہ کو وسعت دی۔ جدید قلعے تعمیر کرائے اور اجناس کے انبار ملک کے ہر گوشے میں فراہم کر دیے۔ اُس کی دانشمندی اور شجاعت کی شہرت مشرق میں پھیلی۔ ہمسایہ سلطنتوں پر اُس کا رعب قائم ہوا۔ فلستیوں اور ادومیوں نے خراج دیا۔ آخرکار شمال کے بادشاہ اخی اب نے اُس سے صلح کر کے وہ طویل لڑائی ختم کی جو رحبعام کے وقت سے شمالی اور جنوبی حکومتوں کے درمیان جاری تھی۔ اور جس سے فریقین کو سخت نقصانات پہونچے تھے۔

جنوب کے ولی عہد یہورام کی شادی شمال کی شہزادی سے کی گئی اور اس طرح دونوں سلطنتوں میں رشتۂ اخوت مستحکم کیا گیا۔ لیکن یہ ولی عہد بادشاہ ہوا تو باپ کی نیکنامی پر پانی پھیر دیا۔ شمالی ریاست کی مشہور عالم سفاک ملکہ جزبیل کی لڑکی عتلیا سے اُس نے شادی کی جو اپنی ماں کی طرح بعل کی پرستش کرتی اور موحدوں سے عناد رکھنا جزوِ مذہب تصور کرتی تھی۔ بادشاہ نے ملکہ کے اثر سے اپنے آبا و اجداد کے خدا کو ترک کیا بعل کی عبادت یروشلم کے مقدس شہر میں ہونے لگی۔ شرفا بدکار ہوے اور رعایا گمراہ۔ عیش و عشرت کا بازار گرم ہوا

اور فوجی طاقت سرد۔

موقع محل دیکھکر ادومیوں نے بغاوت کی اور اپنی خود مختار حکومت جداگانہ قائم کرلی۔ فلستیوں اور بادی عربوں نے کنعان کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ یروشلم تک پہونچ کر شاہی محلات کے خزانے لوٹ لیے اور بادشاہ کی بیویوں اور بچوں کو قید کرکے اپنے دیس لے گئے۔ صرف ایک بچہ اخزیاہ نام اور اسکی بداخلاق ماں عتلیاہ گرفتاری سے محفوظ رہے جنکے تصرف میں یروشلم کی حکومت آئی۔ فتنہ و فساد اور خونریزی اور سیہ کاری کی دھوم مچی۔ اور سلطنت کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔

اخزیاہ اور اسکے جانشینوں کے کارنامے دیکھنا ہو تو صحیفہ "تواریخ" کی ورق گردانی کی جائے ہم کو اس داستان کی تفصیل سے مطلب نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آحز کے عہد میں جو ۷۴۳ قبل مسیح میں حضرت سلیمانؑ کے تخت پر بیٹھا۔ سلطنت کی کمزوری انتہائی درجے پر پہونچ چکی تھی۔ ادومیوں نے کنعان پر حملہ کیا اور بہتیرا قیدی پکڑلے گئے۔ فلستیوں نے بعض مغربی شہروں پر قبضہ کرلیا۔ شمالی سلطنت کے بادشاہ نے شام کے حاکم سے سازکرکے یروشلم پر چڑھائی کی اور ایلاتھ کے مستحکم بندرگاہ پر قبضہ کرکے اغیار کی چھاونی کنعان کے ایک گوشہ میں قائم کردی۔ روز روز کی نئی مصیبتوں سے تنگ آکر اور اپنے ہمسایوں کی غارت گری سے نجات پانے کے لیے آحز نے نینوا کے بت پرست بادشاہ سے امداد طلب کی۔ نذرانہ کے لیے ہیکل سلیمانی اور محلات شاہی سے سونا چاندی اتار کر بادشاہ یہودکے قاصد نینوا کے دربار میں حاضر ہوے۔ وہاں کا بادشاہ کنعان کے خزانوں پر دست تصرف دراز کرنے کے لیے موقع کا منتظر تھا۔ گدھ نے چڑیوں کی دعوت قبول کی اور شام کے دارالحکومت دمشق پر حملہ کردیا۔ دمشق فتح ہوا۔ وہاں کا حاکم قتل کیا گیا۔ اور شمالی سلطنت کا بازو ٹوٹ گیا۔ آحز اپنے ناصر و معاون سے ملاقات کرنے دمشق گیا۔ وہاں نینوا والوں کی خوبصورت قربان گاہ دیکھکر یہ تجویز ٹھہرائی کہ ایسا ہی معبد ہیکل سلیمانی کے سامنے بنوایا جائے۔ چنانچہ یروشلم واپس آنے کے بعد اسی نمونہ کی عمارت ہیکل سلیمانی کے دروازہ پر بنوائی گئی اور دمشق کے دیوتاؤں کے لیے قربانیاں کی گئیں۔ جنوبی سلطنت کو سخت کمزوری کی مصیبت میں چھوڑکر آحز دنیا سے رخصت ہوا مگر اسکے بیٹے حزقیاہ نے مملکت میں اصلاح کی کوشش کی۔ خداے واحد کی عبادت کا شوق دلایا۔ اور نینوا کے بادشاہ کو جو خراج کی رقم اس کے باپ نے دینا منظور کی تھی یکقلم موقوف کردی۔

نینوا کی سلطنت اسوقت عروج وکمال کے اعلیٰ منازل پر تھی۔ اور بنی اسرائیل کی شمالی حکومت کو اپنا باجگزار صوبہ بنا چکی تھی وہ یروشلم کی بغاوت کیونکر برداشت کرتی۔ اس ملک کے ...

جلال بادشاہ سنحاریب نے کنعان پر فوج کشی کی۔ حزقیاہ نے پہلے تو زر و جواہر دے کر یہ بلا ٹالنا چاہی لیکن بعد کو اپنی عزت سنبھالنے کے لیے مصر کے بادشاہ سے اعانت کا خواستگار ہوا۔ جاسوسوں نے یہ خبر سنحاریب تک پہونچائی تو اُس کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ ٹڈی دل فوج لیکر ارض کنعان میں داخل ہوا۔ اپنے تین زبردست جنرلوں کی سرکردگی میں یروشلم کا محاصرہ کرلیا اور یہودیوں کی زندگی تلخ کردی۔

مصر سے امداد نہ پہونچی اور کوئی صورت بچاؤ کی نظر نہ آئی تو بادشاہ نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور ٹاٹ اوڑھ کر بصد عجز و نیاز ہیکل سلیمانی میں آہ وزاری کے لیے حاضر ہوا۔

شہ چو عجز آں طبیباں را بدید ۔۔۔ پا برہنہ جانب مسجد دوید

اے ہمیشہ حاجت ما را پناہ ۔۔۔ بار دیگر ما غلط کردیم راہ

اس عہد کے نبی حضرت اشعیاہ نے بشارت دی کہ

"سنحاریب اس شہر میں آنے یہاں تیر چلانے نہ پائے گا۔ وہ نہ تو سپر لیکر اسکے سامنے آئے گا اور نہ اسکے مقابل دمدمہ باندھے گا۔ بلکہ جس راہ سے آیا اُسی راہ سے لوٹ جائے گا"

تمام رعایا مضطرب الحال تھی اور اس بلاے ناگہانی سے دفعیہ کی کوئی صورت ظاہر نہ تھی۔ مگر پیغمبر کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ اُسی رات کو نینوا کی فوج میں جو یروشلم کے گرد خیمہ زن تھی ایسی سخت وبا پھیلی کہ ہزاروں سپاہی چند ساعتوں میں ہلاک ہوگئے۔ صبح کو شہر والوں نے فصیل سے جھانکا تو ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں اور بادشاہ سنحاریب مع اپنے باقیماندہ لشکریوں کے خوفزدہ ہوکر فرار ہوچکا تھا۔

سنحاریب یروشلم سے بھاگ کر نینوا پہونچا اور وہاں مندر میں اپنے ہی لڑکوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اسکی موت کے بعد نینوا کی طاقت پر زوال آیا اور وہ زبردست قوم برسراقتدار ہوئی جسکو کاتب ازل نے یروشلم کی تباہی و بربادی کے لیے نامزد کر رکھا تھا۔

کردستان کے اضلاع سے کلدانیوں کے جنگجو قبیلے آندھی کے بگولے کی طرح اٹھے۔ نینوا کو تاراج کیا اور ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی جس کا پاے تخت بابل تھا۔ اور شمالی سلطنت اسرائیل کو تباہ کرنے والا نینوا اس کا ایک مختصر صوبہ ۔

بابل کے پہلے بادشاہ نے کنعان سے دوستانہ مراسم قائم کرنے کے لیے اپنے قاصد شاہ یہود کے پاس بھیجے۔ حزقیاہ نے نادانی سے یروشلم کے مخفی خزانے قاصدوں کو دکھا دیے۔ اشعیاہ نبی کو خبر ہوئی تو وہ بہت آزردہ ہوے اور فرمایا ۔

"اے حزقیاہ رب الافواج کا کلام سن لے۔ دیکھ وہ دن آتے ہیں کہ سب کچھ جو تیرے گھر میں ہے اور جو کچھ تیرے باپ دادا نے آج تک جمع کر کے رکھا ہے بابل کو لیجائیں گے۔ خداوند فرماتا ہے کہ کچھ بھی باقی نہ رہیگا۔ اور وہ تیری اولاد کو بھی گرفتار کر کے لیجائیں گے۔ تاکہ شاہ بابل کے محلات میں خواجہ سرا بنائے جائیں"۔

بادشاہ اس خطرناک پیشین گوئی سے بہت رنجیدہ ہوا لیکن نبیؑ کے اعزاز و اکرام میں کوتاہی نہیں کی۔ اور اپنا وقت امن و سلامتی میں پورا کر دیا۔ اُس کے جانشین منسّی تے جو بارہ برس کی عمر میں سند حکومت پر بیٹھا تھا حضرت اشیا کو بیدردی سے قتل کرا دیا۔ اور ملک میں دوبارہ اصنام پرستی کو رواج دیا۔ ارمیا نبیؑ نے خبر دی کہ منسّی بن حزقیاہ کے مظالم کی پاداش میں یروشلیم پر سخت تباہی آئے گی۔

"خداوند فرماتا ہے کہ میں تجھکو تیرے لیے اور تیرے سب دوستوں کے لیے دہشت کا باعث بناؤنگا۔ تم سب دشمنوں کی تلوار سے قتل ہو گے اور میں تمام یہود کو شاہ بابل کے حوالہ کر دونگا جو تم کو اسیر کر کے بابل لے جائے گا یا تلوار سے قتل کریگا۔ اس شہر کی ساری دولت اور اسکے تمام محاصل اور بادشاہی خزانے دشمنوں کے حوالے کر دوں گا۔ جو انکو لوٹیں گے اور بابل لیجائینگے۔ یروشلیم سامرہ کی طرح ویران ہوگا۔ اور اس طرح دھویا جائے گا جس طرح برتن مانجے جاتے ہیں"۔

اس قسم کی پیشین گوئیوں کی سزا میں ارمیاؑ کو قید خانہ کی زندگی نصیب ہوئی۔ لیکن اُنکے قول کا ہر لفظ پورا ہوا اور غضب خداوندی کے ظہور کا سامان یوں ہوا کہ فرعون مصر نے جس کی حکومت اسوقت جنوب میں سراج کمال پر تھی، بابل کی روز افزوں شوکت و قوت مٹانے کے لیے شمال کی طرف پیش قدمی کی۔ شاہ یہود غلطی سے مزاحم ہوا۔ فرعون کو کنعان سے جنگ منظور نہ تھی وہ اس ملک سے صرف راستہ مانگتا تھا لیکن زمانہ حال کے بلجیم کی طرح شاہ یہود نے منظور نہ کیا۔ مصر و کنعان سے لڑائی شروع ہو گئی۔ ہاتھی اور مچھر کا مقابلہ تھا۔ یہود کو شکست ہوئی۔ بادشاہ قتل ہوا۔ فرعون نے تاوان جنگ وصول کر کے ایک شہزادہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور آگے بڑھ کر بابل کی سرحد تک پہونچا۔ دریائے فرات پر قارقیز کی مشہور لڑائی میں بابل کے سپہ سالار و ولیعہد بخت نصر نے فرعونیوں کو ایسی شکست دی کہ دریائے نیل سے فرات تک کے کل صوبے مصر کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اور فرعون ہزار خرابی اپنے ملک کو واپس پہونچا۔ اب بابل کو توسیع فتوحات کا شوق ہوا۔ اُس نے جنوب کی طرف قدم بڑھایا تو یہ کنعان درمیان میں حائل تھا۔ باشاہ یہود نے کھو کر بھی نہ سیکھا اور اپنی طاقت کا غلط اندازہ کر کے اس بلائے آسمانی سے مقابلہ کی ہمت کی۔ جنگ کا نتیجہ ظاہر تھا تاوان دینا پڑا اور بھاری ٹیکس ارض کنعان پر لگا دیا گیا۔ یہ خراج تین سال تک مشکل ادا ہوا۔ مگر چوتھے

سال اس کی فراہمی نہ ہو سکی۔ یہ کوتاہی بغاوت کے مرادف قرار پائی اور بخت نصر نے کنعان پر حملہ کر دیا۔ یروشلم کا
کا محاصرہ ہوا۔ فوج کی کمان بخت نصر کے سے تجربہ کار سپہ سالار کے ہاتھ میں تھی۔ یہود کا بدنصیب بادشاہ عاجزی
سے صلح کا خواستگار ہوا اور اپنے اعزہ اور رفقاء کو ساتھ لیکر بغداد کے مستعصم باللہ کی طرح دشمن کے خیمے
میں امان مانگنے چلا گیا ع موت کے منہ میں مری جان چلا آپ سے تو۔ جنگ خود بخود ختم ہو گئی۔
بخت نصر نے عبادت خانۂ سلیمانی اور شاہی محل کے خزانے لوٹ لیے اور یروشلم سے دس ہزار قیدی لیکر
اپنے ملک کی طرف واپس ہوا۔ ان قیدیوں میں بادشاہ، اُسکے خاندان والے، تمام اشراف اور اعیانِ
ریاست تھے۔ مظلوم بادشاہ کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ دردناک واقعہ ۵۹۷ ق م کا
ہے۔ کنعان کی حکومت شہزادہ صدقیاہ کے سپرد کی گئی اور سالانہ خراج کی رقم مقرر ہوئی۔ یہ بد اقبال بادشاہ
۲۱ سال کی عمر میں اپنے آبا و اجداد کی تباہ شدہ سلطنت پر شاہ بابل کے باجگزار کی حیثیت سے متصرف
ہوا اُسکے کلیجہ میں ذلت اور رسوائی سے ناسور پڑے تھے۔ تلوار بابل کے ساتھ تھی اور دل اُسکے خلاف۔
خفیہ طور پر فرعون سے نامہ و پیام کرنے لگا۔ ارمیاہ نبیؑ نے فہمایش کی۔ بغاوت اور سرکشی سے منع کیا
لیکن نوشتۂ تقدیر مٹ نہ سکتا تھا۔ بادشاہ نے فرعون مصر سے معاہدہ کر لیا اور اپنے جلوس کے نویں برس
خراج کی رقم موقوف کر کے کلدانیوں سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔

بابل کی چھاؤنیاں جگہ جگہ قائم تھیں اور زبردست فوجیں شام میں موجود تھیں اُنھوں نے فوراً دھاوا
کر دیا۔ اور یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ مصر نے امداد کی کوشش کی لیکن وہ بے سود ثابت ہوئی۔ اٹھارہ مہینے
محاصرہ رہا اور مصیبتوں کے بادل دن پر دن گہرے ہی ہوتے گئے۔ شہر میں قحط پڑا اور ماں باپ بچوں کو
بھون بھون کر کھانے لگے۔ شہر پناہ میں رخنہ ہو گیا اور لوگوں نے بھاگ کر بیابان کی راہ لی۔ بادشاہ
صدقیاہ نے بھی مع اپنے اعزہ کے شہر سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن وہ مع دوسرے بھاگنے والوں
کے تھوڑے ہی فاصلہ پر گرفتار کر لیا گیا اور شاہ بابل کے حضور میں پیش ہوا۔ بخت نصر نے صدقیاہ کے
بیٹوں کو اُس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیا اور یہود کے سب امراء و شرفا کو قتل کر کے صدقیاہ کی آنکھیں
نکال ڈالیں۔ اور اُس کو زنجیروں سے جکڑ کر بابل لے گئے۔

اب بابل کی خوں آشام فوج یروشلم کی فصیل توڑ کر شہر میں داخل ہوئی۔ ہیکل سلیمانی میں آگ لگادی
ہیکل کے ستون اور حوض جو خدا کے گھر میں تھے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیے۔ شاہی محلات اور تمام عالیشان
عمارتیں مسمار کر دیں اور جس قدر زر و جواہر شہر میں دستیاب ہو سکا لوٹ لیا۔ ساری مملکت کی رعایا لونڈی
غلام بنائی گئی اور یروشلم کا مقدس شہر بے چراغ ہو گیا۔ صرف ناداروں اور زراعت پیشہ لوگوں کو چھوڑ کر

کنعان کی تمام شریف آبادی بابل میں غلامی کی مصیبت اُٹھانے کے لیے بھیج دی گئی۔ ارمیا غریب قیدخانہ میں تھے اور بابلیوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ اُنھوں نے بغاوت سے مخالفت کی تھی۔ اسی لیے وہ غلامی کی ذلت سے محفوظ رہے۔ اُنھوں نے اس مقدس شہر کی بربادی پر ایک دردناک مرثیہ کہا جو آج تک عہدنامۂ عتیق میں "نوحہ" کے عنوان سے موجود ہے۔ اس کے چند مصرعوں کا ترجمہ بطور نمونہ کے درج کیا جاتا ہے:-

وہ بستی جو خلقت سے معمور تھی کیسی خالی پڑی ہے۔
وہ خاتون اقوام بیوہ سی ہوگئی۔
وہ رات کو زار زار روتی ہے اُس کے آنسو رخساروں پر بہتے ہیں۔
اس کے سب پھاٹک سنسان ہیں اس کے کاہن آہیں بھرتے ہیں"
اس کی کنواریاں مصیبت زدہ ہیں اور وہ خود غمگین ہے۔
اس کی اولاد کو دشمن اسیری میں ہانک لے گئے۔
دخترِ صیہون کی سب شان و شوکت جاتی رہی۔

. . . .

خداوند نے اپنے قہر میں دخترِ صیہون کو کیسا بادل سے چھپا دیا؟
اس نے اسرائیل کے جمال کو آسمان سے زمین پر گرا دیا۔
اس نے اپنے قہر میں دخترِ یہوداہ کے تمام قلعے گرا کر خاک میں ملا دیے۔
اس نے فصیل دیوار کو مغموم کیا۔ وہ باہم ماتم کرتی ہیں۔

. . . .

میری آنکھیں روتے روتے دھندلا گئیں میرے اندر پیچ و تاب ہے۔
میری دخترِ قوم کی بربادی کے باعث میرا کلیجا نکل آیا۔
کیونکہ چھوٹے بچے اور شیرخوار شہر کے کوچوں میں بے ہوش ہیں۔

. . . .

سونا کیسا بے آب ہوگیا۔ کندن کیسا بدل گیا
مقدس پتھر تمام گلی کوچوں میں پڑے ہیں
شیرخوار کی زبان پیاس کے مارے تالو سے جا لگی

"بچے روٹی مانگتے ہیں لیکن ان کو کوئی نہیں دیتا۔
"جو ناز پروردہ تھے گلیوں میں تباہ حال ہیں۔
جو بچپن سے ارغواں پوش تھے مزبلوں پر پڑے ہیں
ان کا چمڑا ہڈیوں سے سٹا ہے وہ سوکھ کر لکڑی سا ہو گیا۔

....

اے خداوند! جو کچھ ہم پر گزرا اُسے یاد کر
ہمارے گھر بیگانوں نے لے لیے
ہم یتیم ہیں ہمارے باپ نہیں
ہم نے اپنا پانی مول لے کر پیا
اپنی لکڑی بھی ہم نے دام دے کر لی
غلام ہم پر حکمرانی کرتے ہیں
ان کے ہاتھ سے چھڑانے والا کوئی نہیں
انھوں نے صیہون میں عورتوں کو بے حرمت کیا
اور یہوداہ کے شہروں میں کنواری لڑکیوں کو۔
بزرگوں کی رو داری نہ کی گئی
جوانوں نے چکی پیسی
اور بچوں نے گرتے پڑتے لکڑیاں ڈھوئیں
ہمارا رقص ماتم سے بدل گیا
تاج ہمارے سر پر سے گر پڑا
کوہِ صیہون کی ویرانی کے باعث۔
اس پر گیدڑ پھرتے ہیں
پر تو خداوندا ابد تک قائم ہے
پھر تو کیوں ہم کو ہمیشہ کے لیے فراموش کرتا ہے
ہمارے دن بدل دے جیسے قدیم سے تھے
کیا تو نے ہم کو بالکل رد کر دیا؟

پندار

(جناب مسٹر سلطان حیدر جوش (علیگ) ڈپٹی کلکٹر)

I

پنڈت ہردے نرائن در، سچ پوچھیے تو بی۔ اے کی ڈگری لینے سے پیشتر ہی ایک بیوی کو سپرد گنگا جی کر چکے تھے، جس بیچاری نے اپنی کوئی یادگار انسانی شکل میں ہردے نرائن کے گھر نہیں چھوڑی تھی! اُن کے والد بزرگوار نے بی۔ اے۔ کی تکمیل کے بعد ہی، "آئی۔ سی۔ ایس" کے حصول کے لیے ان کو ولایت بھیجنے میں محض مفارقت ہی گوارا نہیں کی بلکہ اپنے تمام سرمایہ کو ہردے سے عزیز نہیں رکھا! ہردے نرائن در بی۔ اے۔ جب انگلستان میں پہونچے تو نوجوان تھے، بیوی کے طوق سے گلو خلاصی حاصل کر چکے تھے، اور آج نہیں تو کل آئی۔ سی۔ ایس ہونے والے تھے! آئی۔ سی۔ ایس کی ڈگری، انگلستان کے طبقۂ نازک پر عموماً وہی عمل کرتی ہے جو مقناطیس لوہے پر۔ یا شمع پروانہ پر! جسقدر حصول مقصد میں بتدریج آگے بڑھتے جاتے تھے اُسی قدر اُن کو یہ علم بھی ہوتا جاتا تھا کہ وہ طبقۂ ناز کے متلاشیِ زوج افراد میں بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں: مختصراً، اُن کو بی۔ اے۔ سے آئی۔ سی۔ ایس بننے میں نام و نشان، شکل و صورت، عادات و اطوار، غرض ہر اعتبار سے بہت کچھ قطع و برید۔ یا تبادلہ و اضافہ کرنا پڑا۔ گھنی داڑھی اور سیاہ مونچھیں ناموافقت آب و ہوا کے بدولت ہوا ہو گئیں: پنڈت کے لقب نے مسٹر کا جنم لے لیا: ہردے نرائن کو اختصار نے محض ایچ۔ ان۔ بنا دیا: بی۔ اے والے، آئی۔ سی۔ ایس سے مرعوب ہو کر کنارہ کیا اور ساتھ چھوڑ جانے والی بیوی کی جگہ مِس نائنا وڈ نے سنبھالی! قصہ مختصر پنڈت ہردے نرائن جب جہاز سے بمبئی میں اُترے تو سرے پیر تک مسٹر در۔ آئی۔ سی۔ ایس تھے اور اُنکی آغوشِ محبت میں مس نائنا وڈ، مسز در کی صورت میں شریک زندگی تھیں!

یہ اسسٹنٹ کلکٹر ہوئے، جوائنٹ مجسٹریٹ ہوئے اور بالآخر ڈسٹرکٹ جج بنے۔ لیکن ان کے والد بزرگوار جو دراصل دقیانوسی تراش و خراش کے پنڈت تھے ان کی انتہائی آزاد خیالی کی تاب نہ لاسکے اور چند ہی سال میں اُنکا ساتھ چھوڑ کر کسی بہتر قالب میں تبدیل ہیأت کر گئے! کہا جاتا ہے کہ انکو بستر مرگ پہ بھی کوئی خلش تھی تو صرف ہردے کی آزاد خیالی اور مغربی بیوی کی، مگر مسٹر در پر اُس خلش آخری کا کبھی کوئی اثر مرتب نہیں ہوا: یہ چشم بد دور مسٹر در آئی۔ سی۔ ایس ہی رہے! اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں آئی۔

سی - ایس کا نشان امتیاز رکھنے والے افراد ہندوستان کے طول و عرض میں محض انگلیوں پر گنے جانے کی حد تک محدود تھے اور اسی وجہ سے اُن گنے چُنے افراد کی زیادہ تعداد فخر و مباہات کو خود بینی کی حد تک روا رکھتی تھی! مسٹر در بھی اس لحاظ سے اُسی بڑی تعداد میں آتے تھے اور ان کا شمار مستثنیات میں نہ تھا!

مس نانا وڈ جو اب اپنے آپ کو نانا ور لکھتی تھیں انگلستان سے رخصت ہوتے کے وقت مسٹر ور کو تمول کے اعتبار سے خدا جانے کیا کچھ تصور کرتی تھیں! ہندوستان کی گرم آب و ہوا میں کالے اور گورے کا بیّن فرق اُن کی آنکھیں بھی دیکھنے لگیں مگر مسٹر در کا سرشار محبت ہونا اُس امتیاز رنگ کی تلافی معقول حد تک کرتا رہا! بعض اوقات خود مسٹر در کا دماغ بھی یہ احتمال پیدا کیا کرتا کہ ان کی بیوی کو ہندوستان کے یورپین صاحبان باوجود آئی - سی ایس ہونے کے، وہ مساوات آمیز بے تکلفی نصیب نہیں ہونے دیتے ہونگی بیوی کو بھی، مگر پھر بھی ترقی مدارج کے نازک موقعوں پر نانا کا غیر معمولی حد تک مفید ہونا کام آتا لیکن ایسی خوبی تھی جو کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی! مسٹر اور مسز در بہر حال نہایت بے فکری کی زندگی بسر کرتے رہے! زمانے نے بھی ان کے تعلقات باہمی کو تین اولادوں کی صورت میں اور زیادہ جکڑ دیا اور شباب کا ایک چشم زدن میں ہوا ہو جانے والا زمانہ پوری فارغ البالی کے ساتھ گزرتا رہا! آج بھی کلام نہیں کہ مصور حقیقی نے اولاد عطا کرنے کے وقت ہمیشہ صنف حسین کا سانچا ہی استعمال فرمایا! تاہم تینوں لڑکیوں کا نوک پلک سے دلآویز حد تک درست ہونا بھی بجائے خود نہایت اطمینان بخش اور اُمید افزا تھا!

مسٹر در کا شباب صبح کی چاء کے ساتھ صحیفہ پانیر کی باقاعدہ تلاوت میں، جج کی بلند کرسی سے سربرآوردہ وکلا اور بیرسٹروں کی بڑی بڑی - اور بعض اوقات چکنی اور صاف شفاف - گھوڑدوڑوں کے مشاہدے میں، کلب کی سرور انگیز صحبتوں میں، اور پیاری نانا کی کلفت ربا دل آویزی کے احساس میں، دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا! مسز در نے اپنے نرم و نازک رخساروں پر جھریاں پیدا کرنے میں جو حصہ عمر تلف کیا وہ نت نئی اور قیمتی پوشاکیں زیب تن کرنے کے ساتھ ہی مسٹر در کو مقتدر ہستی سے [illegible] بحیثیت آزاد کرنے میں بھی صرف ہوا - اور ہاں یہ کسی قدر [illegible] میں بھی صرف ہوا کہ تینوں صاحبزادیاں مسز در کی حسب منشا تعلیم و تربیت پا رہی تھیں - سوشیلا، سرلا اور کملا کے نام اگرچہ بادی النظر میں تینوں لڑکیوں کے ہندوستانی ہونے کا گمان پیدا کرتے تھے لیکن فی الحقیقت وہ ہندو مذہب سے اسی قدر دور - اور عیسائی مذہب سے اسی قدر قریب تھیں جس قدر اپنی ماں [illegible] تعلیم و تربیت مسوری کے [illegible] کانونٹ سکول میں ہوئی تھی اور وہ لباس، طرز زندگی ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اعتقادات و عمل کے اعتبار سے بھی یورپین ہی کہی جا سکتی

تھیں! مذہبی معتقدات کی فہرست اول تو کشمیری پنڈتوں میں خود ہی مختصر ہوتی ہے پھر یورپ کی تعلیم سے پیدا ہونے والی آزاد خیالی اور مغربی بیوی کی دل و دماغ پر حکمرانی، ان سب باتوں نے مسٹر در کو مذہب جیسی فضول اور غیر ضروری چیز سے استغنا بخشی و بے پروا بنا دیا تھا کہ لڑکیوں کا عیسائی بن جانا انکی نگاہ میں کوئی قابل لحاظ بات نہ تھی! ان سب باتوں کے ساتھ ہی اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُفتادِ طبع کے اعتبار سے ایک لڑکی باپ سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی تو ایک ماں سے۔ اور ایک، ماں اور باپ کے رجحانِ طبائع اور پسند و نفرت کا مجموعہ تھی! ہردے نرائن در۔ باوجود تبحرِ عظیم۔ ذہانت، طعن آمیز بذلہ سنجی، خودداری و توہم کی عجیب معجون مرکب تھے اور نانا و ناقص العقل، تنگ خیال، اور متلون مزاج تھی! وہ اداس ہوتی تو اپنے آپ کو اختلاجِ قلب کا شکار تصور کرلیتی! جب آفتابِ عمرِ شباب کے خطِ نصف النہار سے گزر کر مائل بہ کہولت ہوا تو مسٹر اور مسز در کی عادات میں خشکی و عاقبت اندیشی کی جھلک ایک حد تک پیدا ہونے لگی، پیانو کے شغلہ اور کلب کی تفریح میں بین انتہا پیدا ہو چلا؛ اور بعض بعض اوقات ملازمت سے انتقام کا خیال آنے لگا! مسز در جو شباب کے عالم میں مشغلۂ دل اور مرجعِ جذباتِ لطیف تھیں، گھر کی منتظم اور شریکِ رنج و راحت ہو چلیں، اور مسٹر در پہلے سے زیادہ وقت پانیر کے مطالعہ اور

کتب بینی میں صرف کرنے لگے! تاہم آزاد خیالی یا مذہب سے بیگانگی طبیعت ثانیہ کے طور پر مسٹر در کے دماغ پر حاوی رہی! قصہ مختصر۔ ملازمت کے آخری دور میں پانچ سال متواتر علیگڑھ کے ڈسٹرکٹ جج رہ کر مسٹر در کو با دلِ ناخواستہ ایک دن ججی کی کرسی کو چھوڑنا پڑا! علیگڑھ کے قیام میں انھوں نے جہاں اور انتظامات کیے، ایک نئی کوٹھی دہلی میں تعمیر کرائی؛ ہردے نرائن کا اصلی وطن لاہور تھا، مگر خدا جانے کس وجہ سے انھوں نے اپنی بقیہ زندگی کے لیے ہندوستان کے نئے دار السلطنت کو ترجیح دی! یوں تو علیگڑھ کے حکام اعلیٰ۔ کالے ہوں یا گورے۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے پروفیسروں یا نو زائیدہ مسلم یونیورسٹی کے با اثر و گردن فراز عہدہ داروں کی صحبت و دست برد سے کبھی محفوظ نہیں رہے۔ مگر جج صاحب موصوف بدرجۂ اولیٰ اس سے فیضیاب ہوئے! انکی ذہانت و بذلہ سنجی کی وجہ سے، یا کسی اور وجہ سے، انگلستان کی ڈگری رکھنے والے پروفیسروں، سائنس اور فلسفہ کے لکچراروں اور بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے۔ کے طالب علموں کو جج صاحب کے خالی اوقات پر بہت کچھ دسترس تھی! چند نوجوان لکچرار اور دو ایک ممتاز دسر پر آوردہ طلبا، جج صاحب کی صحبت میں گھنٹوں باتیں کرنے یا برج کھیلنے کی غرض روزانہ نہیں تو دوسرے تیسرے حاصل کرتے رہتے تھے۔ اب جاکر ۱۹۱۸ء کے آخر میں، جج صاحب کے پنشن لینے کے موقعہ پر، کالج کے ٹرسٹیوں کی جماعت سے لیکر یونین کلب

تک، متواتر ایک ہفتہ جج صاحب کی رخصتی
دعوتیں اور جلسے کالج کی دنیا میں ہوتے رہے تھے چنداں
تعجب خیز نہیں

حکومت سے دست کش ہونے کا ردِ عمل ہو یا
مقتضائے سن مسٹر در جب مستعفی ہو کر دہلی پہونچے
اور کشمیری دروازہ والی کوٹھی میں۔ جس کا نام انھوں
نے دروِلا Dur Villa رکھا تھا۔ مستقل طور
پر آباد ہوئے تو در اصل اُس کی چہار دیواری میں
مقید ہو گئے۔ اُن کا بہت زیادہ وقت لائبریری والے
کمرے میں نذر کتب ہوتا تھا اور بہت کم باہر
جانے کے علاوہ وہ بہت کم مسز در کی صحبت
میں بیٹھ کر تفریح دماغ کی کوشش کیا کرتے
تھے۔ مسز در کا مقصدِ حیات اب محض یہ تھا
کہ وہ جلد سے جلد اپنی لڑکیوں کو پروان
پڑھتے اور موٹی سے موٹی چڑیا کو پھانستے دیکھ سکیں
اس دُھن کا علاج آس پاس کی کوٹھیوں میں آباد
ہونے والے گھرانوں سے میل جول پیدا کرنا، اور
تعلیم یافتہ و غیر شادی شدہ نوجوانوں کے متعلق اپنی
معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کرنا تھا۔

دروِلا سے کم و بیش ایک فرلانگ پر ۔۔۔ یا
بہ الفاظِ دیگر، دو کوٹھی بیچ - ایک نو تعمیر شدہ اور بلند
کوٹھی تھی جسکے احاطہ کے دروازہ پر نصب ہونیوالا
پتھر اس کا نام "نسیم منزل" ظاہر کرتا تھا - اس کوٹھی
سے ملحق ایک اور چھوٹی کوٹھی تھی جس میں فی الحال
ہرکشن گوہر اپنی بیوی اور لڑکی کے فروکش تھے !
ہرکشن گوہر اور مسٹر در سے بہت کچھ ربط ضبط تھا اور دونوں
گھرانوں کی بیویاں اور لڑکیاں اکثر ایک دوسرے کی
کوٹھی پر روزانہ جایا کرتی تھیں ! مسز در ہرکشن گوہر کے
ہاں جاتے ہوئے ہمیشہ نسیم منزل کے سامنے سے گزرتیں
اور اکثر ایسی بلند و خوشنما عمارت کے خالی ہونے پر متحیر
ہوتیں ! "نسیم منزل" در اصل محمد نسیم بیرسٹر کی تعمیر کردہ
کوٹھی تھی جو انھوں نے نہایت شوق کے ساتھ اپنے
رہنے کے لیے بنائی تھی : کوٹھی کی تعمیر میں اُنکی ذاتی
خرابی مضمر تھی، یہ جس قدر بنتی گئی وہ خود بگڑتے گئے،
حتی کہ تکمیل تعمیر کے دو ہفتہ کے اندر دنیائے فانی سے
کنارہ کر گئے ! اس حادثہ نے اُنکے پسماندگان کی نظر
میں کوٹھی کی وقعت ہی نہیں زائل کر دی بلکہ اُسے
منحوس بنا دیا اور اس لیے سب نے تہیہ کر لیا کہ بجائے
خود آباد ہونے کے اُسے ذریعۂ آمدنی قرار دیا جائے!
یہی وجہ تھی کہ وہ ایک معقول و متمول کرایہ دار کے
انتظار میں ہر وقت چشم براہ تھی !

نومبر ۱۹ء کی ایک خوشگوار صبح نے مسٹر در کو غیر معمولی
حد تک مسرور کیا کہ وہ لائبریری کی آرام کرسی
کو چھوڑ کر پشت والے ورانڈے میں نکل آئے - اور
گملوں میں سے سر نکالنے والے ننھے ننھے پودوں
میں غالباً مطالعۂ فطرت کی کوشش کرنے لگے ! گلابی
موسم کے ایک خنک اور دبے پاؤں آنے والے
ہوا کے جھونکے نے چہرے، سر اور ہاتھوں پر خصوصاً
اور بقیہ جسم پر عموماً اپنا سرور انگیز لمس دیا ! پھر جی چاہا کہ
مسٹر در ہری بھری اور نازک پتیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے

لگے ! ، کبھی اس پتے پر چمکنے والے شبنم کے موتی کو
چھونے اور کبھی اُس پتی پر نظر آنے والے کالے
پھنگے کو جھاڑنے میں مصروف تھے کہ مسز در اپنے چہرہ
اور لباس کی خدمتِ ضروری سے فراغت حاصل
کرکے اسی طرف نکل آئیں اور یہ کہتی ہوئی مسٹر در
کی طرف بڑھیں (انگریزی میں) "میرے پیارے
مسٹر در ! تم نے سنا ہے کہ "نسیم منزل" کرایہ پر
اُٹھ گئی ؟"

"نہیں۔ میں نے نہیں سُنا !" - مسٹر در نے جواب
دیا۔ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی اُردو کا لباس
پہنانے کا ذمہ دار مصنف ہے !

"تمھیں معلوم ہے کہ کس نے اس کو لیا ؟" -
مسز در نے پھر پوچھا - اور مسٹر در نے اسکے جواب
میں پھر اپنی لاعلمی ایک بے رخی سے اور بغیر کسی دلچسپی کے ظاہر کی !

"تم سننا چاہتے ہو کہ اُس میں کون آ رہا ہے"
مسز در نے پھر کہا

"مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ! البتہ تم
سنانا چاہتی ہو تو میں سننے کو تیار ہوں"۔

اسقدر رضامندی مسز در کے اظہار خیالات
کے لیے کافی سے زیادہ ہمت افزائی تھی ؛ وہ
بولیں "میرے پیارے ! نسیم منزل میں ایک شریف
نوجوان غالباً مع اپنے اعزہ کے عنقریب آنیوالا ہے !
مسز گوہر کل رات کو آئی تھیں اور بتاتی تھیں کہ
پرسوں وہ تعلیم یافتہ نوجوان اپنے ملازمان کے ساتھ
ایک موٹر میں کوٹھی دیکھنے آیا تھا اور کھڑے کھڑے
دو سو روپیہ ماہوار پر اُس نے کوٹھی لے لی ! کہا جاتا ہے
کہ وہ اسی ہفتہ میں آ جائے گا"۔

مسٹر در (ابھی تک پودوں کی طرف متوجہ) "وہ
کس طبقہ کا شخص ہے ؟"

مسز در "کہتے ہیں ایک متمول سوداگر ہے۔ اُس کی ایک
بڑی دوکان لاہور میں ہے اور ایک کراچی میں"

مسٹر در (بغیر کسی دلچسپی کے) "شادی شدہ ہے ؟"

"نہیں !" انتہائے شوق کے ساتھ مسز در
نے جواب دیا "کنوارا ہے 'تعلیم یافتہ ہے' نوجوان ہے' اور
بہت بڑے کاروبار والا ہے ! اسی کی تو مجھکو مسرت ہے !"۔

"مجھے اس میں مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی"

"تعجب ہے ! ہمارے گھر میں تین جوان لڑکیاں
ہوں اور ہم کو ایسے ہمسایہ سے مسرت نہ ہو"

مسٹر در (اب مسز در کی طرف دیکھتے ہوئے) "گویا وہ
میری لڑکیوں کے ارادہ سے یہاں آ رہا ہے ؟"

مسز در "تمھیں کیا ہو گیا ہے ! ارادہ کیسا ! مجھے
میری امید ہے کہ میری لڑکیوں کی تعلیم اور خوبیاں اسے
گرویدہ بنا لیں گی اور خدا نے چاہا تو کوئی نہ کوئی
پروان چڑھ جائیگی ! اسی لیے تو میں یہ بھی چاہتی ہوں
کہ تم جلد سے جلد اُس سے تعارف حاصل کرلو اور
ملنے جاؤ"

"مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا نہ کر سکوں گا !
میرے پاس کوئی زائد وقت نہیں"

"کیا تمھیں اپنی اولاد کی خاطر اس قدر زحمت
کرنا بھی محال ہے ؟" پژمردگی کے ساتھ مسز در نے کہا

"مگر اس کی چنداں ضرورت نہیں" مسٹر ور نے جواب دیا "تم اور تمھاری لڑکیاں شوق سے اس سے ملنے جائیں بلکہ بہتر ہوگا کہ تم بھی نہ جاؤ محض لڑکیوں کو ملنے دو۔ تمھارے جانے میں مجھے احتمال ہوتا ہے کہ وہ تم ہی کو پسند نہ کرلے۔ کیونکہ تمھاری کوئی لڑکی تمھارے حسن کو نہیں پہونچتی!"

"تمھاری نظروں میں میں اب بھی ایسی ہی ہونگی مگر دراصل میں اپنے شباب سے پورے طور پر فائدہ اٹھا چکی۔ تین تین جوان کنواریاں ہوتے کون ماں اپنی جوانی اور حسن کو یاد کرسکتی یا اُس کا تاسف کرسکتی ہے۔ مجھے اب ہر دم انکے حسن و دلآویزی کی فکر ہے۔"

مسٹر ور۔ (مسکراتے ہوے) "ایسی صورت میں خیر تم بھی جاسکتی ہو اور میں تحریری اجازت دیدونگا کہ وہ جس لڑکی کو چاہے شوق سے پسند کرلے البتہ میں کسی قدر اپنی سرلا کی سفارش ضرور کروں گا۔"

مسز ور "واہ! سرلا نہ سوشیلا کے برابر حسین اور نہ کملا کے برابر تیز و طرار! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سرلا کو کس لیے ترجیح دیتے ہو!"

مسٹر ور۔ "یوں تو تمھاری سب لڑکیاں معمولی قسم کی اور کند ہیں مگر سرلا میں کسی قدر ذہانت و متانت کی جھلک ضرور ہے۔"

مسز ور (نہایت پژمردہ چشم و ابروے) "سخت افسوس ہے کہ تم اپنی اولاد کی خود ہجو کرو۔ پھر انکی کون قدر کرے گا؟ تمھیں میرے تنگ کرنے میں کچھ لطف آتا ہے۔ اور میرے ضعیف دل پر رحم نہیں آتا!"

مسٹر ور "میری پیاری! تمھارا یہ خیال صحیح نہیں! میں کبھی تمھیں تنگ نہیں کرسکتا۔ تمھارا دل میری تمام توجہ کا مرکز ہے۔ اس قدر عرصہ تک تمھارے دل کے خوش رکھنے میں میں نے اپنے آرام و آسائش تک کو پس پشت ڈال دیا۔ مجھے تمھارے دل کی بے حد قدر ہے۔"

مسز ور "تمھیں کیا خبر کہ میں اختلاج قلب میں کس درجہ مبتلا ہوں۔"

"پریشان نہ ہو" مسٹر ور نے جواب دیا "مجھے یقین ہے کہ تم اس مرض سے جلد نجات پاجاؤگی اور عرصہ دراز تک مالدار اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے دنیا میں باقی رہوگی!"

"مجھے ایسے نوجوانوں سے مطلب ہی کیا؟ اگر ایسے ایک درجن بھی ہمارے پڑوس میں آباد ہوں تو مجھے کیا، کیونکہ تم اُن سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔"

"نہیں! میری پیاری!" مسٹر ور نے پھر کسی قدر شوخی کے ساتھ کہا "یقین مانو! اگر ایسے نوجوان ایک درجن کی تعداد میں پڑوس میں آباد کریں گے تو میں پھر اُن میں سے ایک ایک سے ملوں گا!"

مصر کے طریقۂ تعلیم پر ایک نظر

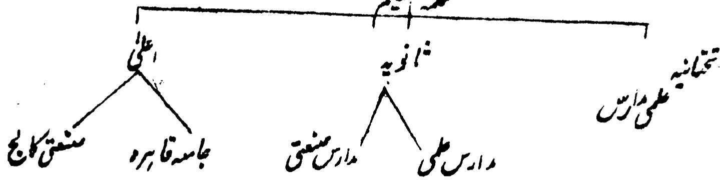
(جناب ریاض الدین احمد صاحب بی اے آنرس ایم اے بی ٹی (علیگ)

(یہ مضمون مسٹر اینی اسمتھ کے اُن خیالات پر مبنی ہے جن کا اظہار اُنھوں نے گذشتہ سال اپنے سفر مصر کے بعد کیا تھا)

مصر مسلمانوں کا ایک مرکز ہے۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے ممالک مشرقی میں اس کی ایک خاص حیثیت ہے۔ یہاں کے تعلیمی حالات کے مطالعہ کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہر ملک کے باشندوں کی طرح یہاں کے لوگ بھی طبقہ اعلیٰ و ادنیٰ میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ اور سررشتۂ تعلیم نے علمی سہولتیں بھی بلحاظ ادنیٰ و اعلیٰ میں قائم کی ہیں۔ طبقہ اعلیٰ کی تعلیم سرکاری مدارس میں حکومت کے زیر نگرانی ایک خاص محکمہ کے ماتحت دی جاتی ہے۔ عوام کی تعلیم کچھ عرصہ قبل تک کسی خاص اہمیت کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھی اور نہ حکومت نے اپنی طرف سے اسکے انتظام میں کسی سرگرمی کا اظہار ہی کیا تھا۔ مگر زمانہ کی روش کے ساتھ یہ حالت بھی بدلی۔ اور بالآخر مصر نے بھی اشاعت و ترقی علم و ہنر کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ باایں ہمہ موجودہ نظام تعلیم ملک کی ضروریات خصوصاً زراعت پیشہ طبقہ کی ضروریات کے لیے قطعی ناکافی و ناموزوں ہے۔ اسی طرح عورتوں کی تعلیم کے لحاظ سے مصر اتنا ہی پیچھے ہے جتنا کوئی مشرقی ملک یا ہمارا غریب ہندوستان ہو سکتا ہے۔ البتہ مصر میں بیداری کے آثار نمایاں ہیں۔ اہل مصر اپنی اس کمزوری کو محسوس کرکے اسکے ازالہ کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ایک قانون بنایا گیا ہے جس کی رو سے ملک کے تمام بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت نے خود اُٹھانے کا ارادہ کیا ہے۔ اور جبریہ تعلیم کا قانون ہر امیر و غریب پر نافذ کردیا گیا ہے۔ اس طریقۂ تعلیم کو کامیاب بنانے کے لیے وزارت تعلیمات کے ماتحت ایک مجلس قائم کی گئی ہے جو اپنی رائے اور تجربات سے ملک کے تعلیمی حوصلوں کو پورا کرنے میں مدد دیگی۔ ایک گذشتہ تحقیقات مظہر ہے کہ مصر میں اُن لڑکوں کی تعداد جن کی عمر ۷ برس سے کم ہے ۲۰۰۰۰۰ ہے۔ اس عمر کے تمام لڑکے آیندہ ۵ سال تک جبریہ اور بغیر معاوضہ تعلیم کے زیر اثر رہیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مصر کے جملہ اسکولوں میں ۱۵۰۰۰۰ لڑکوں کے لیے جگہوں کے انتظام کی ضرورت ہے۔ اور ۲۰۰۰۰ جگہوں کا اضافہ ہر سال ہونا چاہیے۔

مصر میں تعلیم جسکا مقصد زیادہ تر حصول ملازمت ہے، مدارس تحتانیہ سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں کے امتحانات پاس کرنے کے بعد طلباء اوپر کے درجوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اُس وقت انکو اختیار ہوتا ہے

کہ وہ عملی زندگی کے جس شعبہ کو اختیار کرنا چاہیں اُس میں مشق حاصل کریں۔ مدارس ثانویہ سے اعلیٰ کالجوں تک مختلف قسم کی عملی تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ عملی تعلیم کے آخری اور اعلیٰ درجوں کا انتظام جامعہ قاہرہ کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے کالجوں میں کیا گیا ہے۔ تعلیم کے مدارج حسب ذیل نقشے سے واضح کیے جا سکتے ہیں



یہ نقشہ اُن مدارس کا ہے جو حکومت مصر کے ماتحت ملک کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ مگر اسکے علاوہ ایسے مدارس کی بھی کافی تعداد ہے جو صرف حکومت کی مالی مدد سے قائم کیے گئے ہیں۔

۱۹۲۹ء میں مصر میں طلباء کی تعداد حسب ذیل تھی :-

جامعہ

شعبۂ طب	۹۸۲ طلباء
،، قانون	[illegible] ،،
،، فنون	۱۲۳ ،،
،، صنعت و حرفت	۱۵۹ ،،
	۲۷۵۰ ،،

اس کے علاوہ ۱۲۰۰ طلباء اسوقت بیرونی ممالک میں زیر تعلیم تھے

مدارس

اقامۃ الاستاذین	۱۱۱۳ طلباء
مدارس الثانویہ برائے تجارت	۴۰۴ ،،
،، برائے زراعت	۲۱۶ ،،
مدارس۔ طب الحیوانات	۸۰ ،،

مدارس انجینرنگ	۵۰۱	طلباء
" فنون لطیفہ	۱۷۵	"
" صنعت	۲۱۳	"
" تجارت	۴،۲۵	"
مڈل اسکول		
صنعت	۱،۷۰۶	"
زراعت	۷۱۶	"
تجارت	۱،۰۶۷	"
مدارس اثنانویہ	۲۰،۰۸۸	"
" تحتانیہ	۵۹،۴۰۲	

ظاہر ہو کہ اس تعلیم کا مقصد سوائے حصول ملازمت اور کچھ نہیں ہو سکتا مگر اس حصول کو ذلت کی نگاہ سے دیکھنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے کیونکہ تعلیم کا مقصد قوم کو ملکی جذبات سے متاثر ہونے کے لیے تیار کرنا اور ملک کی ترقی کے لیے ایک کارآمد اور ضروری عنصر بنانا ہے اس تیاری کے لیے ایک گونہ معاشی بے فکری و آزادی بہت ضروری ہے لیکن یہ مقصد اسوقت تک قابل تحسین ہے (ا) جب تک اسکا نتیجہ عادات انسانی کو مستحکم کرتا اور قومی و ملکی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے نہ کہ صرف ملازمت کی تلاش (ب) جب تک اس کا نتیجہ تعلیم یافتہ طبقہ پر معاش کا دروازہ کھولتا ہے نہ کہ انکی تعداد کو اس قدر بڑھا دینا کہ انکی زندگی خود وبال دوش ہو جائے (ج) اور جب تک لوگوں کو بحیثیت پیشہ و کاروبار کے مفید اور قابل بناتا ہے نہ کہ ان کی ترقی میں انحطاط پیدا کرنا اور ان کی طبعی پرواز خیال، عزم و تجسس کو متزلزل کر دینا - مگر مصر کا موجودہ طرز تعلیم ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے سے معذور ہے -

مدارس تحتانیہ اور ثانویہ میں لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ ہے - مگر طلباء کی ایک کثیر تعداد کبھی تحتانیہ سے آگے نہیں بڑھتی - وہ بہت جلد فرقہ وارانہ زندگی کے اس دور سے گزرنے لگتے ہیں جس کی بنیاد وہ توں پہلے پڑ چکی ہے اور جس کو اب انہیں دور حاضرہ کے ماتحت تبدیل کرنا ہے - بقیہ طلباء حکومت کے کسی شعبہ میں ملازمت پانے کی امید میں پے درپے امتحانات پاس کرکے مدارس ثانویہ - کالج - یونیورسٹی اور بیرونی تعلیم کے حدود تک پہونچ جاتے ہیں - اس میں شک نہیں کہ نئے مصری اسکول ملک کے لیے قابل تحسین ہیں - اُن کی وسعت اور ساخت زمانۂ موجودہ کے لحاظ سے تمام تعلیمی ضروریات کے لیے کافی ہے - گرشتہ یہاں کی آب و ہوا طلباء کو ایک مخصوص زمانہ میں زیادہ ذوق و شوق سے کام کرنے پر مجبور

کرتی ہے۔ امتحانات بہرحال اس جوش و خروش کی افزایش میں مدد دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ کی تمام قوتیں رفتہ رفتہ سلب ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور آئندہ ترقی مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ طریقہ تعلیم طلبا میں کوئی قابل قدر علمی ذوق پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ طلبا خود اس تعلیم کو حاصل کرنے کی کوشش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کو بہرحال تعلیم حاصل کرنا ہے اور بلا اس تعلیم کے زندگی گزارنا انکے لیے مشکل ہوگا۔ ابھی حال ہی کی ایک تحقیقات مظہر ہے کہ اگر مصر کے تحتانوی اور ثانوی مدارس کے طرز تعلیم میں کوئی تبدیلی ظہور پذیر نہ ہوئی تو روشن خیال و سیاست داں طلبا کا فقدان ہوتا جائے گا۔

سرکاری ملازمت کی امید نے صنعتی و حرفتی کالجوں کی تعداد میں بھی بہت اضافہ کر دیا ہے لیکن تعلیم سے ملازمت حاصل کرنے کی تمناؤں میں درحقیقت ملک کی بہبودی کا عنصر شامل نہیں ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ طلبا کی تعداد ملازمت کی جگہوں سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے اور نوجوانوں کی کثیر تعداد سرگرداں و پریشاں ہے۔ دستکاری کی تعلیم ابھی مصر میں بمقابلہ جرمنی اور دیگر مشرقی ممالک کے محدود ہے۔ اسی طرح زراعت کی تعلیم میں بھی . . . . کافی بے توجہی سے کام لیا گیا ہے۔ اس معاملہ میں مغرب کی کورانہ تقلید نے مصر کو بہت نقصان پہونچایا ہے۔ مصر ایک ایسے موقع پر واقع ہے کہ ایک قابل قدر زراعتی ملک آسانی بن سکے۔ اس لیے اس کی ترقی اور بہبودی کا راز زرعی معلومات کی ترقی میں اسقدر یہاں ہے جس قدر ہندوستان کی ترقی کا راز یہاں کی زراعت میں۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ حکومت نے اس مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اسکی ترقی کے لیے کوشاں ہے لیکن ابھی اس راہ میں بڑی قوتوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اور بڑی مصیبتوں کے بعد یہ منزل طے ہوگی۔ مصر کے طلبا کو اسوقت تک چین کی نیند نہ آنا چاہیے جبتک وہ دریائے نیل کی پوشیدہ دولت کو علم و حکمت کے آلہ سے اپنے اور اپنے ملک کے لیے کارآمد نہ بنالیں۔ جو زراعتی تجربات آجکل مصر میں کیے جا رہے ہیں انکا مستقبل بیشک بہت شاندار اور امید افزا ہے۔

مدارس اور کالجوں سے بہت ارفع قاہرہ کی نو یونیورسٹی ہے جس نے ابھی زندگی کا بہت کم زمانہ دیکھا ہے۔ اس لیے فی الحال اس پر کسی قسم کی تنقید ذرا قبل از وقت معلوم ہوتی ہے۔ پھر بھی اسکے خصوصیات ہمارے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہونگے۔ جامعہ قاہرہ وسطی مشرقی ممالک میں ایک خاص اور نمایاں حیثیت رکھتی ہے اور مشرقی اور مغربی تہذیبوں کو ہم آہنگ کرنے میں سرگرمی سے کوشاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے اساتذہ کا تقرر ملکی اصحاب تک محدود نہیں ہے۔ اور طلبا بھی دور دور کے ملکوں سے یہاں آکر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

قاہرہ پہونچنے کے ساتھ ہی ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر پر فرانسیسی زبان و تہذیب نے کس قدر

تسلط پالیا ہے۔ گو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ملک کو انگریزی تعلیم کی کس قدر ضرورت ہے مگر جامعہ قاہرہ نے مصلحتِ برطانیہ کا پورا خیال رکھا ہے اور اساتذہ کی فہرست میں برطانوی اصحاب کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنیوالے طلبا کی تعداد مصر میں ۲۰۰۰۰۰ ہے۔ مگر سنہ ۱۹۲۵ء کے قانون کی رو سے اور مدارس بھی کثرت سے کھولے جا رہے ہیں۔ موجودہ وزارت تعلیم نے ان مدارس کے تعلیمی اوقات صرف آدھے دن کے لیے مقرر کیے ہیں۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ دن کا نصف حصہ لڑکوں کی تعلیم میں صرف کیا جائے بقیہ نصف لڑکیوں کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اسکے فوائد اقتصادی اور معاشی نظر سے کثیر ہونیکے علاوہ زراعت کے لیے بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ دن کا آدھا حصہ کھیت اور فصل کی دیکھ بھال کے لیے ضروری ہے اگر ایسا نہ ہو تو کسان کے بچے اپنے کاروبار سے نابلد رہنے کے باعث آیندہ چل کر اس سے بالکل مستغنی ہو جائیں اور اُن کا حشر وہی ہو جو غریب ہندوستانی کسان کا ہوتا ہے۔ مگر آدھے دن کا اصول قاہرہ اور اسکندریہ جیسے بڑے شہروں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ جہاں لڑکوں کو غیر پسندیدہ اور ناشایستہ کھیل کود میں وقت خراب کرنے اور اپنے آپ کو برباد کرنے کا موقع آسانی سے مل سکتا ہے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ مصر کی ترقی کا راز صرف وہاں کی زراعت کو فروغ دینے میں ہے۔ لیکن معلوم کر سکے کہ ابھی تک وہاں کے تقریباً ۱۲ لاکھ کسان ایک ایکڑ سے زیادہ رقبہ زمین پر قابض نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ترقی اور تبدیلی کی کس قدر ضرورت اور گنجایش ہے۔ مگر یہ ایک اہم اور مشکل کام ہے جس قدر آراضی اسوقت بلحاظ فی کس زیر کاشت ہے اس میں اضافہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ دو یا زیادہ خاندان آپس میں ملا دیے جائیں اور کاشتکاری کا کام اجتماعی حیثیت سے زمین کے بہت بڑے رقبہ پر کیا جائے۔ مگر اس اسکیم کو عمل میں لانا امر محال ہے اور اگر بالفرض ممکن بھی ہو تو وہاں کے کاشتکاروں کی زندگی حفظانِ صحت کے لحاظ سے بالکل ناقابلِ اطمینان ہے۔ چار میں سے ایک بچہ پیدایش کے سال ہی میں بعد موت کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کی ذمہ دار زیادہ تر جاہل ماں ہوتی ہے۔ اس لیے زراعت اور خانہ داری دونوں کے اعتبار سے عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں کافی انتظام کی ضرورت ہے۔ اس وقت اسکول جانیوالے لڑکوں کی تعداد لڑکیوں سے تقریباً پانچ گونہ زیادہ ہے۔ اسکول کی تعلیم بہت گراں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مصر میں مغربی ممالک کی طرح تعلیم کے گراں ہونے کا سبب کیا ہے۔ سادگی اور آب و ہوا کی درستی تعلیم کے لیے خاص طور پر درکار ہیں مغربی ممالک میں سورج اور ہوا کی اہمیت کو بالکل پس پشت ڈالدیا ہے۔ ضروری نہیں کہ مصر بھی کورانہ تقلید میں اس اہم پہلو کو فراموش کر کے اپنے باشندوں کے جانی و مالی نقصان کا سبب بنے۔

مصر کا بہترین طریقہ تعلیم وہی ہوگا جو دیہاتی زندگی کو خوشگوار اور وہاں کے باشندوں کے لیے پسندیدہ بنانے میں کامیاب ہو مگر حالت موجودہ میں جبکہ وہاں کے رہنے والوں کو خود اسکا پورا احساس نہیں جبکہ اساتذہ کی تنخواہیں بہت قدر قلیل ہیں جبکہ عورتوں کا تعلیمی ذوق بھی پیدا نہیں ہوا ہے لیکن قابل ذکر ترقی عمل نہیں ہوئی۔

ریاض اور خیرآباد

(مولوی عبدالشاہد خاں صاحب شاہد شروانی - ناظم انجمن اشاعت الدین منظر العلوم مدرسہ عربیہ نیاز یہ خیرآباد اودھ)

خدا جانے یہ دُنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی ہزاروں اُٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے مجلس کی (امیرا)

قصبۂ خیرآباد (امرد م خیز) اور گہوارۂ علم و ادب ہونے کے اعتبار سے ہندوستان کے مشہور مقامات کے صف اول میں شمار ہوتا رہا ہے۔ صدیوں سے ماہرین فنون کا مولد و مسکن رہا ہے۔ ایسے ایسے نامور حضرات اس قصبے میں گزرے ہیں جن کی نظیر شاید ہی کہیں ملتی ہو۔ تقریباً ہر فن کے ماہرین اس پاک خطے میں ہوئے۔ چونکہ میرا موضوع علم و ادب ہے اس لیے دیگر فنون کو بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔

علوم دینیہ کی جو خدمت خیرآباد نے کی ہے وہ روز روشن کی طرح ظاہر و باہر ہے۔ ہر صاحب علم جانتا ہے کہ یہی وہ قصبہ ہے جو دو صدی قبل علوم دینیہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

علمی دنیا میں وہ کون شخص ہے جو مولانا حاجی سید صفت اللہ صاحب محدثؒ خیرآبادی کے نام نامی سے واقف نہیں۔ موصوف نے جو فیض طالبین علوم حدیث و فقہ کو پہونچایا۔ اُس کی شہادت موصوف کے قائم کردہ مدرسہ کے کھنڈر اب بھی دے رہے ہیں۔ یہ مقام اب بھی خیرآباد میں مدرسہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور محدث رحمۃ اللہ علیہ کے موجودہ جانشیں مولوی حاجی سید فخرالحسن صاحب علوم عربیہ سے نا آشنائے محض ہونے کے باوجود مولوی اور مفتی کے لقب سے ملقب ہیں۔ قاموس کی شرح کے حاشیہ پر حضرت محدثؒ اور خیرآباد کا حال بھی تھوڑا سا درج ہے۔ حاجی سید فخرالحسن صاحب نے حال میں ایک کتاب شایع کی ہے جس میں اس خاندان کے مفصل حالات مرقوم ہیں۔ ومن شاء فلیطالعہا۔

حضرت محدث علیہ الرحمہ کے بعد آپ کے اخلاف کے بعد دیگرے خدمت حدیث و فقہ انجام دیتے رہے۔ اور یہ سلسلہ تیرہویں صدی کے آخر تک جاری رہا۔ مگر افسوس کہ چودھویں صدی نے اس کی شمع حیات کو گُل کر دیا۔ اسی مدرسہ میں لسان الملک خیام العصر حضرت ریاض مرحوم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ لیکن آج جبکہ میں یہ حالات قلمبند کر رہا ہوں، نہ مدرسہ ہی کا نام و نشان باقی ہے نہ اُس کے سپوت ریاض ہی دُنیا میں موجود ہیں۔ تلک الایام نداولہا بین الناس۔

علوم عقلیہ کی خدمت بھی خیرآباد نے کچھ کم نہیں کی۔ گزشتہ صدی میں خیرآباد سرچشمۂ فیض بنا ہوا تھا جسکی مثال اور کہیں نہیں مل سکتی۔ امام ہمام حضرت مولانا فضل امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی محتاج تعارف

نہیں۔ آپ کی تصنیفات داخلِ نصاب ہیں۔ آپ کے صاحبزادے فخر المتقدمین والمتاخرین علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ایک بحرِ ذخار تھے۔ اس وقت ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس دریا سے سیراب نہ ہوا ہو۔ کوئی مقام ایسا نہیں مل سکتا جہاں آپ کے بالواسطہ یا بلاواسطہ شاگرد نہ ہوں۔ آپ کے بعد آپ کے خلف الرشید شمس العلما صدر الافاضل علامہ عبدالحق خیرآبادی علیہ الرحمہ نے زمام منطق و فلسفہ ہاتھ میں لی۔ اور اس موروثی خدمت کو باحسن الوجوہ انجام دیا۔ ان حضرات کی تصانیف ہندا ور بیرون ہند، مصر وغیرہ میں داخلِ نصاب ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی مسلّم ہے کہ آپ ہندوستان کے خاتم علوم عقلیہ مانے گئے ؎

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے　　　زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے　　　(امیر)

طبقۂ شعراء کے اعتبار سے بھی خیرآباد کسی دوسرے مقام سے پیچھے نہیں رہا۔ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ تینوں زبانوں کے شعراء یہاں گزرے ہیں۔ علامہ فضل حق کے عربی قصائد کی اہمیت کچھ فصحائے عرب ہی جان سکتے ہیں۔ اہل زباں بھی انگشت بدنداں نظر آتے ہیں۔ حضرت دو اشعار ایک قصیدہ کے پیش کرتا ہوں ؎

ومن اطاع الهوی طوعًا و دان له　　　فلا محالة يعصی اللائم الزاری

کم بات فی عضدی من لوعة مله　　　بدرٌ لعا دهلالا لا بدر ابداء

شعرائے فارسی میں زائد تعداد اولیاء کرام کی ملتی ہے جن میں سے تین حضرات کا کلام زائد مشہور اور مقبول ہے۔ ہر ایک کا ایک ایک شعر نقل کرتا ہوں:۔

مخدوم شیخ سعد علیہ الرحمہ ؎

اگر پرسند سعد از عشق او حاصل چہا داری　　　لا متہائے گوناگوں جراحتہائے بے مرہم

حضرت حافظ محمد علی شاہ صاحب مشتاق علیہ الرحمہ ؎

چو گل رخ۔ نرگسیں چشمے بروش سنبلیں زلفے　　　لب نازک تر از لالہ قد سرو روان دارد

حضرت معشوق علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم　　　جسم بگزارم سراسر جاں شوم

یہ آخری شعر ہے جو وفات کے وقت حضرت نے فرمایا تھا۔ مجھے حضرت کی اُردو کی رباعی ایک اور یاد آ گئی ؎

کیا کہیں ہم کہ کیا ہیں ہم　　　مظہر ذاتِ کبریا ہیں ہم
شرع نے کر دیا ہمیں مجبور　　　ورنہ کہہ بیٹھتے خدا ہیں ہم

ان حضرات کے بعد کا دَور بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ منشی قدرت حسین صاحب قدرت، مولوی مظفر حسین صاحب شوخی، منشی بتولی محمد جعفر صاحب زہری۔ منشی بہاری لال صاحب خاوری۔ منشی موہن لال صاحب گرامی۔ مولوی الٰہی بخش صاحب نازش۔ جنابِ والدۂ حضرت مضطر تخلص بہ حرماں اسی دَور کی پیداوار ہیں۔ ان میں ہر ایک اہرِ فن اور یگانۂ روزگار تھا۔ اکثر صاحب تصنیف بھی ہیں۔ زیادہ تر فارسی میں قصائد لکھے۔ آخرالذکر دونوں اُردو۔ فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ میں اس موقع پر ایک ایک دو دو اشعار پیش کروں گا۔ ناظرین خود قدرتِ زباں اور سلاست بیان کا اندازہ فرمالیں :-

قدرت	بیاضِ صبح نورانی ز نورِ عارضش روشن	سوادِ شامِ ظلمانی ظہورِ موے پیچانش
شوخی	دمی نالہ ام کہ دم کشش آہنگِ صور بود	شامِ فراق خندۂ صبحِ نشور بود
زہری	اے بنامِ تو سخن تازہ چو گل	وے بجدِ تو زباہا بلبل
	دلربائی تو بانا(؟) کہ کشد	دل سوے کاکلِ پیچ سنبل
منشی بہاری لال	دود آہ و دلِ ہم پیچیدہ و کاکل ساختند	چوں گلستانِ رخش بر دند و سنبل ساختند
خاوری	چوں احد بر صورتِ احمد عیاں شد در جہاں	عارفاں نامش پیمبر از تجاہل ساختند
گرامی	می تواں جست از زبانِ شمع	قصۂ سوز و سازِ مشتاقاں
	فرہادیستم کہ بسنگے زدہ است سر	از نالہ کوہ را بہ طپیدن در آورم
نازش	اُٹھا تابوت یارب کس حریقِ سوزِ ہجر اس کا	کہ شعلہ آکے کاندھا دے گیا برقِ درخشاں کا
حرماں (والدہ)	نمانہ یار کا کیا تم کو پتہ بتلاؤں	جیسا مشتاق ہو نزدیک بھی ہو دور بھی ہو
مضطر (مرحوم)	نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے	گھُٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے
	جان جانے پہ تو جائے دردِ دل	دمبدم خالق بڑھائے دردِ دل

اب تیسرا دور ملاحظہ ہو جو ایک کامیاب دَور کہا جاسکتا ہے۔ یہ بسمل و مضطر و کوثر و تسلیم و رئیس کا دَور تھا۔ اور سچ پوچھیے تو لکھنؤ کے مدرسۂ شاعری کی عمارت انھیں حضرات کے ہاتھوں مستحکم ہوئی۔ نیز خداے سخن امیر مینائی کے بعد انھیں فرزندانِ خیرآباد نے ہرطرح زبان و ادب کی خدمت انجام دی۔ ہندوستان کے چپہ چپہ پر اپنا ڈنکا بجوادیا کیونکہ ان کی شہرت سات سمندر پار تک پہونچی۔ اور یوروپ میں علم ادب اُردو لہرانے لگا۔ یہ رئیس ہی کا شعر ہے جس پر ولایتی اخبارات میں تبصرے کیے گئے۔ اور پانیر اور سول ملٹری گزٹ نے بھی اپنے کالموں میں جگہ دی تھی۔

عالمِ ہُو میں اک آواز سی آجاتی ہے چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

اس طرح اس آخری دور میں بھی خیرآباد کسی دوسرے مقام سے پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ ایک معنی میں ممتاز ہی رہا۔ ان حضرات کے تلامذہ کا آج مشاہیر میں شمار ہے۔ اور ہندوستان کا گوشہ گوشہ ان کی کارگزاریوں سے واقف ہے۔ اول الذکر چاروں شاعران باکمال کے کچھ اشعار نقل کرتا ہوں۔ حضرات ناظرین خود اُن کی مہارت فن اور اُستادیت کاملہ کو ملاحظہ فرماکر رائے قائم فرمالیں میں صرف وہ اشعار پیش کروں گا جو ہندوستان میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

بسمل مرحوم

عاشق بدنام کو پروا ے ننگ و نام کیا
آپ جو ناکام ہو اُس کو کسی سے کام کیا

ابتدا ے عشق ہی میں ہم گئے جاں سے گزر
ہو محبت کا ہماری دیکھیے انجام کیا

اب لذت زخم جگری پوچھتے کیا ہو
جب تم ہو نمک پاش تو پھر کیوں نہ مزا ہو

آئینہ پیش تو اسے یار رسیدن ندہم
رشک آن ہیں کہ ترا ہم تبہ دیدن ندہم

بسمل چہ ہوس کنی وصالش
او شاہ و تو بے نوا گدائی

اعتبار الملک مضطر مرحوم

اسیر پنجۂ عہد شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

زاہد تو بخشے جائیں گنہگار منہ تکیں
اے رحمت خدا تجھے ایسا نہ چاہیے

شکوہ ہے رفتگان مقام بعید کا
ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا

ہاتھ پاؤں دونوں نکلے کام کے
جا رہے ہوں اُن کا دامن تھام کے

میرے ساقی نے مری قبر پہ آکر مضطر
یہ دعا دی ہے کہ تربت تری میخانہ بنے

میرے مولا بلا لے مدینے مجھے الخ

اس آخری شعر کی مقبولیت کا کیا پوچھنا میرے نزدیک اس کا ذکر ہی بیکار ہے۔ مشرق سے مغرب شمال سے جنوب تک ہر شہر اور ہر گاؤں میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔

کوثر مرحوم

ہاتھ کاٹے گئے آغاز دعا سے پہلے
ہم سزا یاب ہوے جرم و خطا سے پہلے

صدمۂ رشک اُٹھانے کی اسے تاب نہیں
سے لیے تو وہ سے مرے دل کو خدا سے پہلے

عجب خوشنما ہیں مدینے کی گلیاں
حریم خدا ہیں مدینے کی گلیاں

مسکین فقیر کوثر حاضر ہے آستاں پر
جو مانگے وہ دلا دو بندہ نواز خواجہ

اُس کی برچھی میں چھپا ہے جو گلِ لالۂ تر کاش اس پھول کے بدلے دلِ کوثر ہوتا
ہجر میں اک بتِ کافر کے ہوا حال تباہ گو تر آگاہ نہ تھے آہ و بکا سے پہلے

آقائے سخن وسیم مرحوم

پھر نظر تھی زاہدِ خانہ خراب کی ٹوٹی ہے کیا تڑاق سے بوتل شراب کی
میرے گنہ وہ چشمِ کرم میں سما گئے آنکھیں جھپکا کے رہ گئی میزاں حساب کی
کیا سیر ہو کہ اُڑ کے پڑے روئے شیخ پر بوتل کا کاگ اجل کا طمانچہ کہیں جسے
جلوہ گہ میں تری ہر آنکھ سے کہتی ہے یہ آنکھ کاشکہ پائے نگہ میں ترے چھالا ہوتا
رکھیں گی اب کہیں کا نہ پیری کی ٹھوکریں رکھنا قدم وسیم بہت دیکھ بھال کے
وسیمِ حزیں بھی ازل سے ہے شیدا ادھر بھی نظر اے نگارِ مدینہ

لسان الملک سحبان الہند حضرت ریاض علیہ الرحمہ اس دور کی آخری یادگار تھے جو عمر کے لحاظ سے بعض مقدم الذکر حضرات پر مقدم تھے۔ ریاض کی قدر و قیمت کچھ وہی حضرات خوب جانتے ہیں جن کی آنکھوں نے اُن کی شاعری کا شباب دیکھا ہے۔ ریاض نے جو غیر فانی شہرت حاصل کی وہ فقط نام کی شہرت نہ تھی بلکہ حقیقتاً وہ اسی کے مستحق تھے اور کیوں نہ ہو جبکہ آپ یگانۂ روزگار اور امام فن تھے۔

آپ قصبۂ خیر البلاد خیرآباد (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہ ہوسکی۔ آپ کے والد ماجد منشی سید طفیل احمد صاحب ساداتِ کرمانی سے تھے۔ موصوف ایک جید عالم، زبردست مناظر اور فارسی کے ماہر تھے۔ انسپکٹری کے عہدہ پر مامور تھے۔ ریاض نے اپنے پدر بزرگوار سے فارسی وغیرہ پڑھی پھر آپ نے خیرآباد کے قدیم مدرسہ (جس کا ذکر میں ابتدا میں کرچکا ہوں) میں پڑھنا شروع کیا۔ علم عربی کی تحصیل شروع کی۔ ابھی آپ شرح جامی اور شرح وقایہ ہی تک پہونچے تھے کہ فطرت نے اپنا اقتدار حاصل کرلیا۔ چونکہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا۔ اس کلیہ کے تحت میں ریاض کی منچلی طبیعت نے منچلا نہ بیٹھنے دیا۔ اور شعر گوئی کا شوق ہو ہی گیا۔ اور اس شوق نے یہاں تک ترقی کی کہ تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ خیرآباد کو بھی خیرباد کہلا دیا۔ اُس وقت نواحِ لکھنؤ میں حضرت اسیر کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی فن سے کامل ذوق رکھتا ہو وہ کسی کامل الفن ہی کی تلاش کرتا ہے اور جہاں تک ہو سکتا ہے اُس سے فیض حاصل کرتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ سیدھے لکھنؤ پہونچے اور اسیر مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں انکی خوش طبعی نے اُستاد کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اکثر مواقع پر اُستاد خود اس فطری شاعر کے مداح نظر آنے لگے۔ چھ برس تک متواتر مستفیض ہوتے

رہے۔ اس لحاظ سے ریاضؔ، امیرؔ اور جلالؔ کے معاصر تھے۔ جب استاد نے داعیِ اجل کو لبیک کہا تو
اس فخرِ استاد شاگرد نے استاد کے جانشین عمدۂ سخن حضرت امیرؔ مینائی علیہ الرحمۃ کی طرف رجوع کیا۔ امیرؔ
مینائی مرحوم نے اپنے استاد بھائی کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ غرضکہ تا زیست امیرؔ کی اطاعت گزاری کی۔
اسی کا نتیجہ تھا کہ امیرؔ کے بعد جب جانشینی کا سوال پیدا ہوا تو ملک کی نگاہیں ریاضؔ پر پڑنے لگیں۔ بلبلِ
ہندوستان حضرتِ داغؔ دہلوی مرحوم نے جو خط لکھا اس میں اس کی پرزور تحریک کی اور پتے پر ریاضؔ
جانشینِ امیرؔ لکھا۔ ریاضؔ ایک آزاد طبیعت انسان تھے وہ ہر قسم کی پابندی سے بھاگتے تھے۔ وہ اچھی
طرح سمجھتے تھے کہ اگر یہ افتخار حاصل ہو گیا تو مصیبت کا سامنا ہوگا۔ کس طرح درباروں کی حاضری ہو سکے گی۔
اور کس صورت سے فرائضِ جانشینی انجام دے سکوں گا۔ ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ریاضؔ نے
اس تحریک کی اپنے لیے تائید گوارا کی اور ساتھ ہی ساتھ نواب فصاحت جنگ حضرت جلیلؔ کے لیے خود پرزور
تحریک کی۔ چنانچہ حضرت جلیلؔ مدظلہٗ جانشین تسلیم کر لیے گئے۔ اور ریاضؔ جس طرح کی آزادی چاہتے تھے۔
انھیں ہمیشہ حاصل رہی۔ ریاضؔ کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ اس پرآشوب زمانے میں مہاراجہ سرکشن پرشاد
بہادر مدار المہام دولتِ آصفیہ حیدرآباد دکن کے کئی بار طلب فرمانے کے باوجود حیدرآباد نہیں گئے۔ ظاہر
ہے کہ حیدرآباد پہنچنے کے بعد ریاضؔ کے لیے مہاراجہ کیا کچھ نہ کرتے۔ مہاراجہ کو ریاضؔ سے جو عقیدت
تھی اس کے لیے اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ سنہ ۳۲ء میں جب مولانا حاجی محمد مصطفیٰ خاں صاحب مالکِ
کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ حیدرآباد تشریف لے گئے اور مہاراجہ سے ملے تو مہاراجہ نے لکھنوی شعراء
میں صرف ریاضؔ کا ذکر کیا اور متعدد اشعار بھی سنائے۔ جیسا کہ حاجی صاحب موصوف کے ان مضامین
سے ظاہر ہوتا ہے جو آپ نے اخبار "حقیقت" لکھنؤ میں شایع کیے تھے۔ مہاراجہ محمود آباد نے جو قدر افزائی
کی اس کا جواب نہیں ملتا۔ علاوہ داد و دہش کے مبلغ للعہ روپیہ ماہوار آخر تک ریاستِ عالیہ سے
ملتے رہے۔ مہاراجہ نے کیا کچھ نہ کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ممدوح کے انتقال کے بعد ریاضؔ فرمایا کرتے
تھے کہ "مہاراجہ کا انتقال نہیں ہوا [illegible]۔ ریاضؔ مر گیا"۔ مہاراجہ نے متعدد بار لکھنؤ میں قیام کی تحریک کی مگر
ریاضؔ کو نہ خیرآباد چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ بالآخر ۹۰ برس کی عمر میں ۲۸ ربیع الثانی [illegible] روز دوشنبہ
بوقت ۴ بجے شام اپنے وطن ہی میں راہیِ خلدِ بریں ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ دنیا کی آنکھوں
سے ایک درخشندہ آفتاب اوجھل ہو گیا۔ مگر ان کے کارنامے فراموش نہیں کیے جا سکتے۔

ریاضؔ نے ۱۲۹۶ھ میں بہ عنفوانِ شباب "ریاض الاخبار" گورکھپور سے نکالا جو ایک مدت تک کامیابی
سے چلا۔ اسی [illegible] "فتنہ" [illegible] ہی نکالا۔ "فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" بھی نہایت آب و تاب سے نکلا کیے۔

گلکدۂ ریاض اور گلچیں نے بھی خوب خوب خراجِ تحسین وصول کیا۔ حرم سرا ناول لکھا جس کی زبان کی خوبیاں بیان سے باہر ہیں۔ ناشاد ناول بھی آپ ہی کی تصنیف ہے جو نظارہ ناول خالص اُردو زبان میں ہے جس میں شروع سے آخر تک کہیں فارسی ترکیب نہیں مل سکتی۔ ان سب کے متعدد ایڈیشن نکلے اور فروخت ہوئے۔ ریاض نے مرگِ غالب ایک دیوان عہدِ شباب میں لکھا جو بالکل غالب کے رنگ میں تھا۔ بعد میں کسی وجہ سے موصوف نے نذرِ آتش کر دیا۔ اس کا ایک شعر مجھے یاد ہے جو پیش کرتا ہوں۔ اس شعر میں جو فلسفہ بھرا ہوا ہے اُسکو فلسفی اور منطقی ہی خوب سمجھ سکتے ہیں فرماتے ہیں

ترے امکان لایمکن کے تصدیقِ تصور سے — نگارِ کن ہوا آئینہ خانہ بزمِ حیرت کا

ایک دیوانِ مکمل چوری ہوگیا جس کا مرحوم کو آخر دم تک صدمہ رہا۔ اس کے بعد کے دو دیوان مکمل اس وقت گورکھپور میں موجود ہیں جو انشاءاللہ جلد سے جلد علۂ طبع سے آراستہ ہو کر ہمارے ہاتھوں میں ہونگے۔ ایک دیوان میں صرف غزلیات ہیں اور دوسرے دیوان میں قصائد۔ قطعات۔ نظمیں۔ اور سہرے ہیں۔ اب تک یہ دونوں دیوان شایع ہو چکے ہوتے مگر ریاض امروز فردا پر ٹالتے رہے۔ خدا کی مرضی یہی تھی کہ اُنکے سامنے شایع نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ریاض کی ادبی قابلیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت امیر مینائی مرحوم کے دیوان کی طباعت کے بعد مختلف اعتراضات اُن کے اشعار پر ہوئے۔ مگر سب کا جواب ریاض نے دیا۔ مولوی غلام محمد صاحب اڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ ایک جیدِ عالم اور انتہائی قابل تھے۔ موصوف نے بھی اعتراضات کیے۔ جنکے جوابات دیے گئے۔ مگر کچھ دن کے بعد اُنھوں نے ایک اعلان شایع کیا جس میں لکھا کہ مجھے دیوانِ امیر کے مختلف اشعار پر اعتراض ہے، جو شخص جواب دے میں مشروط طریقہ پر اُس کا فیصلہ کروں گا۔ ریاض نے بذریعہ اخبار جواب دیا کہ میرے پاس فضول وقت نہیں جو ضائع کروں۔ جتنے اعتراضات ہوں اُن سب میں جو اعتراض سب سے زیادہ اہم اور وقیع ہو وہ لکھیے۔ اگر میں اُس کا جواب دیدوں تو آپ ہارے میں جیتا اور عمر بھر کا قصہ ختم ہوا۔ اور اگر میں جواب نہ دے سکوں تو میں ہی نہیں بلکہ میری ساری جماعت ہاری اور آپ جیتے۔ اس کے جواب میں مولوی غلام محمد صاحب نے یہ شعر لکھا

ٹانکوں کا دیا حکم تو بولے دہنِ زخم — سلواتے ہو کیوں قابلِ سیون تو نہیں ہم

اور یہ اعتراض کیا کہ قابل عربی ہے اور سیون اُردو ہے۔ عربی یا فارسی کی اضافت اُردو کی طرف نہیں ہوتی نہ آج تک کسی نے لکھا ہے۔ ریاض نے اس کے جواب میں یہی شعر نقل کیا اور سیون پر چاء کی پیالی کے برابر تین نقطے لگائے اور لکھا کہ یہ شیون ہے سیون نہیں۔ کاتب کی غلطی سے نقطے رہ گئے۔ اور یہ آپ کی قابلیت

ہے کہ آپ اسے سمجھ نہ سکے، اچھا اب میں سمجھائے دیتا ہوں کہ سیون کے تو کوئی معنی ہی نہیں بنتے، نہ اسکا یہ محل ہو سکتا ہے۔ مطلب شعر کا صاف ہے کہ جب کسی کا منہ بند کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آواز نہ نکل سکے اور آہ وزاری، نالہ و فریاد نہ کر سکے۔ دہنِ زخم زبان حال سے کہتے ہیں کہ ہمارے سلوانے سے کیا نتیجہ، ہم میں نہ طاقت گویائی ہے نہ تاب آہ وزاری۔ ہم ویسے ہی خاموش ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ڈاکٹر غلام محمد صاحب اڈیٹری چھوڑ کر اپنے وطن تشریف لیگئے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قابل اور سنجیدہ شخص اپنی بات کا جواب پالیتا ہے تو اس پر غم و غصہ کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اس کو تسلیم کر لیتا ہے۔ یہ ضدی اور کج فہم لوگوں کا خاصہ ہے کہ بات ماننے کے بجائے اپنی ہٹ پر قائم رہیں۔ اس قسم کے ہزاروں واقعات ملیں گے کہاں تک عرض کیا جائے۔ یہ تو ریاض کے ادبی کارنامے تھے۔ اب میں دوسری طرف رجوع کرتا ہوں۔

ریاض الاخبار اور ڈپٹی کمشنر گورکھپور سے کسی بات پر ان بن ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ہوئی ڈپٹی کمشنر سے ان سے چند باتیں ایسی سرزد ہوئیں جن سے ہندو مسلم دلآزاری ہوتی تھی۔ مثلاً ایک مسجد کو باورچی خانہ بنا رکھا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ریاض الاخبار نے اچھی طرح مخالفت پر کمر باندھی۔ اور گورنر صاحب بہادر کے پاس ایک درخواست بھیجی جس پر کئی ہزار سربرآوردہ اشخاص اور پبلک کے دستخط تھے۔ یہ زمانہ سرانٹونی مکڈانلڈ کا تھا۔ نہایت باخبر اور منصف مزاج گورنر تھے۔ گورنر صاحب دورہ پر نکلتے ہیں، بنارس سے اعظم گڈھ پہونچتے ہیں۔ ایک درخواست پھر گورکھپور سے ڈاکٹر ہوئی کے مظالم کی پہونچی۔ گورنر صاحب گورکھپور چل دیتے ہیں۔ ریاض نے اس زمانہ میں منشی عبداللہ حسرتی کو بعض مصالح کی بنا پر اڈیٹر بنا دیا تھا۔ حسرتی ایک دلیر اور زبردست انشا پرداز تھے۔ ادھر گورنر صاحب آئے اور ادھر یہ انتظام کیا گیا کہ شہر میں مکمل ہڑتال کی جائے۔ چنانچہ گورنر صاحب تشریف لاتے ہیں اور کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ آدمی بھیجا جاتا ہے۔ بازار بند ملتے ہیں۔ ہڑتال کی وجہ پوچھی جاتی ہے۔ پبلک ڈپٹی کمشنر کی زیادتیاں بیان کرتی ہے۔ گورنر صاحب ایک تحقیقاتی بورڈ قائم کر دیتے ہیں۔ (بہر حال پھر جو کچھ بھی ہوا ہو) مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ آج بات بات پر جو ہڑتال کر دی جاتی ہے۔ جہاں کوئی بڑا آدمی مرا اور مکمل ہڑتال ہو گئی، گورنمنٹ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی اور ہڑتال کر دی گئی، یہ سب ریاض ہی کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں پہلا وہ شہر جہاں مکمل ہڑتال ہوئی گورکھپور ہے۔ اور ہندوستانی ہڑتال کا پہلا موجد ریاض ہے۔ اس سے پہلے شاید ہندوستانی ہڑتال کے لفظ سے بھی واقف نہ ہونگے۔ ریاض کا یہ ایسا کارنامہ ہے جسے آب زر سے ریاض کے نام کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔ مگر یہ کام زندہ قوموں کا ہے، مُردہ قوم کیا کر سکتی ہے۔ کاش ریاض کسی ترقی یافتہ ملک اور زندہ قوم میں پیدا ہوتے۔

اسی زمانے میں منشی عبداللہ حسرتی نے ریاض الاخبار کے ضمیمہ کے طور پر ایک کتاب لکھی تھی جس کی۔

مقبولیت اس درجہ کو پہونچی کہ سیکڑوں کی تعداد میں روز "وی پی" روانہ کیے جاتے۔ ہندو مسلم سب کی نظروں میں وہ کتاب مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔ پہلے "وی پی" کا قاعدہ یہ تھا کہ جب مکتوب الیہ کے پاس سے قیمت آتی تھی تب ڈاکخانہ وی پی کا محصول مجرا کرتا تھا۔ جب ڈاکخانہ والوں نے یہ مصیبت نازل ہوتے دیکھی کہ کسی وقت "وی پی" لکھنے سے فرصت نہیں ملتی تو ایک درخواست دی کہ دو ایک منشی اور بڑھا دیے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن پھر بھی کوئی کمی محسوس نہ ہوئی، تو دوبارہ درخواست دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "وی پی" کا محصول پیشگی لیا جانے لگا۔ جو اب مستقل قانون ہے۔ یہ بھی ریاض ہی کا کارنامہ ہے۔ میں آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا، آپ خود سمجھ لیں کہ ریاض کیا تھے؟ اور ان کی ہستی کس قدر مہتم بالشان تھی۔ یہ واقعات مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ ریاض کی سوانح لکھنے کے لیے کافی وقت اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ دوسرے اس کے واسطے مستقل کتاب چاہیے۔ بہرحال ریاض ایک صدی کی زندہ تاریخ تھے جس نے سیکڑوں جزر و مد دیکھے ہوں گے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مشرقی تہذیب کے غالباً آخری نمونہ تھے۔ (باقی)

جہانِ آرزو

(جناب منشی سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

نکل کے بھی جو نہ نکلے وہ حوصلا نہ کرے
یقین نہ ہم نے گر نظر خطا نہ کرے

کرے تو وعدہ قسم کھا کے اور وفا نہ کرے
کیا جو تم نے ہم ایسا کریں خدا نہ کرے

یہ شوخی اس کی مری موت ہے مگر عجیب
جو وعدے کرتا ہے اور سامنا نہ کرے

جمالِ خاص بصیرت کی حد سے دور رہی
ہٹے نہ آنکھ جہاں تک نظر خطا نہ کرے

رضائے دوست کے تابع بنا کے رکھا ہے
نہیں تو یہ دلِ خانہ خراب کیا نہ کرے

مرض نے عشق کے پیدا کیا ہے یاں وہ مزاج
ضرر ہو زہر کا باطل اثر دوا نہ کرے

وہ بامراد ہے یا نامراد کیا کہیے
اثر زباں میں جو رکھتا ہو اور دعا نہ کرے

جو ہوا کبھی پلٹے گی رخ زمانے کا
ہم آہیں کرتے رہیں گے وہ اعتنا نہ کرے

کہاں شریعتِ الفت کہاں عنایتِ ترک
اکیلے کی ہے وہ ہمت کہ دوسرا نہ کرے

دعا بھی باب اجابت پہ کشمکش میں پھنسی
خدا کرے میں کہوں وہ کہے خدا نہ کرے

سکونِ دل ہے محبت میں مرگِ ناکامی
بس آرزو یہ دوا کام زہر کا نہ کرے

اصطلاحات فلسفہ پر تنقید

(بسلسلۂ الناظر ماہ اپریل)

(جناب مولوی محمد اجمل خاں صاحب ایم اے، ایل ایل بی۔ وکیل)

ضمیمہ نمبر ۳ ۔ اصطلاحات نفسیات

اصطلاح انگریزی	ترجمہ
Active Touch	لمس فعلی
Activity	فعلیت
Adaptation (to conditions)	تطابق
Affinity	تعلق، رشتہ
Aggression	حملہ
Alimentary Canal	غذائی نالی
Alteration of personality	شخصیت کی تبدیلی
Ambition	حرص، جاہ طلبی
Amnesia	نسیان
Amorphous characters	بیقاعدہ شکل والے
Aaesthesia	کم حساسی، خنک، سُن ہو جانا۔
Anger	غضب
Animism	روح پرستی
Approbation	پسندیدگی
Apathy	نفرت۔ بے پروہ
Antipathy	مخالفت، [illegible]

اصطلاح انگریزی	ترجمہ
Arrest (of development)	رکاوٹ۔ روک
Assimilation	انجذاب۔ کشش
Attention	توجہ
— Sensorial	— احساسی
Oscillation of attention	لرزش توجہ
Span of —	عرصۂ توجہ
Derived —	توجہ مشتق
Threshold of —	باب توجہ
Training of —	تربیت توجہ
Altraction	کشش
Avarice	لالچ۔ حرص
Aversion	کراہیت
B	
Bacteria	جراثیم
Beneficence	سخاوت
Blind Impulse	اندھا دھند ہیجان

English	Urdu
Blushing	جھینپنا۔ شرمانا
Brain function	فعلِ دماغ
Body	جسم
Bryozoa	ادنیٰ گھونگھا
Cannibalism	آدم خوری
Chemical action	عمل کیمیائی
Chloroform	دارو بےہوشی
Clan	قبیلہ
Combination	ملاوٹ۔ آمیزش
Complex	مضاعف
Composition	بناوٹ
Conditioned	شروط
Conflict	اختلاف
Contact	اتصال
Consciousness	آگہی۔ ہوش
focus of ——	مرکز آگہی
margin of ——	حاشیہ آگہی
field of ——	میدانِ آگہی
threshold of ——	بابِ آگہی
Conservation	تحفظ
Capacity	ظرفیت۔ وسعت
Compassion	رحم۔ شفقت
Compunction	پشیمانی
Convergence	جھکاؤ
Cramming	رٹنا۔ ٹھونسنا
Cramp	اینٹھن
Culture	سلیقہ۔ تربیت

D

English	Urdu
Deaf-mute	بہرا۔ گونگا
Decay of feelings	زوال احساسات
Deliberation	تامل۔ تفکر۔ سوچ
Depravation	خرابی۔ کمی
Development	ترقی۔ تدریج۔ ارتقا
Differentiation	تفریق۔ امتیاز
Diffustion	انتشار۔ پھیلاؤ
Dipsomania	جنون۔ شرابخواری
Discriminative Sensibility	احساس امتیازی
Disposition	مزاج
Disinterested Emotion	جذبۂ بے غرض
Double Contact	لمس دوگونہ
Domination	غلبہ
Duration of Sensation	مدتِ احساس
Dynamometer	قوت پیما
Dynamo-metric Experiments	تجربات قوت پیمائی۔
Ecstacy	حالتِ وجد
Emotional mood	جذباتی کیفیت
Endogamy	اپنے کفو میں شادی کرنا۔

English	اردو
End-state	حالتِ غائی
Epilepsy	مرگی
Evanescence	ناپائداری
Evolution	ارتقا
Exaltation	سرافرازی
Experience	تجربہ
Expression	اظہار
Extension	وسعت
External	خارجی (مادی)
Function	عمل
Fatigue	تکان، تھکن
Fear	خوف
Fetishism	عجائب پرستی
Feeling	حاسہ۔ احساس
Vital ——	احساس حیاتی
massive ——, Voluminous ——	احساس گراں
Feeling tone	حالتِ احساس
Forgetfulness	غفلت۔ بھول
Friendship	دوستی
Genius	طباع
Gross	کثیف۔ وزنی
Harmony	ہم آوازی
Hate	نفرت

English	اردو
Hope	اُمید
Hunger	بھوک
Humble	مسکین۔ خاکسار
Humour	رطوبتِ مزاج
Hysteria	اختناق الرحم
Ideal self	خیالی انا
Ideal Sentiment	خیالی میلان
Identity	یکسانیت
Idio-motor	خیالی حرکتی
Idiot	غبی۔ بیوقوف
Inattention	عدم توجہی
Inhibition	رُکاوٹ۔ ممانعت
Infantilism	علم الصبیان
Innervation	تقویت
Intellection	سمجھ
Integration	تکمیل
Interaction	معاکست
Interrogation	استفہام
Internal feeling	احساسِ داخلی
Kinaesthetic Sensation	حرکتی جمالی احساس
Knowing	جاننا۔ علم
Law of relativity	قانونِ اضافت
Learning by Experience	علم بالتجربہ

English	اردو
Level	سطح
Localisation	تعین مقام
Love - animal	حب حیوانی
Lymphatic	لمفی - کاہل
Magic	جادو
Mania	خبط - جنون سنک
Mass	مادہ
Matter	مادہ
Mechanical theory of nature	قدرتی مکانکی نظریہ
Medium activity	فعلیت [illegible]
Melancholia	الیخولیا
Melancholy	اداسی
Mixture	آمیختہ
Motor adaptation	حرکتی تطابق
Motor perception	حرکتی تصور
Notion	گمان
Nausea	کراہت - متلی
Need	ضرورت - احتیاج
Note-deafness	سُر بہرا پن
Nutrition	غذا
Object	شے
Observation	مشاہدہ
Obsession	[illegible] - ستانا
Obstinacy	ضد - ہٹ

English	اردو
Odour	بو
Orator	جادو بیان
Organic Sensation	حاسہ عضوی
" Correlation	تناسب عضوی
Parallelism	متوازیت
Passive touch	لمس مجہول
Polymorphic	کثیر الصور
Phrenology	نفسیات دماغ
Present	موجود - حاضر
Presentation	استحضار
Preservation	حفاظت
Primary qualities	جواہر - صفات اولیہ
Primitive emotions	بنیادی جذبات
Psychophysics	نفسیاتی طبعیات
Reaction	ردِ عمل
— time	وقفہ ردِ عمل
Reality	حقیقت
Recognition	شناخت
Red-integration	تکمیل
Reflection	غور - تفکر
Repitition	دوہرانا
Rest	سکون
Resignation	توکل
Reverence	تعظیم
Revival	احیاء

اصطلاح انگریزی	ترجمہ	اصطلاح انگریزی	ترجمہ
Ruling passion	جوش حاکم	Somnombulism	خواب خرامی
Secondary qualities	صفات ثانویہ۔ اعراض۔	Tact	چال
		Tactful	چالباز۔ چالاک
Self Consciousness	خود آگہی	Tear	آنسو
Self projection	خود الیدگی	Temparament	مزاج
Sense memory	یاد احساس	Temperate	معتدل
Sensibility	حسیت	Temperature	حرارت
Sensori motor	حسی حرکت	Tenderness	نرم دلی
Sentiment	وجدان	Tendency	رجحان
Solidurity	یکجہتی	Terror	ڈر
Spontaniety of interest	روانئ توجہ	Thought	اندیشہ۔ تخیل
		Tongue	زبان
Stereoscope	سیٹراسکوپ	Touch	لمس
Spiritism	روح پرستی	Trace	نشان
Suicide	خودکشی۔ انتحار	Truth	صدق۔ سچ
Stability	پائداری	Vascular reflex	رگوں کی تحریک
Static	سکونی	Vision	نظر
Suffocation	دم گھٹنا	Vital	حیاتی
Surprise	تعجب	Will	مرضی
Suspicion	شک	Wit	ذکا
		Wonder	حیرت

ضمیمہ ۴ اصطلاحات مابعد الطبیعیات

اصطلاح انگریزی	ترجمہ	اصطلاح انگریزی	ترجمہ
Abrogation	تنسیخ	Acatalepsy	تشکیک

Acomist	منکر وجود عالم
Actual	بالفعل
Adept	اکسیر گر۔ مہوس
Adoration	بھگتی، پرستش، محبت
Agnoilogy	جہلیات
Agnosticism	لاادریت
Analogousness of being	تشابہ ہستی
Animism	روح پرستی
Anthropomorphism	انس الہیت
Anima Mundi	روح عالم
Appearance	صورت
Archelogy	علم الاصول
Archetype	صورت ابتدائی
Atheism	انکار۔ کفر
Assumption	مفروضہ
Atom	ذرہ
Atomism	ذریت
Attribution	توصیف نسبت
Automaton	کل مشین
Automatic	خود کرد
Autmatism	آلی فعلیت
Autonomy	آزادی۔ خود مختاری

B

Beauty	جمال
Beautiful	جمیل
Being	ہستی۔ وجود

C

Certainty	جزم۔ یقین کامل
Change	تبدیلی
Continuity	روانی۔ تسلسل
Contingency	شرط
Cosmogony	علم تخلیق عالم
Cosmography	تشریح عالم
Cosmology	نظریہ عالم
Creation	آفرینش
Critique / Criticism	تنقید۔ تنقیدیت

D

Daemonism	بھوت پرستی
Deist	یزدانی
Deism	یزدانیت
Demiurge	معمار قدرت۔ خدا
Demon	بھوت۔ دیو
Determinism	جبر
Discovery	ایجاد
Di-theism	دو یزدانیت
Dogma	عقیدہ
Dogmatism	اعتقادیت
Doubt	شک
Duration	مدت۔ زمانہ

English	اردو
E	
Ecstacy	عالتِ وجد
Election	انتخاب
Emanation	خروج۔ ظہور
Empiric	تجربی
Empiricism	تجربیت
Entelechy	حصول تام
Enthusiasm	سرگرمی
Ens	انس (وجود)
Entity	جوہر
Esoteric	تعلم عوام
Exoteric	تعلم خواص
Existence	ہونا۔ ہستی
Experimentum Crusis	تجربۂ آخری
Externality	خارجیت
F	
Faculty	قوتِ نفس
Faith	ایمان
Fancy	وہم
Fatalism	تقدیر پرستی۔ گرا
First cause	سببِ اول
Formalism	صوریت
G	
Genius	قدرتی قوت
Gnosticism	ادریت

English	اردو
H	
Harmony	یکسانیت
I	
Immaterism	غیر مادیت
Impossible	محال
Indefinite	غیر متعین
Innate	پیدائشی۔ جبلی
M	
Materialism	مادیت
Maxim	علم متعارف
Magnetism	مقناطیسیت
Metempsychosis	قالب بدلنا
Monotheism	وحدانیت
Misticism	تصوف
N	
Necessity	جبر
Norm	قانون۔ غایت
Numenon	امر
Optimism	زندہ دلی خوشحالی
Organ	آلہ
Outness	خارجیت
P	
Parallelism	متوازیت
Perfection	کمال
Phenomenon	مظہر

Philosophy	فلسفہ، حکمت
PolyTheism	شرک
Potential	بالقوۃ
Possible	ممکن
Pragmatism or Humanism	انسی تجربیت
Sensism. Sensationalism Sensualism	مذہب الحسی، حسیت
Socialism	اشتراکیت
Spiritism	روح پرستی
Spiritualism	روحانیت
Symbolism	تشبیہ
T	
Tabul Rasa	لوح سادہ
Theism	یزدانیت
Traditionalism	تقلیدیت، مدرسۂ تقلیدیہ
U	
Ubiety	موجودگی
Uniqueness	یکتائی
Unitarian	توحیدی
V	
Vitalism	حیاتیت

مجذوب کی بڑ

(جناب خواجہ سید عزیز الحسن غوری صاحب مجذوب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس)

بیاں ادنیٰ سا فیضِ صحبتِ پیرِ مغاں کردوں ۔۔۔ جو گر جاؤں میں سجدہ میں زمیں کو آسماں کردوں
کرو تم ظلم اور میں ترکِ فریاد و فغاں کردوں ۔۔۔ زباں رکھتے ہوئے اپنے کو کیونکر بے زباں کردوں
خودی کو بھی فنا کردوں مٹا دوں بے نشاں کردوں ۔۔۔ اُڑا دوں جامۂ ہستی کے پُرزے دھجیاں کردوں
جو میں جوشِ جنوں میں خاک اُڑا کر اک فغاں کردوں ۔۔۔ تو گردوں کو زمیں کردوں زمیں کو آسماں کردوں
میں اپنے رنگ میں زاہد اگر ذکرِ بتاں کردوں ۔۔۔ تو دم میں کافرِ صد سالہ کو تسبیح خواں کردوں
ابھی اپنی ترنم ریزیوں سے وہ سماں کردوں ۔۔۔ کہ پژمردوں کو زندہ اور پیروں کو جواں کردوں
نہ گھبراؤ میں لو اب مختصر ہی داستاں کردوں ۔۔۔ اک آدھ داستاں میں حالِ شب اپنا بیاں کردوں
نہ دنیا ہی کے میں لایق نہ عقبیٰ ہی کے میں قابل ۔۔۔ کہاں اپنے کو غائب اے زمین و آسماں کردوں
ذرا ہشیار رہنا شیخ جی میں ہوں وہ مستانہ ۔۔۔ نظر میں زاہدِ صد سالہ کو پیرِ مغاں کردوں
میں گو مجذوب ہوں لیکن بفیضِ مرشدِ کامل ۔۔۔ نظر میں راہزن کو رہنمائے سالکاں کردوں

سلطنت اودھ اور زمیندار

(جناب مولوی تقی احمد صاحب ایم اے، ایل ٹی)

قصبۂ جرول ضلع بہرائچ کی ایک قلمی تاریخ دیکھنے میں آئی۔ مصنف اس کے جرول کے خاندان سادات کے ایک نامور شخص تھے، جنھوں نے اپنے بزرگوں کے حالات قلمبند کیے ہیں اور اسی سلسلہ میں زمیندار طبقہ کی اقتصادی و معاشرتی حالت کا بھی خاکہ کھینچا ہے۔ تاریخ کے اس اہم پہلو پر روشنی ڈالنے والی تحریریں خصوصًا ہندوستانیوں کے قلم سے نہایت کمیاب ہیں۔ اسی لیے اس کتاب کے بعض اجزا کی اشاعت ضروری معلوم ہوئی۔ چونکہ اسکے مطالعہ سے تصویر کا صرف ایک ہی رخ نظر آتا ہے لہٰذا صحیح رائے قائم کرنے کی غرض سے ضروری ہے کہ فرماں روایانِ اودھ کی بے دست و پائی کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ انگریز سیاح اور مورخین بھی اس سے انکار نہیں کرتے کہ سلاطینِ اودھ کے اختیارات اس قدر محدود تھے کہ امورِ سلطنت کو کامیابی سے انجام دینا قطعی ناممکن تھا۔ ہنڈی ایک یورپین سیاح ۱۸۲۷ء میں اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ" دیگر دیسی راجاؤں کی طرح سے جنھوں نے انگریزی رزیڈنٹ اپنی سلطنت میں رکھ لیے ہیں شاہ اودھ کی اس قدر نگرانی ہوتی ہے کہ اہم امورِ سلطنت کا کیا تذکرہ یہ بھی ناممکن ہے کہ بلا اجازت رزیڈنٹ کے اپنے حرم میں ایک عورت کا بھی اضافہ کرسکے۔" تصویر کے دوسرے رُخ پر روشنی ڈالنے کے لیے یوروپین مورخین اور سیاحوں کی کتابوں کے بعض حصے ترجمہ کرکے حاشیہ پر درج کردیے گئے ہیں تاکہ اس تحریر کو پڑھنے کے ساتھ ناظرین انکو بھی ملاحظہ فرمالیں اور صحیح رائے قائم کرسکیں۔ اب مصنف تاریخ مذکور کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"تشخیص جمع کا کوئی انصافی قاعدہ نہ تھا۔ جو[1] قانون گویوں اور چودھریوں نے کہدیا

---

[1] یہ غالبًا نواب سعادت علی خاں کے زمانہ کے بعد کی ہے۔ ایلیٹ صاحب اپنی نایاب تصنیف "اناڈ کرانیکلز" میں لکھتے ہیں کہ باوجود خرابیوں کے شروع نوابی کا دور اخیر زمانے اور سلطنت کمپنی کے ابتدائی دور حکومت سے مقابلتًا اچھا تھا۔ صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے نظم حکومت کے اصول میں وقتی اور ملکی ضرورتوں کے لحاظ سے ترمیم کرنے کے بعد ایک عمدہ نظام حکومت قائم کردیا تھا کہ اودھ تمام دیسی ریاستوں سے زائد خوشحال تھا۔ آصف الدولہ بھی باوجود ذاتی کمزوریوں کے یہ بہت بڑی خوبی رکھتے تھے کہ انکے دل میں قابل و کارکن لوگوں کی عزت تھی اور بالخصوص اپنی سرکار سے متعلق رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آیندہ)

وہی جمع صحیح - ابواب عذر مسدود - نکاسی پانچ سو[۵۲] - جمع شخصہ ایک ہزار - قبولیت پر اکثر بعد تدارک بجراست دستخط بنوائے جاتے تھے - بلکہ دستخط قلمی کیسے ناظم یا چکلہ دار کے خیمہ کی چوب چھو لینا کافی تھا - ایک جموگدار یا ضامن کا قطعہ ضمانت بھی فوراً داخل ہوا - یہ لوگ اکثر (قتلہ گران ؟) دربار میں سے ہوتے تھے - یا اس تعلقدار کے دیرینہ دشمن جو اسی پردے میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ لیتے تھے - گانوں سب[۵۳] غیر آباد - فصیدی دس بیگہ بھی مزروعہ نہیں - فصل و جوب سے پہلے قرق - ضامن یا جموگدار صاحب تابض - شحنہ[۵۴] گانوں گانوں مقرر - رعایا مفرور - جب حد سے زیادہ ظلم[۵۵] ہونے لگا - زمیندار نے بھی موقع پاکر گھاگھرا پار کا راستہ لیا -

---

اخیر زمانہ کی بدنظمی کی بڑی وجہ الیٹ صاحب کی رائے میں مستاجری یا ٹھیکہ کے طریقہ پر عملدرآمد تھا - رزیڈنٹ صاحبان نے بھی بارہا اس طریقہ کے منسوخ کرنے کی رائے پیش کی تھی - مگر دوسرے طریق عمل کا رواج یعنی امانی کے اصول کی پابندی کے لیے دو بڑی ضرورتیں تھیں - اول دیانتدار کارکنوں کی فراہمی، دوسرے مرکزی حکومت کا کامل اقتدار - مگر یہ دونوں باتیں اس وقت ناممکن تھیں اس لیے کہ شاہان اودھ کی حکومت محض نمائشی تھی کل اختیارات سلب ہو چکے تھے -

۵۲ نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں ایک کروڑ تیس لاکھ کی جمع کا علاقہ سرکار کمپنی کو سپرد ہوا، اور اسی وقت سے مجبوراً اخراجات کے پورا کرنے کے لیے بقیہ حصہ ملک پر شاہی محاصل کا اضافہ ضروری ہو گیا - سر انٹگومری Sir R. Montgomery کا بیان اناؤ گزیٹیر کے مصنف نے درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نوابی کے دور میں کانپور سے ۲۲ ½ لاکھ سے زیادہ کبھی وصول نہیں کیا گیا - انگریزی حکومت میں آتے ہی محاصل ۲۴ ½ لاکھ پہلے ہی سال کر دیے گئے -

۵۳ آس پاس کے ملک کی حالت بھی مقابلتاً زیادہ اچھی نہ تھی - چنانچہ ہنٹر صاحب (Hunter) اینالز آف رورل بنگال میں لکھتے ہیں کہ ۱۷۸۹ء میں لارڈ کارنوالس نے تین سال کی تحقیقات کے بعد یہ اعلان کیا کہ بنگال میں کمپنی کے مقبوضات کا ⅓ حصہ محض جنگل ہے اور غیر آباد - ہر گانوں کے گرد جنگل کی ایک پٹی ہے اور سرکاری کاغذات میں برابر یہ اندراجات موجود ہیں کہ جنگلی جانور ڈاک کے تھیلے گھسیٹ لے گئے -

۵۴ "رعایا کو سب سے کم تکلیف ہے اس واسطے کہ جبر و تعدی کا اثر زیادہ تر گانوں کے صاحب جائداد اور ذی وجاہت لوگوں پر ہوتا ہے کیونکہ ٹھیکہ کا طریقہ جو اودھ میں جاری ہے رعیت کے لیے منفعت بخش ہے" (ہسٹری آف ہندوستان - جلد سوم - رابرٹسن ۱۸۵۵ء)

۵۵ "یہ ماننا پڑیگا کہ لوگ کتنی ہی تکلیفیں کیوں نہ برداشت کرتے ہوں مگر ان تکالیف کو وہ قریب قریب جائز سمجھتے تھے بمقابلہ محکمہ مال کی سخت گیری اور محکمہ عدالت کی پریشان کن کارروائیوں سے بہتر خیال کرتے تھے" (اودھ گزیٹیر)

وصول کیا خاک ہوتا۔ ہزارہا روپیہ باقی پڑا۔ زمیندار اگر پکڑا ملا تو قید میں انواع و اقسام
کے وحشیانہ و ظالمانہ تشددات ان پر کیے جاتے تھے۔ زمینداروں کے نابالغ بچے بھی دھمکی دینے کے
واسطے قید کیے جاتے تھے۔ ادھر تو سال قبولیت کا حساب و کتاب صاف نہیں ہوا
تھا۔ کہ دوسرے ٹھیکہ دار صاحب لکھنؤ سے خلعت پہن کر ڈنکا بجاتے ہوئے آ دھمکے۔ پیچھے
وہ اہلکار معزول۔ وہ عملہ غائب۔ نئی دنیا نیا رنگ۔ پھر زمیندار متعلق اریکہ آئے۔ پھر
تشخیص ہونے لگی۔ الغرض یہی طوفان روز اٹھتا تھا۔ بطور نمونہ کے چند سال کی الٹ پلٹ
کو تحریر کرتا ہوں۔ ۱۲۴۱ف میں امداد علی خاں ناظم بہرائچ۔ علاقہ علی نگر حضور تحصیل۔ میر محمد جان
رسالدار ضامن میر عنایت علی جھوگدار۔ فقط حساب اور واصلات سمجھنے میں سال ختم ہو گیا۔
۱۲۴۲ف راجہ درشن سنگھ ناظم پھر میر حسن زکی صاحب کی قبولیت اٹھائیس ہزار کی ہوئی۔ اسی
سال میں نصیر الدین حیدر بادشاہ کا انتقال ہوا۔ بعد فرو ہونے طوفان بغاوت منا جان کے
محمد علی شاہ بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ نواب روشن الدولہ وزیر اور سبحان علی خاں کمبوہ
وغیرہ کانپور کو نکالے گئے۔ باوجود ضعف پیری و معذوری قوائے جسمانی پانچ برس غنیمت
بادشاہت کی۔ اس طرفہ انتظام کو دیکھیے کہ ۱۲۴۵ف فصلی میں عہدۂ نظامت بہرائچ کا خلعت
مسماۃ وجیہۃ النساء بیگم زوجہ حسین الدولہ کو مرحمت ہوا۔ تمام ضلع ملکہ گونڈہ اور بہرائچ دو
ضلعوں کی حکومت (جس کو اس وقت دو لائق، ذی علم و تجربہ کار سولین انجام دیتے ہیں)
ایک[۵۶] پردہ نشیں جاہل عورت کے سپرد ہوئی۔ گر یہ نظامت الف لیلہ و [illegible] زندگی
کی چار پہر رات کی زیارت تھی۔ آخر ۱۲۴۶ف میں خلعت نظامت امراؤ پانڈے کو عطا ہوا۔
ہمارے علاقے کی قبولیت جناب نانا میر علی اصغر صاحب مرحوم کے نام ہوئی۔ اسی سال

۵۶ جاگیرداری کا طریقہ نوابی کے زمانے میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ صرف فوجی خدمت یا منصب کے صلے میں جاگیریں نہیں ملتی تھیں بلکہ بیگمات کو بھی عطا ہوتی تھیں۔ پردہ نشین مستورات خود انتظام کیا کرتیں ان کے ملازمین خاص بڑی بڑی جاگیروں کا انتظام کرتے تھے۔ بہو بیگم کی جاگیر کا انتظام خواجہ سراؤں کے سپرد تھا۔ ایلیٹ صاحب کا بیان ہے کہ الماس علی خاں خواجہ سرا کے زیر انتظام ملک اس قدر سرسبز و شاداب تھا کہ ایک پر فضا باغ معلوم ہوتا تھا۔ اس موقع پر وجیہۃ النساء بیگم کو نظامت کا عطا ہونا بھی اسی طرح سے تھا۔ نظامت کے فرائض بھی جاگیرداری کے فرائض کی طرح سے عمدہ کارکنوں کی وساطت سے انجام دیے جا سکتے تھے۔

پرتھی پت سنگھ مورث تعلقدار مصطفےٰ آباد نے ہمارے گاؤں علی نگر میں ڈاکہ ڈالا۔ آگ لگا دی۔ لوٹ لیا۔ چند سپاہی جو وہاں متعین تھے مارے گئے۔ اس کے تھوڑے دنوں کے بعد گیا پرشاد قانونگو حسام پور کا تحصیلدار ہوا۔ یہ شخص کمینہ خصلت سرتاپا ظلم سیرت تھا۔ اس لیے ہمارے خاندان پر سخت شدائد کیے۔ موضع قصبہ بچیہ و کھونکرا و دیگر جو دہ حسام پور اسی سال رہن ہوا۔ ۱۲۴۷ف میں خلعتِ نظامت شنکر سہائے پانڈے کو ملا میر حسین علی اس کے نائب تھے۔ یہ سال بھی بدستور قید و حراست میں گزرا۔ اخیر سال مذکور میں جناب میر علی اصغر صاحب کو خلعت میں ہاتھی مرحمت ہوا۔ ۱۲۴۸ف میں خلعتِ نظامت بہرائچ نواب سراج الدولہ بہادر کو عطا ہوا۔ یہ بیچارے لکھنؤ کے امیر زادے، انکو انتظام ملکی سے واسطہ ہی کیا۔ انکی نظامت کو رونق نہ ہوئی۔ کارندوں پر دارو مدار تھا۔ ہمارے علاقہ کی قبولیت مشترکہ دادا صاحب اور نانا صاحب کے نام سے ہوئی۔ گر باوجود غل مچانے کے کسی نے سماعت نہ کی اور ہمارے دشمن نقلی سرب جیت سنگھ کی ضمانت کرائی گئی۔ ضامن صاحب نے اقرار نامہ ضمانت کے ساتھ ہی انچھا پور کا بیعنامہ لکھوالیا۔ ۱۲۴۹ف میں پھر راجہ درشن سنگھ ناظم ہوے۔ اس حکومت کے آغاز ہونے سے پہلے ہی پرتھی پت مذکور نے پھر علی نگر پر ڈاکہ مارا۔ دوست محمد وغیرہ چار سپاہی گڑھی میں مارے گئے۔ یہاں سے بغرض انتظام فوج کشی کی گئی لیکن ڈاکو مذکور بھاگ گیا تھا۔ نوکروں سے کچھ لڑائی ہوئی، وہ بھاگ نکلے۔ چونکہ راجہ بہادر سے پرتھی پت خائف تھا، بھاگ گیا اور تنہا بونڈے کو چلا گیا۔ اس سال وہی سرکش نقلی والی جمع پر قبولیت لکھوائی گئی اور وہی سرب جیت سنگھ پھر ضامن ہوے۔ کوئی عذر پذیرا نہ ہوا۔ ضامن کی طرف سے بھاگی سنگھ ساکن انچھا پور تحصیلدار ہوے۔ یہ سات مواضع ان کی تحصیل میں تھے۔ رونڈھا۔ جھلار۔ کرولہ۔ انچھا پور۔ سلار پور۔ گھرڑی۔ حسن پور۔ بکری۔ ہمارے کارندوں میں بھالی کا سیتم بڑا نمک حرام اور مفسد کارندہ تھا۔ اس کا شیوہ تھا کہ حکام وقت سے مل کر اپنے آقا کو انواع مصائب میں پھنسا دیتا تھا۔ گو خود بھی ذلتیں اٹھاتا تھا۔ بہت سے دیہات کے رہن نامے و بیعنامے اسی سال نہایت جبر و ستم سے لکھوائے گئے۔ چودھری ارنظامت نے مجبورانہ صیغہ ذرداں پرگنہ سے گواہیاں لکھوائیں۔ اگرچہ والد ماجد مغفور نے لکھنؤ جا کر بہت سے عرائض استغاثہ نسبت اس جابرانہ طریق عمل کے

۵۷ "مگر اس قسم کی لڑائیاں اور مناقشات اس قوی فوق رکھنے والے طبقہ میں ایک روح پھونکدیتے تھے اور ان سے ملک نا[؟] بھی مترتب ہوتے تھے" (ریفنڈ سٹشس آف برٹش انڈیا مصنفہ بیڈن پاول)

پیش کیے لیکن نقار خانہ میں ایسی صدائے فریاد کون سنتا تھا۔ وہ عہد سلطنت حضرت امجد علی شاہ مرحوم کا تھا۔ جو احکام بہ وقت اجرا ہوے اُن کی حکام مفصل نے وقت تک نہ کی سماعت کون کرتا۔ ۱۲۵۰ فصلی میں نظامت بدستور راجہ بہادر کے متعلق رہی اور بوجہ تشدد میر علی اصغر صاحب حضرت پور ضلع بارہ بنکی کو معہ عیال چلے گئے۔ سر جیت سنگھ کل علاقے پر بطور خام تحصیل متصرف ہوگیا۔ والد مغفور شب و روز دربار لکھنؤ میں کوشش و فریاد کرتے رہے مگر بمقابلہ جبروت راجہ درشن سنگھ اُن کی کون سُنتا۔ ۱۲۵۱ فصلی میں خلعت نظامت بہرائچ حکیم احسان علی خاں کو عطا ہوا اور ہادی حسن خاں صاحب اور نبی بخش خانصاحب خان زادگان بھٹوا مئو ان کی سرکار میں مدار المہام ہوے۔ امید تھی کہ یہ ہمارے جوار کے رئیس اور ایک طرح کے رشتہ دار بھی ہیں، انکے دور دورہ میں ابتر امور بھی درست ہو جائینگے بوقت ملاقات بہت تشفی آمیز کلمات کہے۔ اب ایس تو عنوان توجہ ایسا رہا اور جو عرض کیا پذیرا ہوا۔ چونکہ محرم قریب آگیا تھا، والد مغفور و جدامجد مرحوم اجازت لیکر گھر کو آئے وہاں مفسدوں نے موقع پایا۔ خوانین ذی اقتدار کو ہر طرح سے آمادہ و مستعد و ہموار کرکے سرجیت سنگھ مذکور کو کل پرگنہ حسام پور کا اجارہ دار کروادیا۔ افسوس ہے کہ ان حضرات نے کچھ پاس اخوت ایمانی بھی نہ کیا۔ قرابت تو درکنار۔ مجبوراً عین ۱۲ محرم کو یعنی بغیر فاتحہ سوم امام شہید کیے ہوے خوف تاراجی سے معہ عیال گھر چھوڑنا پڑا اور اُس پار جاکر حضرت پور میں پناہ لی۔ وہ زمانہ وزارت نواب منور الدولہ بہادر کا تھا۔ سادات ظلم رسیدہ نے عرائض استغاثہ پیش کیے اور بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ناظم نو (سنراول ؟) مقرر ہوے۔ سرجیت سنگھ کا اجارہ داری سے اخراج ہوا۔ یہ فریاد خوانین بالکلیہ کے خلاف مزاج ہوئی۔ اور بموجب تشخیص ۱۲۵۲ فصلی جمع قبولیت قرار دی۔ باوجودیکہ دیہات تھوری خورد۔ تھوری بزرگ۔ سوتاری۔ سیمبرپور۔ کنجوا۔ دھرم پور کو بلاوجہ ہمارے علاقے سے بھی نکال کر لیا سماعت عذر سرجیت سنگھ کے علاقہ قبولیت میں شامل کردیا۔ بقیہ علاقہ کی قبولیت ہوئی اور وہی نکرام کا رندہ بھالی جو گدار مقرر ہوا۔ اُس نے خوب علاقہ کو برباد کیا۔ جو چاہا سرکار میں دیا جو چاہا عمال کو دیا جس قدر چاہا خود تصرف و خورد برد کیا۔ نہ مالک کو کسی امر کی خبر کی نہ ایک حبہ علاقہ سے دیا۔ اور خاندان کی عسرت کو دیکھتا رہا۔ بالآخر اپنی سزائے اعمال کو پہونچا۔ یعنی قتل ہوا۔ ۱۲۵۳ فصلی میں خلعت نظامت بہرائچ میر امجد علی خاں کو ملا۔ مگر فرامین شاہی میں نام ناظم کا

احمد علی خاں تحریر ہوتا تھا۔ بہرام گھاٹ پر جناب جد امجد نے ملازمت حاصل کی۔ حسام پور کے مقام
میں عرضداشت متضمن شکایت برجیت سنگھ پیش ہوئی حکم دیا کہ پنچایت کر لو۔ فریق ثانی رجوع نہ ہوا
لیکن علاقہ کی پوری قبولیت لکھانے پر سختی کی گئی۔ یہاں تک کہ حراست کا حکم ہوا۔ وہ زمانہ
نواب امداد حسین خاں کی وزارت کا تھا اور عہد سلطنت حضرت امجد علی شاہ باوصف استغاثہ
وکد و کوشش کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ۱۲۵۳ف میں راجہ رگھوبر سنگھ پسر اوسط راجہ درشن سنگھ کو
نظامت ملی۔ بہاری لال ان کا نائب ہوا۔ بروقت تشخیص جمع بوجہ سنگینی جمع کی قبولیت پر
دستخط کرنے سے عذر کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جد امجد کو پرتھی پت سنگھ دشمن خاص کے سپرد کیا گیا
اس نے بڑی سختی سے حراست میں رکھا۔ اہل و عیال بھاگ کر لکھنؤ گئے۔ وہاں استغاثہ
کی شنوائی میں بہت عرقریزی کی گئی۔ آخرکار دو حبشی سوار تعینات ہوئے۔ وہ جد امجد کو
حراست سے چھڑا کر نویں محرم کو لیکر لکھنؤ پہونچے۔ تیسرے روز رہائی ہوئی۔ لیکن درستی معاملہ
علاقہ کی کوئی صورت نہ ہوئی۔ ۱۲۵۳ فصلی اسی دوادوش میں تمام ہوگیا۔ اسی سنوات
میں دیہات براہیم پور، بلہورہ وغیرہ ہمارے علاقے سے نکل کر شامل تعلقہ گنڈارہ ہوئے۔ صرف
علی پور باقی رہ گیا۔ اسی سال ۱۲۵۳ فصلی (مطابق ۱۵ محرم ۱۲۶۳ھ) کو دادی صاحبہ نے
بمقام اودھ انتقال فرمایا۔ ۱۲۵۵ف میں خلعت نظامت راجہ انچھا سنگھ کو عطا ہوا۔ اس کے
دربار میں رام چرن کائستھ ساکن حسنہ پیش دست تھا۔ اس نے اس قدر آدمیت کی کہ والد مرحوم[۵۸]
کو بلا کر علاقہ کی قبولیت کرادی اور خود منجانب راجہ گونڈہ ضمانت کرلی۔ بعد حصول پروانہ گھر کو آباد کرنے کی
نوبت آئی۔ اسی سال میر بشارت علی کی قبولیت بھی نو سالہ بدولت رامچرن ہوئی۔ اسی سال جد امجد میر حسن علی صاحب نے انتقال
فرمایا۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ باوصف آشتی و انسانیت رام چرن کے تصفیہ المگذاری
کا نہ ہوا۔ فرضی بہت نامے لکھوائے گئے۔ ۱۲۵۶ف میں میر محمد حسن خاں بارہوی کو خلعت
اور نظامت کا خطاب عطا ہوا۔ والد مرحوم اس وقت میں علیل تھے بعد صحت لشکر ناظم صاحب

---

۵۸ علاقہ کی قبولیت کبھی مصنف کے دادا کبھی نانا اور کبھی والد کے نام ہو جاتی تھی اس طرح گویا علاقہ خاندان کے
باہر نہیں جانے پاتا تھا۔ ایلیٹ صاحب لکھتے ہیں کہ نوابی اور انگریزی اصول میں یہ بڑا فرق تھا کہ انگریزی حکومت میں محاصل
شاہی کی عدم ادائگی کے بعد اگر علاقہ ضبط ہو جاتا تو کوئی رعایت ممکن نہ تھی مگر نوابی میں اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ پورا
خاندان تباہ نہ ہونے پائے۔ اور اسی غرض سے اگر سرکاری طور پر ایک شخص کے نام سے علاقہ ضبط ہوگیا تو خاندان کے کسی
دوسرے فرد کو بحیثیت پرورش پورا علاقہ یا کچھ کم دیدیا جاتا تھا۔

نیں حاضر ہو کر شرف ملازمت حاصل کیا۔ نانا صاحب مغفور نے بھی ملاقات کی مگر ہمراہی لشکر کا حکم والد مرحوم کو ہوا۔ بہ ساتھ رہے۔ علاقہ بدستور جوگداروں کے تصرف میں رہا۔ گو زمانہ اور اور وقت مناسب نہ تھا مگر بلحاظ درستی امور خانہ داری اسی سال بالکل سادے طریقہ سے حضرت والد مرحوم کی شادی دختر بزرگ میر علی اصغر صاحب یعنی حقیقی چچا کی لڑکی سے ہوئی چونکہ وہ بزرگ خاندان تھے۔ پھر تولیت تعلقداری کی انھیں کے نام ہوئی۔ وہاں وہی ملازم کارندہ دخیل تھا۔ وہی حالت ابتری کی ہوئی جو ہوا کی تھی۔ آخرکار والد مرحوم کبیدہ ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں بذریعہ تحریر دریافت ہوا کہ جناب عمامجد میر علی اصغر صاحب نے بعارضہ تخمہ وبائی انتقال فرمایا۔ گو طبیعت کارہ تھی مگر مجبوراً والد مرحوم کو گھر آنا پڑا۔ آخر سال میں میر محمد حسین صاحب کا لشکر جرول میں آکر مقیم ہوا۔ چھ سو باقی نکلی۔ اسکے واسطے شیخ نواب علی گولہ انداز کی قبض کرا دی۔ ۱۲۵۷ف نظامت نظامت سید موصوف کے واسطے آیا چونکہ ان کی نظر عنایت تھی۔ معاملات میں گونہ آسانی رہی۔ قبض و جوگ سے تو نجات نہ تھی کہ یہی اصول عملداری تھے۔ اسی سال میں میر ظہور عباس صاحب مغفور کا صرف عقد شرعی میر حبیب اللہ کنتوری کی دختر بزرگ سے ہوا۔ اسی سال آٹھ برس کے بعد موضع آئمہ جینگھا پور کو قبضۂ تعلقدار بہرام پور سے حاصل کرکے دخل پایا۔ ۱۲۵۸ف اس سال بھی خلعت نظامت سید بارہوی موصوف نے زیب تن کیا۔ اسی سال بوجہ دہانیدسات روپیہ تنخواہ پلٹن کپتان میر صاحب کے مجبوراً اس پلٹن کے ساتھ سافر خانہ ضلع سلطان پور تک جانا پڑا۔ راستے میں بڑی صعوبتیں اٹھائیں۔ جب ناظم صاحب کا پروانہ پہونچا تب رہائی ہوئی۔ براہ راست گونڈہ تک آئے۔ ناظم صاحب سے ملاقات کی اسی اثناء میں راجہ رام دت پانڈے مشہور و نامور بیس گونڈہ محض فضولی و لفظی نزاع پر نظامت کے سپاہیوں کے ہاتھ مارے گئے۔ فوج نظامت نے راجہ کے گھر کا بھی محاصرہ کر لیا۔ بالآخر بتوسط صاحب رزیڈنٹ ورثاء راجہ نے استغاثہ کیا۔ وہ عہد سلطنت واجد علی شاہ کا تھا انکا جلوس ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں تھا۔ مرافعہ شرعیہ گو اسقدر رجوع پر نہ تھا مگر اقتدار ضرور باقی تھا۔ ناظم صاحب طلب ہوئے۔ بعد تحقیقات سید موصوف الزام خون سے بری ہوئے لیکن اپنے عہدۂ نظامت سے محروم ہو گئے۔ ۱۲۵۹ف مطابق ۱۸۵۲ء نظامت خلعت راجہ مان سنگھ خلعت راجہ درشن سنگھ کو ملا۔ وہاں بھی وہی قاعدہ ناپرسی اور زبردستی

قبولیت پر دستخط کرانے کا جاری تھا۔ علاوہ بریں سر و سامان چھوگداروں اور قبضہ والوں کا
دخل و تصرف رہا۔ کارندے اور اہلکار گرفتار ہوئے۔ خود والد صاحب مرحوم لکھنؤ میں
روپوش رہے۔ یہ زمانہ بھی مثل ۱۲۶۲ و ۱۲۶۳ فصلی کے پریشانی میں گزرا۔

دونوں پہلوؤں کو دیکھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ طریقۂ حکومت کی خرابیوں سے رعایا کو پریشانی ضرور تھی مگر
اول تو یہ پریشانی اودھ کی رعایا کے لیے مخصوص نہ تھی اس لیے کہ بنگال اور دوسرے صوبوں کی حالت بھی
مقابلتاً بہت زیادہ اچھی نہ تھی۔ جس کا پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ رعایا نے اس صوبہ کی بود و باش ترک کرنا
کبھی پسند نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ بعض واقعات اس کا پتہ بھی دیتے ہیں کہ انگریزی حکومت کے کامل
تسلط سے پیشتر اٹھارویں صدی کا آخری دَور اور انیسویں صدی کا آغاز ہندوستان بھر کے لیے بدامنی کا
زمانہ تھا۔ ہنٹر نے اینالس آف رورل بنگال میں اسی زمانہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پرانے
لوگوں کو اس وقت تک وہ زمانہ یاد ہے جب کوئی شخص رات کو عمدہ شال اوڑھ کر چوروں اور ڈاکوؤں
کے خوف سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔" جب قرب و جوار کے ملکوں کا یہ حال تھا تو اودھ کی سلطنت کو
نشانۂ ملامت بنا لینا انصاف سے بعید ہے۔ علاوہ اس کے کمپنی کی حکومت اور سلطنت اودھ کے
تعلقات کی پیچیدگی بھی بڑی حد تک خرابیوں کی ذمہ دار تھی۔ اودھ کوسچن کا مصنف لکھتا ہے کہ "جو
شخص مل صاحب کی مستند تاریخ کو غور سے پڑھے گا اُس کا اس نتیجہ پر پہونچنا لازمی ہے کہ جس زمانہ میں
فرمانروایان اودھ کو ملکی معاملات میں آزادی حاصل رہی ملکی اور مالی ترقی بھی ہوئی۔ مگر جب انگریزوں
کی طرف سے مداخلت ہوئی تو بدنظمی اور گڑبڑی بھی ساتھ ساتھ شروع ہو گئی۔"

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کمپنی نے سلطنت اودھ پر مالی ذمہ داریوں کا اتنا ناقابل برداشت
بوجھ ڈال دیا تھا کہ اُس کا اُٹھانا ناممکن تھا۔ میجر برڈ نے اسپولیئیشن آف اودھ میں لکھا ہے کہ "وارن
ہیسٹنگز کا سا شخص بھی اودھ کے ساتھ کمپنی کی معاملات کا خاکہ کھینچتے ہوئے یہ بیان کرتا ہے کہ کمپنی
کے وہ فوجی و غیر فوجی ملازمین جو سلطنت اودھ سے متعلق ہیں اپنے اقتدار۔ تعداد۔ پنشن۔ انعامات
اور تنخواہوں کی کثرت سے نواب وزیر کی طاقت اور مالی حالت پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالتے ہیں۔"
(نوٹس آن انڈین افیرس)

نرنجن پور کے بابو

(جناب مولوی محمد اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی (علیگ) وکیل غازی آباد)

نرنجن پور کے بابو کسی زمانے میں بڑے زمیندار تھے اور اپنی شاہانہ فضول خرچیوں کے لیے مشہور۔ ڈھاکہ کی ململ ان کے نازک بدن میں چبھتی تھی۔ گڑیوں کے بیاہ میں ہزاروں روپیہ خرچ ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک خاص جشن کے موقع پر رات کو دن بنانے کے لیے انھوں نے سینکڑوں شمعیں روشن کرائیں اور اور دھوپ کی شعاعوں کا سامان پیدا کرنے کے لیے فضائے آسمانی سے نقرئی تار برسائے گرغ یہ قصہ ہے جب کا کہ نقش جواں تھا۔ ان یادگار زمانہ رئیسوں سے سہولت و ثروت نے جلد منہ موڑ لیا۔ نفتیا یہ سوز میں بہت سی قبیاں روشن تھیں۔ تیل ختم ہو گیا اور روشنی جاتی رہی۔

ہمارے ہمسایہ کیلاش بابو کی ذات چراغ کشتہ کی آخری بھڑک تھی۔ انکے ہوش سنبھالنے سے قبل انکے گھرانے کی شمع عظمت قریب قریب بجھ چکی تھی۔ باپ کے مرنے پر غمی کی رسوم دھوم دھام سے ادا ہوئیں اور پھر دیوالہ نکل گیا۔ جائداد قرضہ کی نذر ہو گئی۔ نقد سرمایہ جو کچھ رہ گیا تھا وہ خاندانی حشمت کی بقا کے لیے قطعی ناکافی تھا۔ کیلاش بابو نرنجن پور چھوڑ کر کلکتے چلے آئے۔ انکے صاحبزادے نے عظمت رفتہ کی اس دنیا میں زیادہ عرصے تک قیام نہ کیا اور ایک بچی کو اپنی نشانی چھوڑ کر دوسرے عالم کی راہ لی۔

کلکتے میں ہم کیلاش بابو کے پڑوسی ہیں اور عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے خاندان کی روداد اُن سے قطعی متضاد ہے۔ میرے والد نے اپنی قوت بازو سے روپیہ پیدا کیا اور اس پر فخر کرتے رہے کہ انھوں نے کبھی ضرورت سے زیادہ ایک پائی خرچ نہ کی۔ ان کا لباس اور انکے ہاتھ پیر کاروباری آدمیوں کے سے تھے۔ مسرفانہ شوکت و تجمل سے بابو کا خطاب حاصل کرنے کی ہوس اُن کو کبھی نہ ہوئی۔ میں اُن کا اکلوتا بیٹا ہوں اور انکی عادتوں کا شکر گزار۔ مجھے اُنھوں نے بہترین تعلیم دلائی اور دنیا میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بنا دیا۔ مجھے اپنی تجوری میں شکن آلود کرنسی نوٹ طویل نسب نامہ سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔

میرا خیال ہے کہ کیلاش بابو سے میری نفرت کا راز صرف یہی تھا کہ وہ اپنی بگڑی ہوئی ریاست کا سکہ جمانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اُن کی نگاہ میں میری وقعت محض اس وجہ سے نہ تھی کہ میرے والد نے محنت کر کے روپیہ پیدا کیا تھا۔

مجھے یہ احساس کر لینا چاہیے تھا کہ میرے سوائے کسی اور شخص کو کیلاش بابو سے کوئی شکایت نہ تھی بلکہ ان سے زیادہ مرنجاں مرنج بزرگ کا ملنا مشکل تھا۔ وہ شادی

اور غمی کے موقعوں پر مروت و ہمدردی کے اظہار کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے تھے اور اپنے ہمسایوں کے یہاں ہر تقریب اور تہوار میں شریک ہوتے اور ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ دوسروں کے خانگی حالات دریافت کرنے کا انھیں شوق تھا۔ راستہ میں آتے جاتے اگر کوئی شناسا ان کو مل جاتا تو مجبوراً اسکو کھڑا ہونا پڑتا اور وہ اس قسم کے سوالات کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیتے۔ "بھئی تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ شاسنی کیسی ہے؟ اور دادا تو اچھی طرح ہیں؟ آپ نے کچھ سنا؟ مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ مادھو کے لڑکے کو بخار آگیا نہ معلوم اب کس طرح ہے؟ اور ہری چرن بابو سے تو مدت سے ملاقات ہی نہیں ہوئی اچھی طرح تو ہیں؟ رکھل کا کیا حال ہے؟ اور... ہا...ں آپ کے یہاں کی مستورات تو بخیریت ہیں؟"

کیلاش بابو کا لباس ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا گو ان کے پاس کپڑے زیادہ نہ تھے۔ وہ روزانہ اپنی قمیصیں، واسکٹیں، کوٹ، پاجامے احتیاط سے نکالتے اور پلنگ کی چادر، تکیہ کے غلاف، اور اس مختصر فرش کے ساتھ جو روزانہ کی نشست کے کام آتا تھا انکو دھوپ دکھاتے۔ اسکے بعد وہ ان کو جھاڑتے برش کرتے اور پھر تہ کرکے رکھ دیتے۔ ان کا فرنیچر اگرچہ مختصر تھا لیکن کمرے کی آرائش کے لیے کافی تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ضرورت کے لیے اور سامان بھی موجود ہے۔ ملازم نہ ہونے کی وجہ سے اکثر وہ تھوڑی دیر کو مکان کا دروازہ بند کرکے اپنی قمیصوں وغیرہ پر استری کرتے اور اسی قسم کے دوسرے معمولی معمولی کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتے۔ اس کے بعد وہ دروازہ کھول دیتے اور دوستوں سے ملنے کے لیے تیار ہو جاتے۔

کیلاش بابو کی جائداد تو ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی لیکن کچھ خاندانی تبرکات باقی تھے۔ نقرئی گلاب پاش، منقش عطردان، طلائی کشتی، ایک بیش قیمت پرانی شال، بزرگوں کے وقت کی دستار، اور قدیم طرز کے خلعت، یہ چیزیں ابھی ان کے پاس موجود تھیں جن کو انھوں نے بڑی دقتوں سے قرضخواہوں کے چنگل سے بچایا تھا ہر مناسب موقع پر وہ ان کو بڑے تزک و احتشام سے نکالتے اور اس طرح نرنجن پور کے بابوؤں کی شہرۂ آفاق شان و شوکت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے۔ بباطن وہ بہت حلیم اور بردبار انسان تھے لیکن روزانہ گفتگو میں اپنے خاندانی وقار کا آزادانہ تذکرہ ان کے نزدیک ایک مقدس فرض تھا۔ ان کے احباب کو اس میں خاص لطف آتا تھا اور وہ اپنی خوش طبعی سے ان کو اور بھی بڑھا دیتے تھے۔

پڑوس کے لوگ انھیں ٹھاکر دادا کہنے لگے تھے وہ لوگ ان کے یہاں آکر گھنٹوں بیٹھتے لیکن انھیں بیکاری سے بچانے کے لیے ایک نہ ایک دوست تھوڑا سا تمباکو لے آتا اور کہتا "ٹھاکر دادا آج میرے پاس گیا سے تمباکو آیا ہے۔ ذرا دیکھیے آپ کو پسند ہے یا نہیں؟" ٹھاکر دادا ایک دو کش لگا کر رائے دیتے "بہت اچھا ہے" پھر کہتے "تمباکو تو ایک مرتبہ نرنجن پور میں میں نے بہت نفیس پیا تھا۔ ایک گنی فی اونس کے نرخ سے فروخت ہوتا تھا۔

آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب اگر شوق کرنا پسند کریں تو میرے پاس ابھی کچھ تھوڑا سا باقی ہے حاضر کر دوں"۔ لیکن سب جانتے تھے کہ اگر کسی نے فرمائش کر دی تو پھر یا تو الماری کی کنجی کھو جائیگی یا پھر گنیش ملازم اس کو کہیں رکھ کر بھول گیا ہوگا اور وہ فرمائینگے "نوکروں کے ہاتھ پڑ کر کوئی چیز ٹھکانے سے نہیں رہتی نہ معلوم کہاں ڈال دیتے ہیں۔ اب اس گنیش ہی کو دیکھ لیجیے، کیا کہوں کس قدر بیوقوف ہے لیکن اس کو علیحدہ کرتے ہوئے بھی جی دکھتا ہے"۔ اور گنیش بھی آقا کی بات رکھنے کے لیے سارا الزام بے چون و چرا اپنے سر لینے کو تیار رہتا تھا۔ ایسے موقع پر حاضرین میں سے کوئی نہ کوئی کہتا "جانے بھی دیجیے۔ ٹھاکر دادا۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ یہ تمباکو جو ہم پی رہے ہیں اچھا خاصا ہے۔ آپ کا تمباکو تو بہت تیز ہوگا"۔ اب ٹھاکر دادا اطمینان سے بیٹھ جاتے اور گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔

احباب رخصت ہوتے تو ٹھاکر دادا دروازے تک مشایعت کرتے اور دیوڑھی پر آکر کہتے "اور ہاں یہ تو کہیے آپ لوگ میرے یہاں کھانے پر کب تشریف لائیں گے"۔ اس پر کوئی نہ کوئی جواب دیتا "ابھی نہیں ٹھاکر دادا ابھی نہیں۔ پھر کوئی تاریخ مقرر ہو جائے گی"۔ وہ کہتے۔ "اچھا خیر بارش ہو جانے دیجیے۔ آجکل تو گرمی بہت ہے اور جیسی عظیم الشان دعوت میں آپ کو دینا چاہتا ہوں اُس کی وجہ سے آپ سب کو ایسے موسم میں زحمت بھی ہوگی"۔ جب برسات شروع ہو جاتی تو ہر شخص احتیاط رکھتا کہ انکو وعدے کی یاد نہ دلائے اور اگر کبھی یہ ذکر چھڑ بھی جاتا تو کوئی صاحب آہستہ سے کہدیتے "آجکل بارش میں کہیں آنے جانے سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ برسات ختم ہو جائے تو دیکھا جائے گا"۔ غرض یوں ہی یہ کھیل بنا رہتا۔

ٹھاکر دادا کا چھوٹا سا مکان ان کے شایان شان نہ تھا اور ہم سب اس معاملہ میں اُن کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان کے دوست انھیں یقین دلاتے کہ ہمیں آپ کی دقتوں کا احساس ہے۔ کلکتہ میں کسی نفیس مکان کا دستیاب ہونا قریب قریب ناممکن ہے اور ہم سب عرصہ سے آپ کے لیے ایک مناسب مکان کی تلاش میں ہیں۔ شاید مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کے دوستوں میں سے ایسا بیوقوف کوئی بھی نہ تھا جو واقعی ان کے لیے کسی مکان کو حاصل کرتا۔ ٹھاکر دادا باندازِ قناعت کہتے "معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ مجھے اسی گھر میں بسر کرنا ہوگا"۔ اسکے بعد وہ مسکرا کر فرماتے "آپ جانیں میں دوستوں سے علیحدہ تو رہ ہی نہیں سکتا۔ آپ لوگ نزدیک رہیں تو پھر مجھے کیا چاہیے۔ آپ کے قرب سے ہر تکلیف کی تلافی ہو جاتی ہے"۔

نہ جانے کیوں مجھے یہ باتیں ناگوار تھیں۔ غالباً یہ وجہ ہوگی کہ جوانی میں انسان کے نزدیک سادہ لوحی بدترین جرم ہوتی ہے۔ کیلاش بابو دراصل سادہ لوح نہ تھے۔ روزمرہ کے کاروباری معاملات میں تو دوسرے لوگ بھی ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اس نرنجن پور

کے متعلق ان کی گفتگو واقعی عقل سلیم سے بعید ہوتی تھی ان کی خاطر سے کوئی ان کی لن ترانیوں کی تردید نہیں کرتا تھا اس لیے وہ بھی حد سے تجاوز ہو جاتے تھے۔ جب لوگ ان کے سامنے نرنجن پور کی تاریخ کے عظیم الشان واقعات غلو کے ساتھ بیان کرتے تو وہ سنجیدگی سے ان کو تسلیم کرلیتے اور انھیں کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہ ہوتا کہ کوئی ان کی صحت میں شبہہ کر سکتا ہے۔

کیلاش بابو کے متعلق میں اپنے محسوسات اور خیالات کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میری ناخوشی کے اسباب ذرا اور گہرے تھے۔ بات یہ تھی کہ میں ایک متوسل گھرانے کا فرد ہوں اور کالج میں تضیع اوقات کر سکتا تھا لیکن میں نے محنت کرکے تھوڑی ہی سی عمر میں ایم اے پاس کرلیا۔ میرے چال چلن میں کوئی نقص نہ تھا اور میری شکل و صورت بھی اچھی تھی اگر میں اپنے کو خوبصورت کہوں تو ممکن ہے اسے خودستائی پر محمول کیا جائے لیکن غلط نہ ہوگا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا کہ لڑکیوں والوں کی نگاہیں مجھی پر پڑتی تھیں۔ کم از کم مجھے خود تو اس بات کا یقین تھا اور میں نے شادی کے بازار میں اپنی پوری قیمت اٹھانے کا تہیہ کرلیا تھا۔ جب میں اپنے انتخاب کا تصور کرتا تو میری نگاہوں میں ایک دولتمند باپ کی اکلوتی بیٹی ہوتی نہایت حسینہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ دور دور سے پیام آنے شروع ہوئے۔ بڑی بڑی رقمیں پیش کی گئیں۔ میں ان تمام پیاموں کو قطعی غیر جانبداری سے اپنے احساس خودی کی نازک میزان میں وزن کرتا لیکن اپنی شریک حیات بننے کی اہلیت کسی میں نہ پاتا۔ میں شاعر بھبوتی کا ہمخیال ہو گیا تھا کہ اس دنیا کے غیر محدود زمان و مکان میں ممکن ہے کوئی ہستی ایسی بھی پیدا ہو جائے جو میرے حسن شاہانہ کی رفیق بننے کی اہل ہو۔ لیکن عصر نو کی قلیل مدت میں اور بنگال جدید کی مختصر سرزمین پر کسی ایسی بے نظیر ہستی کا وجود پایا جانا مشکوک تھا۔ اس اثنا میں متوقع والدین میرے گن مختلف سُروں اور راگوں میں گاتے رہے۔

میں ان کی لڑکیوں کو پسند کرتا یا ناپسند لیکن یہ پرستش بہرحال ناخوشگوار نہ تھی۔ میں اس کو اپنا حق تصور کرتا تھا۔ کیونکہ میں تھا بھی ایسا ہی حسین۔ کہتے ہیں کہ دیوتا فانی انسانوں پر کرم کریں یا نہ کریں لیکن وہ اپنے پرستاروں سے عقیدت و احترام کے متوقع رہتے ہیں اور اگر اس میں کوتاہی ہو تو ناراض ہو جاتے ہیں مجھ میں یہ الہیانہ خواہش بہت ترقی کر گئی تھی۔

میں یہ ذکر کر چکا ہوں کہ ٹھاکر دادا کی ایک اکلوتی پوتی تھی میں نے اُسکو دیکھا اکثر تھا لیکن میری نگاہوں میں وہ کبھی نہ جنچی۔ مجھے کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ اُس کا میری رفیقۂ زندگی بننا ممکنات سے ہو سکتا ہے۔ اسکے باوجود مجھے یقین تھا کہ میری بارگاہ میں کسی دن بصد نیاز کیلاش بابو یہ ہدیہ پیش کرینگے۔ درحقیقت میرے تنافر نہاں کا باعث یہی تھا۔ مجھے سخت کوفت تھی کہ اب تک اُنھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔

مجھے معلوم تھا کہ ٹھاکر دادا اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ نرنجن پور کے بابو کبھی کسی سے خواستگار نہیں ہوتے۔ لڑکی بن بیاہی رہے تو رہے لیکن وہ

خاندانی آن نہ توڑیں گے۔ مجھے ان کی اس بے نیازی
پر غصہ آتا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی
رہی۔ لیکن میں قطعی خاموش رہا اور اس کو انتہائی
صبر و سکون سے برداشت کرتا رہا۔ یہ میری خوبی تھی۔
جس طرح بادلوں کی گرج کے ساتھ بجلی کی چمک
ہوتی ہے اسی طرح میرے مزاج میں غصہ کے ساتھ
ظرافت بھی ودیعت کی گئی تھی۔ محض اپنے دل کا
بخار نکالنے کے لیے تو میں بیچارے بڑھے کو سزا نہ دے
سکتا تھا اس لیے عرصہ تک میں خاموش رہا۔ البتہ ایک
روز مجھے ایسی دلچسپ تدبیر سوجھی کہ میں اسکو عملی جامہ
پہنانے سے باز نہ رہ سکا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ کیلاش بابو کے اکثر احباب
ان کی خود پسند طبیعت کو مسرور رکھنے کے لیے بیحد خوشامد
کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص سرکاری ملازمت
سے پنشن لیکر آیا تھا اور ان سے کہا کرتا تھا کہ جب
کبھی چھوٹے لاٹ صاحب کے یہاں حاضری کا موقعہ
ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ نرنجن پور کے بابوؤں کا ذکر کیا
کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ بنگال بھر میں صرف
دو خاندان حقیقی طور پر معزز ہیں۔ کاشی پور کے مہاراجہ
اور نرنجن پور کے بابو۔ کیلاش بابو اس سفید جھوٹ
کو بہت فخر سے سنتے اور کبھو کبھی خود بھی اس کو دہرایا
کرتے۔ جب کبھی کسی محفل میں ان کی اس سرکاری
ملازم سے ملاقات ہوتی تو وہ یہ ضرور پوچھتے "اور
ہاں یہ تو فرمائیے۔ چھوٹے لاٹ صاحب کا مزاج تو
بخیر ہے؟ کیا کہا آپ نے؟ اچھی طرح ہیں نا؟ واقعی
مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی اور میم صاحبہ تو بخیریت
ہیں؟ بابا لوگ اچھے ہیں؟ خوب! اس مرتبہ آپ کی
ملاقات ہو تو میرا اسلام ضرور کہیے"۔

کیلاش بابو اکثر لاٹ صاحب سے ملاقات کرنے کا
قصد ظاہر کیا کرتے تھے لیکن یقین کیجیے کہ بہت سے
چھوٹے اور بڑے لاٹ آئیں گے اور چلے جائیں گے
ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے گی لیکن نرنجن پور کی
خاندانی سواری کیلاش بابو کو گورنمنٹ ہاؤس سے
جانے کے لیے تیار نہ ہو سکے گی۔

ایک دن میں نے ان کو "علیحدہ" لے جا کر چپکے سے
کہا "ٹھاکر دادا میں کل دربار گیا تھا۔ چھوٹے لاٹ
صاحب نے اتفاقاً نرنجن پور کے بابوؤں کا ذکر کیا
میں نے کہا کہ کیلاش بابو شہر میں آگئے ہیں۔ آپ
یقین کیجیے۔ ان کو سخت افسوس ہوا کہ آپ اب تک
ان کی ملاقات کو نہیں گئے ہیں۔ انھوں نے فرمایا
کہ "تکلف برطرف میں آج ہی سہ پہر کو ان سے
پرائیوٹ ملاقات کرنے آؤں گا"۔

کوئی دوسرا ہوتا تو وہ اس راز کو فوراً سمجھ جاتا
اور اگر یہ سازش کسی دوسرے کے خلاف ہوتی تو
خود کیلاش بابو بھی اس مذاق کو سمجھ جاتے لیکن
اپنے دوست سرکاری ملازم کی گفتگو اور خود اپنے
مبالغوں کے بعد لفٹننٹ گورنر کی آمد ان کے نزدیک
قطعی فطری ہو گئی تھی۔ وہ یہ خبر سن کر بہت مضطرب
ہوئے۔ آئندہ ملاقات کی تفصیل کا ایک ایک
جزو ان کے ہاتھ پیر پھلانے دے رہا تھا سب سے

زیادہ انھیں اپنے انگریزی نہ جاننے کا خیال تھا۔ اُس وقت کا کیا علاج ہوگا۔ میں نے کہا یہ تو کوئی دقت نہیں ہے۔ انگریزی سے ناواقفیت بھی شان ریاست میں داخل ہے۔ اور اسکے علاوہ لفٹننٹ گورنر اپنے ساتھ ایک ترجمان ضرور رکھتے ہیں اور اس ملاقات کے لیے تو اُنھوں نے خاص طور پر کہہ دیا ہے کہ پرائیوٹ ہوگی۔

دوپہر کے قریب جب ہمارے بیشتر ہمسائے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے یا سو رہے تھے کیلاش بابو کے مکان کے آگے ایک جوڑی آکر ٹھہری۔ دو وردی پوش چپراسی اوپر آئے اور چھوٹے لاٹ صاحب کی آمد کی اطلاع دی۔ کیلاش بابو خلعت دربر و دستار بر سر ہمہ تن انتظار موجود تھے۔ جلو میں گنیش اس موقعہ کے لیے اپنے آقا کے بہترین لباس میں ملبوس کھڑا تھا۔

چھوٹے لاٹ صاحب کی آمد کی اطلاع پاکر کیلاش بابو ہانپتے کانپتے دروازہ کی طرف بھاگے اور قدم قدم پر جھک کر مسلسل فرشی سلام کرتے ہوئے اُسلٹے پاؤں لاٹ صاحب کے بھیس میں میرے ایک دوست کو اندر لے گئے۔ ایک سخت چوبی کرسی پر اُنھوں نے اپنی کہنہ شال ڈال رکھی تھی۔ اُس پر لاٹ صاحب کو بٹھایا اور پھر صاحب لوگوں کی قدیم درباری زبان اُردو میں ایک فصیح و بلیغ تقریر کی۔ اور سونے کی کشتی میں رکھکر طلائی مُہروں کا ایک توڑا جو اُن کی گِری ہوئی ریاست کی باقیات میں سے تھا نذر گزرانا۔ خانہ زاد قدیم گنیش خوف و احترام کے مشترکہ جذبات کے ساتھ گلاب پاش لیے پیچھے کھڑا تھا اور لاٹ صاحب کو گلاب کے چھینٹوں سے بالکل بھگوئے دے رہا تھا اور عطردان سے بار بار عطر گلاب لگا رہا تھا۔

کیلاش بابو اپنی قدیم ریاست نرنجن پور کے شایان شان ہز آنر بہادر کا استقبال نہ کر سکنے پر بار بار افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ نرنجن پور میں وہ ان کا پورے اہتمام و انصرام کے ساتھ خیر مقدم کرتے۔ کلکتہ میں تو ان کی حیثیت بالکل مسافر کی سی تھی۔ یہاں وہ قطعی اجنبی بلکہ ماہی بے آب تھے۔

میرے دوست ریشمی ہیٹ لگائے ہوئے تھے اور کیلاش بابو کی تمام تقریر کے جواب میں کبھی کبھی تمکنت سے صرف سر ہلا دیتے تھے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزی آداب مجلس کے مطابق کمرے میں پہونچنے کے بعد ہیٹ اُتار دینی چاہیے تھی لیکن افشائے راز کے خوف سے میرے دوست کو ہیٹ اُتارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور کیلاش بابو اور اُنکا ملازم گنیش آداب مجلس کی اس خلاف ورزی سے قطعی ناآشنا تھے۔

دس منٹ کے انٹرویو کے بعد جسکے درمیان میں اُنھوں نے محض کبھی کبھی جنبش سر کی تکلیف کی میرے دوست رخصت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور جیسا کہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا دونوں وردی پوش سپاہیوں نے طلائی مُہروں کے توڑے، سونے کی کشتی، قدیم آبائی

شال، نقرئی گلاب پاش اور نقشیں عطر دان کو بٹے کر دفرے لے جا کر گاڑی میں رکھدیا۔ کیلاش بابو نے اس کو بھی چھوٹے لاٹ صاحب کے معمول پر محمول کیا میں یہ ساری کارروائی ایک برابر والے کمرہ سے دیکھ رہا تھا اور ہنسی کو ضبط کرتے کرتے میری پسلیوں میں درد ہوا جا رہا تھا۔ جب ضبط نہ ہو سکا تو میں بھاگ کر ایک دور کے کمرے میں پہونچا۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی ایک گوشے میں کھڑی ہوئی اس بُری طرح رو رہی تھی کہ کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ میرے قہقہوں کی آواز سُن کر وہ غصہ کے مارے مبہوت ہو گئی۔ اور اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے بجلیاں گرا کر اُس نے گریہ گیر آواز میں مجھ سے کہا "بتائیے۔ میرے دادا نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ ان کو فریب دینے آئے ہیں۔ آپ یہاں کس لیے آئے ہیں۔ کیوں ....." اس سے زیادہ اُس کی زبان نے یاری نہ کی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میری ہنسی کلفت کافور ہو گئی۔ مجھے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ میری اس حرکت کے معنی اعلیٰ درجہ کے مذاق کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں نے ایک نازک دل کو سخت ترین صدمہ پہونچایا ہے۔ میرے ستم کی مہیب ظلمت مجھ پر نفریں کر رہی تھی۔ میں دُبکا ہے ہوئے کُتے کی طرح دبے پاؤں کمرہ سے نکل گیا۔

اب تک میں کیلاش بابو کی پوتی کُسُم کو شادی کے بازار میں متاعِ ناقص سمجھتا تھا جو خریدار کے انتظار میں پڑی سود میں ہو۔ آج اس کمرے کے ایک گوشہ میں مجھے ایک انسانی دل کی تڑپ کا احساس ہوا۔

رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ میرے دماغ میں ایک ہیجان برپا تھا۔ اگلے روز علی الصباح میں مال مسروقہ خفیہ طور پر گنیش کو واپس کرنے کے لیے کیلاش بابو کے مکان پر گیا۔ دروازے پر پہونچکر میں نے انتظار کیا لیکن جب کوئی نہ آیا تو میں کیلاش بابو کے کمرے میں اوپر گیا۔ غلام گردش میں مجھے کُسُم کی آواز آئی جو بڑے پیارے انداز میں اپنے دادا سے پوچھ رہی تھی: "اچھے دادا۔ چھوٹے لاٹ صاحب نے کل آپ سے کیا باتیں کیں مجھے سب سنا دیجیے۔ ایک ایک حرف۔ میں شوق کے مارے مری جا رہی ہوں۔"

دادا کو کسی اور تحریک کی ضرورت نہ تھی۔ لاٹ صاحب نے ازراہ کرم نرنجن پور کے قدیم خاندان کے متعلق جو کلماتِ تحسین ارشاد فرمائے تھے ان کو دوہراتے وقت دادا کا چہرہ فخر و مباہات سے دمک رہا تھا۔ لڑکی ان کے سامنے بیٹھی تھی اور ہمہ تن گوش بنی ہوئی ان کا مُنہ تک رہی تھی۔ اپنے دادا کی محبت کی خاطر وہ اپنا پارٹ حتی الامکان اس خوبی سے ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اُن کے دل میں بناوٹ کا شائبہ تک بھی نہ پیدا ہو۔

میرے دل پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جب تک بُڈھا کرز ادا چھوٹے لاٹ صاحب کی حیرت انگیز آمد کا ذکر خیر

لے لے کر کرتے رہے میں غلام گردش میں کھڑا رہا - بالآخر
جب وہ کمرے سے چلے گئے تو میں نے مال مسروقہ کو لیجا کر
لڑکی کے قدموں میں رکھ دیا اور بغیر کچھ کہے چلا آیا -

اس دن کچھ دیر کے بعد میں پھر ملنے گیا - نئی روشنی
کے نامناسب طریقہ کے مطابق کمرے میں آتے وقت
میں بڑے میاں کو سلام کرنے کا عادی نہ تھا لیکن آج
میں نے جھک کر سلام کیا اور ان کے قدم لیے - مجھے
یقین ہے کہ بڑے میاں نے اس تعظیم و تکریم کو لاٹ
صاحب کی آمد کا نتیجہ سمجھا - وہ اس سے بہت مسرور
ہوئے - اور ایک لطیف سکون ان کی آنکھوں میں
جھلکنے لگا - ان کے احباب آنے شروع ہو گئے
تھے اور وہ لفٹننٹ گورنر کی آمد کی "حکایت لذیذ" کو
عجیب و غریب افسانوں سے "دراز تر" بنا کر بیان کر رہے
تھے - اور یہ قصہ اپنی نوعیت اور طول کے اعتبار سے
داستان امیر حمزہ ہوا جا رہا تھا -

مہمانوں کے رخصت ہو جانے پر میں نے نہایت
انکسار سے اپنا پیام پیش کیا اور کہا کہ "اگرچہ مجھے کبھی
ایک لمحہ کے لیے بھی ایسے عظیم الشان کنبے میں سلسلۂ
مناکحت کی توقع نہیں ہو سکتی لیکن ...... وغیرہ وغیرہ"
میں اپنا پیام عرض کر چکا تو بڑے میاں نے مجھے
گلے لگا لیا اور فرط مسرت سے کہ اٹھے "میں تو غریب
آدمی ہوں - مجھے کب ایسی خوش نصیبی کی توقع ہو سکتی
تھی"

کیلاش بابو کی زندگی میں یہ پہلا اور آخری
موقع تھا کہ انھوں نے اپنے افلاس کو تسلیم کیا اور
یہی ان کی زندگی میں پہلا اور آخری موقع تھا کہ انھوں
نے ایک ہی لمحہ کے لیے سہی نرنجن پور کے بابوؤں کی
قدیم عظمت کو فراموش کیا -

(رابندر ناتھ ٹیگور)

غزل

(جناب منشی محمد حمید اللہ صاحب خلیق - راغبی برہان پوری)

تجھ پہ صدقے ہو کے اے شمع رخ جانانہ ہم — اک جہاں کو دیں گے درس فطرت پروانہ ہم
بجلیوں کو کیوں بنائیں رونق کاشانہ ہم — خود بھڑک کر کیوں نہ بن جائیں چراغ خانہ ہم
امتیاز حسن کعبہ کو نہ سمجھے آج تک — ہو گئے کچھ ایسے محو جلوۂ بتخانہ ہم
رہرو راہ محبت بن کے یہ حاصل ہوا — ہر قدم پر دیکھتے ہیں منزل جانانہ ہم
کم سے کم اتنی تو فرصت دے ہمیں پیک اجل — کچھ مرتب زندگی کا کر سکیں افسانہ ہم

گردش ایام سے پھر کیوں ہراساں ہوں خلیق
دل میں جب رکھتے ہیں جوش ہمت مردانہ ہم

سائنس پر تاریخ کی افضلیت

(جناب محمد حیات شریف صاحب متعلم بی ۔ اے ۔ بجنور)

تاریخ کے ایک طالب علم سے شاید یہ توقع کی جائے کہ وہ دل کھول کر سائنس کی برائیاں دکھائے گا، اور اُس کے مقابلہ میں تاریخ کی جس قدر خوبیاں ذہن میں آسکیں گی بیان کرے گا مگر یہ طریقۂ بحث سرتاسر مبنی بہ تعصب ہوگا ۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ سائنسداں اصحاب کو فن تاریخ کے متعلق جو غلط فہمی ہے اُسے دفع کروں اور یہ دکھاؤں کہ تاریخ کو کن امور میں سائنس پر فوقیت حاصل ہے ۔

سائنس اور تاریخ دراصل علم کے دو جداگانہ شعبے ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ کارآمد و مفید ہیں ۔ دو چیزوں کا موازنہ و مقابلہ اُسی حالت میں صحیح ہے جبکہ دونوں کا موضوع یکساں یا کم و بیش مماثل ہو تاکہ اُن کی جانچ ایک ہی معیار پر کی جاسکے ۔ اس لیے بظاہر سائنس اور تاریخ کے درمیان اس قسم کا محاکمہ بے محل ہوگا ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ طالبعلمی کے زمانہ میں ایک منزل ایسی آتی ہے جب دونوں علوم کے درمیان انتخاب کرنا اور ایک کو دوسرے پر ترجیح یا فضیلت دینا ضروری ہو جاتا ہے ۔

عامیان سائنس کے نزدیک تاریخ محض گزرے ہوئے چند واقعات کے بیان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی یا بالفاظِ دیگر تاریخ اُن کے نزدیک نام ہے گڑے مُردے اُکھیڑنے کا ۔ حالانکہ علوم انسانی کی تمام شاخوں میں تاریخ سب سے زیادہ مقبول و دلپسند ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اہل علم کی عام رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ بحیثیت مجموعی مورخین کو اپنی محنت و جانفشانی کے مطابق کامیابی حاصل ہوئی اور جس قدر اس بحث پر غور و فکر اور مطالعہ سے کام لیا گیا اُسیقدر زیادہ وہ سمجھ میں آیا اور مفید ثابت ہوا ۔ ایک بڑے مصنف نے تاریخ کی یہ تعریف کی ہے :—

"عالم فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کیے اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ۔ ان دونوں کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے"

ایک اور حکیم نے علم تاریخ کی تعریف یوں بیان کی ہے :—

"اُن حالات و واقعات کا پتہ لگانا جن سے یہ دریافت ہو کہ موجودہ زمانہ گزشتہ زمانہ سے کیونکر بطور نتیجہ کے پیدا ہوا ہے ۔ یعنی چونکہ یہ مسلم ہے کہ آج دنیا میں جتنے تمدن، معاشرت، خیالات و مذاہب موجود ہیں وہ سب گزشتہ واقعات کے نتائج ہیں جو خواہ مخواہ ان سے پیدا ہونا چاہیے تھے ۔ اس لیے اُن

گذشتہ واقعات کا پتہ لگانا اور اُنکو اس طرح ترتیب دینا جس سے ظاہر ہو کہ موجودہ واقعہ گزشتہ واقعات سے کیونکر پیدا ہوا۔"

ان تعریفات کی بنا پر تاریخ کے لیے دو باتیں لازمی ہیں:۔

(۱) جس عہد کا حال لکھا جائے اُس زمانہ کے ہر قسم کے واقعات قلمبند کیے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات اور مذاہب سب کے متعلق سرمایہ فراہم کیا جائے۔

(۲) تمام واقعات میں سبب و مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ تاریخ کی تدوین میں مورخ کو کن کن علوم سے کام لینا پڑتا ہے۔ صرف واقعات کا سطحی علم تاریخ مرتب کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ لڑائی اور معرکہ آرائی کے بیان کے لیے علم جنگ یا اصطلاحات فن حرب سے واقف ہونا لازمی ہے۔ نظم و نسق کی تحریر کے واسطے خود مورخ کا قانون داں ہونا ضروری ہے۔ علم طبقات الارض۔ علم آثار قدیمہ۔ علم الاعداد۔ علم طبعیات۔ علم اخلاق۔ علم سیاست اور دیگر علوم و فنون سے بھی وہ بے بہرہ نہ ہو۔ کہ یہ سب تاریخ نویسی کے لیے ناگزیر ہیں اور انھیں سے وہ جملہ اسباب ترکیب پاتے ہیں جو نسل انسانی کی افتاد مزاج و رجحان طبیعت پر موثر ہوتے ہیں اور جن میں اُن کا ظہور ہوتا ہے۔

تھوڑے غور و فکر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تاریخ کا عنصر ہر قوم میں موجود ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں انسانوں کا کوئی گروہ موجود تھا تاریخ و تذکرے بھی ساتھ ساتھ تھے۔ کیونکہ فخر و مباہات کے مواقع پر لوگ عموماً اپنے اسلاف کے کارنامے بیان کرتے تھے یا تفریح اور گرمیٔ محفل کے لیے گزشتہ لڑائیوں اور معرکوں کا ذکر کیا جاتا تھا اس بنا پر عرب و عجم، ترک و تاتار، ہندی و افغانی، مصری و یونانی و چینی غرضکہ دنیا کی تمام قومیں فن تاریخ کی واقفیت کا یکساں دعویٰ کر سکتی ہیں۔

سولھویں صدی سے قبل فن تاریخ کا مواد افراط سے موجود ہونے کے باوجود ہمارے معلومات نہایت ناقص تھے۔ مگر اسکے بعد تحقیقات ایسے بلند پیمانہ پر شروع ہوئی اور سر توڑ کوششیں اس باب میں کی جانے لگیں کہ تحقیقات کا یہ عظیم الشان اور کارآمد شعبہ بھی دیگر شعبہ جات کی سطح کے برابر پہونچ جائے۔ بڑی حد تک اس میں کامیابی ہوئی۔ چنانچہ سولھویں صدی کے بعد کے مورخین میں متعدد صورتوں سے یہ بات نظر آتی ہے کہ وسعتِ نظر میں بسط کے ساتھ اضافہ ہوا ہے اور تصانیف میں اُن اہم مباحث کو داخل کرنے کی رغبت پیدا ہو گئی جو اس سے پیشتر خارج از بحث سمجھے جاتے تھے۔ اس طور سے تاریخ کی ان تصانیف میں گو اگلوں مضامین کے شُبلے نظر آتے ہیں اور متوازی واقعات جمع اور بیان کر دینے سے ایسے کلیات

اخذ کرنے کی راہ کھل گئی ہے جن کا ابتدائی تصانیف میں کہیں پتہ نہیں ملتا۔ وہ واقعات جو صدر درجہ غیر منظم تھے اور محض حوادثِ اتفاقی معلوم ہوتے تھے اُن کی تشریح کر کے دکھایا گیا کہ وہ سب مقررہ قوانین کے مطابق ہیں۔ جیسا تاریخ کی تعریف میں اوپر کہا گیا ہے کہ عالم فطرت اور انسانی حالات کے ایک دوسرے پر موثر ہونے کے مجموعہ کا بیان تاریخ ہے، واقعات فطری کو اب اس نگاہ سے دیکھنے لگے کہ اُن میں باقاعدگی کا سراغ ملے۔ اور اسی طرح حالات انسانی کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا جانے لگا۔

واقعاتِ فطری اور حالاتِ انسانی کے مطالعہ میں فلسفی مورخ کو نہایت خطرناک مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف اُسکے مشاہدات میں ایسی غلطیوں کا بہت احتمال ہوتا ہے جو تعصب اور دیگر نفسانی جذبات کے سبب سے ہوتی ہیں اور دوسری طرف اُسے علوم طبیعی کے تجربات سے کام لینا پڑتا ہے۔ علوم طبیعی میں واقعات کے اندر باقاعدگی کا ہونا اور اُن کے متعلق پیشین گوئی کر سکنا ایک مسلمہ مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر تاریخ میں اس قسم کی باقاعدگی نہ صرف غیر مسلّم ہے بلکہ اس کو ماننے سے قطعاً انکار کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مورخ چاہے کہ تاریخ کو ایسے درجہ پر پہونچا دے کہ وہ معلوماتِ انسانی کی دیگر شاخوں کے ہم سطح ہو جائے تو اُسکو ابتدا ہی میں سخت مزاحمتیں پیش آتی ہیں۔ کیونکہ اُس سے کہا جاتا ہے کہ انسان کے معاملات میں کچھ راز ہائے سربستہ اور کچھ اور محض قضاو قدر بےمعنی ایسے ہوتے ہیں جو ہماری تحقیقات کی دسترس سے باہر ہیں اور اسی وجہ سے اُن کی رفتار ہمیشہ پوشیدہ رہیگی۔ یہ قول درست نہیں کیونکہ اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اُس کا ثبوت نہیں مل سکے گا

عام عقیدہ یہ ہے کہ تاریخ ہمیشہ ظنی اور غیر حقیقی حالت میں رہیگی اور سائنس کے مرتبہ تحقیق پر کبھی نہ پہونچیگی یہ بہت بڑا مسئلہ ہے جسکا حل کرنا درحقیقت ہماری بحث کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہے۔ جو لوگ واقعاتِ تاریخی کی اس صلاحیت سے انکار کرتے ہیں کہ وہ کلیات کے تحت میں لائے جا سکتے ہیں اُن کی تشفی کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص اس سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے کہ گزشتہ دو صدیوں کے اندر کیا کچھ کیا گیا ہے وہ اس سے بے خبر نہ ہوگا کہ ہر نسل مابعد نے بعض اُن واقعات کو باقاعدہ بنا دیا اور پیشین گوئی کرنے کے لائق ثابت کر دیا ہے جن کی نسبت نسل ماقبل کے لوگ یہی سمجھے ہوئے تھے کہ وہ کسی قاعدہ کے تحت میں لائے جا سکتے ہیں اور نہ انکی بابت کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

جب ہم سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے تو وہ نتیجہ ہوتا ہے کسی سبب یا اسباب تحریک کا۔ اور چونکہ وہ اسباب نتیجہ ہوتے ہیں حالات گزشتہ کا اس لیے اگر ہم کل واقعات ماقبل اور اُس تحریک کے جملہ قوانین سے واقف ہو جاتے تو ایسے یقین کے ساتھ جو کبھی خطا نہ کرتا ہم اس کے فوری نتائج کی بابت آسانی پیشین گوئی

کر سکتے اور غالباً یہی رائے ہر اُس شخص کی ہوگی جس کی طبیعت کسی خاص طریقہ کی دلدادہ یا جنبہ دار نہیں ہو گئی ہے۔ اور جو اپنی رائیں اُن شہادتوں کی بنا پر قائم کرنے کا خوگر ہے جو واقعتاً اُس کے پیش نظر ہوتی ہوں۔ مثلاً اگر ہم کسی شخص کی افتادِ طبیعت سے بخوبی واقف ہوں تو اکثر اوقات ہم یہ بتا سکیں گے کہ فلاں فلاں حالات و معاملات میں وہ اس طرح کا برتاؤ کرے گا۔ اب اگر ہماری یہ پیشین گوئی پوری نہ ہو تو اپنی ناکامی کو اس بات پر محمول کرنا چاہیے کہ یا تو اُس شخص کے حالات و معاملات کے متعلق ہماری اطلاع غلط تھی یا ہم نے کافی طور سے اُس کی افتادِ طبیعت کا مطالعہ نہیں کیا۔ بہرنوع اگر ہم میں صحیح طور سے استدلال کی قابلیت ہے اور ساتھ ہی اسکے ہم نے اُن حالات و واقعات کا علم کلّی حاصل کر لیا ہے جو اُس سے تعلق رکھتے تھے تو ہم اُس طرزِ عمل کے متعلق بخوبی پیشین گوئی کر سکیں گے جو ان حالات و واقعات کے نتیجہ کے طور پر وہ آیندہ اختیار کرے گا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے تاریخ افعال انسانی سے بحث کرتی ہے اور چونکہ انسانی افعال و حرکات واقعات اقبل کے سبب سے سرزد ہوتے ہیں اس لیے چاہیے کہ ایک ہی قسم کے حالات و معاملات میں ایک ہی طرح کے نتائج پیدا ہوں۔ پھر تمام واقعات ماقبل نفس انسانی میں ہوتے ہیں یا اُس سے خارج اس لیے صاف طور سے یہ نظر آتا ہے کہ نتیجہ کے طور پر جس قدر تغیرات ہوتے ہیں یا بالفاظ دیگر وہ تمام انقلابات جنکے ذکر سے تاریخ کے صفحات رنگے ہوئے ہیں اور نوع انسانی کی ساری گردشیں، اُس کی ترقی، اُسکا تنزل سب ایک دو طرح کی تحریک کے تابع ہوتے ہیں یا ہونا چاہیے۔ یہی وہ مواد ہے جسکے ذریعے ایک فلسفیانہ تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ ایک فاضل مصنف کا قول ہے :-

> "اس زمانہ میں مطالعۂ تاریخ کا صحیح مفہوم اسباب و علل کے دریافت کرنے اور انہیں نتائج و عبر سے وابستہ کرنے کے علاوہ اقوام و ملل کی ترقی و تنزل اور عروج و پستی پر اُن کی موجودہ ذہنی، اجتماعی، مذہبی اور سیاسی روشنی میں بحث کرتا ہے۔"

یہاں تک تو صرف اس امر سے بحث تھی کہ تاریخ حقیقت میں ہے کیا۔ ایک مورخ کو کن کن علوم سے واقف ہونا چاہیے اور تاریخ کی ترتیب میں اُسے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وغیرہ۔ اس بحث نے مضمون کو کسی قدر خشک اور غیر دلچسپ ضرور بنا دیا مگر امید ہے کہ عامیان سائنس کے روبرو تاریخ کا صحیح مفہوم آگیا ہوگا۔ اب ہم اُن امور سے بحث کریں گے جن کی بنا پر تاریخ کو سائنس پر فوقیت حاصل ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ زمانہ میں سائنس کے حیرت انگیز انکشافات نے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ جن باتوں کو ہم افسانوں میں پڑھتے تھے اُن کو آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں

کل امور دنیاوی کی انجام دہی کے لیے وہ وہ سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں جو حضرت انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں مگر آخر یہ حیرت انگیز ترقیاں جن پر سائنس والوں کو آج اس قدر ناز ہے صورت پذیر کیونکر ہوئیں - حامیان سائنس تعصب ... کے چشمہ کو آنکھ سے اُتار کر اگر بہ نظر انصاف دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ سب تاریخ ہی کا طفیل ہے - اس دعوے کی وضاحت کے لیے تمثیلاً ایک ایسا ملک فرض کر لیا جائے جس میں صرف سائنسداں ہی آباد ہوں - جن کو تاریخ سے کوئی واسطہ نہ ہو - اور دوسرا ایسا ملک تصور کر لیا جائے جس میں صرف وہ لوگ رہتے ہوں جنھیں تاریخ کے سوا کسی دوسرے علم سے کچھ سروکار نہ ہو - پہلے ملک میں جا کر دیکھا جائے تو سائنس دانوں کو سوائے اپنے تجربات، مشاہدات اور سائنٹفک تحقیقات Scientific Research کے کوئی دوسرا کام نہ ہوگا اور وہ سلطنت کا بار گراں اپنے کمزور کاندھوں پر اُٹھانے کے قابل نہ ہوں گے - کیونکہ اہل سائنس کے درمیان ہمیشہ تنازع برپا رہتا ہے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ خود اہل سائنس نے ہمیشہ سائنٹیفک تحقیقات کی مخالفت کی - جب کبھی اور جہاں کہیں سائنس میں کوئی نئی دریافت یا تحقیقات ہوئی تو سب سے پہلے اُس کی مخالفت میں سائنسداں ہی آستینیں چڑھا کر سامنے آئے - کوپرنکس، گلیلیو اور ہاروے کی مخالفت سب سے پہلے نہایت شد و مد کے ساتھ سائنس دانوں ہی نے کی .... جب بنجمن فرانکلن نے رائل سوسائٹی کے سامنے برق Lightening Conductor کی بحث پیش کی تو تمام اہل سائنس نے اُسے بے وقعت بتایا اور رسالہ فلاسوفیکل ٹرانزکشن Philosophical Transaction نے اس مضمون کو درج کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ وہی چیز آج کل کس قدر مفید اور کارآمد ثابت ہوئی اور اس کا استعمال کس درجہ عام ہو گیا ہے - جب نامور اور مشہور منجم اراگو نے برقی تار کے متعلق بحث کرنا چاہی تو فرنچ اکاڈمی آف سائنس نے اس کی خوب ہنسی اُڑائی اور اُسے بحث کرنے نہ دیا - یہ چند عام اور معمولی نظیریں پیش کی گئی ہیں ورنہ سائنس کی ہر شاخ کے متعلق صدہا مثالیں اسی طرح کی موجود ہیں - سائنس دانوں کے اس اختلاف و نزاع میں منہمک رہنے کے بعد اس کی کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ کاروبار سلطنت سنبھال سکیں گے - بدنظمی کی وجہ سے امن و امان مفقود ہوگا اور سارے ملک پر جنگ و جدال باہمی کا اندھیرا چھایا رہے گا - ایسی صورت میں بیچارے سائنس داں کیسے اپنی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھ سکیں گے - نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کی بربادی کے ساتھ ساتھ سائنس کی تحقیقات کا بھی دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا -

اب دوسرے ملک کو دیکھیں جہاں کے باشندے صرف علم تاریخ سے واقف ہیں اور جنکو سائنس

سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہاں لوگ ہر وقت اپنے آبا و اجداد کے کارہائے نمایاں پر فخر کرتے نظر آئیں گے۔ تاریخ ان میں حریت و آزادی کی روح پھونکے گی۔ سب بالاتفاق اپنے وقار قومی کو برقرار رکھنے میں کوشاں رہیں گے۔ ملک میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہوگا۔ تاریخ انھیں سلطنتوں اور قوموں کے عروج و زوال کی حکایتیں سنا سنا کر حکومت کی صحیح تعلیم دیتی رہے گی اور ہر باشندۂ ملک کو یہ فکر لگی رہیگی کہ علوم و فنون کی تحصیل اور دولت و ثروت کے حصول میں ہم دوسرے ممالک کے باشندوں سے پیچھے نہ رہیں۔ غرضکہ ساری آبادی بیداری، حمیت، اور ترقی کی نعمتوں سے مالامال ہوگی۔ اس ملک کو ہر طرح آباد اور یہاں کے باشندوں کو ہر آئینہ دل شاد دیکھ کر اول الذکر ملک کے پریشان حال سائنس دانوں کے لیے بھی سوائے اسکے چارہ نہ ہوگا کہ اپنی لیبرٹریوں (معملوں) کو مقفل کرکے اور اپنے تمام آلات کو سر پر رکھ کر وطن سے بھاگیں اور ہجرت کرکے اس ملک میں جا بسیں جہاں کے پُرامن ماحول میں رہ کر وہ اپنی سائنٹیفک تحقیقات کو باطمینان جاری رکھ سکتے ہیں اور جہاں کی حکومت ہر طریقہ پر ان کی ہمت افزائی اور اعانت کرسکے گی۔

اس تمثیل کے بعد غالباً حامیان سائنس کو اس امر کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہوگا کہ تاریخ کو سائنس پر صریح تفوق حاصل ہے۔ جو قوم کوئی تاریخ نہیں رکھتی یا اپنی تاریخ کو بھلا بیٹھی ہے وہ قوم قوم ہی کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایسی بہت سی قومیں نظر آتی ہیں جن کی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چلتا اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قومیں کیسی پستی کی حالت میں ہیں۔ پستی کی انتہا یہ ہے کہ خود ان کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ نہ ابھرنے کا کچھ خیال ہے نہ ترقی کا۔ ایسی قوموں کا ہر فرد حقیر و ذلیل پیشے اختیار کرتا ہے۔ خود کو انسان تو تصور کرتا ہے مگر ایسا انسان جو ہر طرح کے احساسات سے عاری ہو — ان کے ہر فرد کا ضمیر مردہ ہوگیا ہے اور انھیں کچھ خبر نہیں کہ انسان ہونے کی حیثیت سے ان کے دنیا میں کیا فرائض ہیں۔ زندگی کا مقصد انکے نزدیک صرف اس قدر ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنا پیٹ بھر لیں یا تن ڈھک لیں۔ گویا وہ تمام قوتیں ان سے سلب ہوگئی ہیں جو انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی اور اُسے پستی سے بلندی کی طرف لے جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ نہ ان کا کوئی مذہب ہے اور نہ مخصوص طریقۂ عبادت۔ آخر اس سب کا کیا سبب ہے۔ کیا خالق کائنات نے انسانوں سے جدا قسم کی یہ مخلوق بنائی ہے۔ بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ دیکھنے میں وہ عام انسانوں ہی کے سے جسم رکھتے ہیں۔ ان ہی کے مانند دل دماغ والے ہیں۔ وہ سب قوتیں بھی ان کے اندر کہیں نہ کہیں ضرور پوشیدہ ہیں جن کی وجہ سے دوسری ترقی یافتہ اقوام نے انسانوں کی صف اول میں جگہ پائی ہے

ان قوموں کی پستی کے اسباب کی جستجو کی جائے تو سب سے پہلے ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ کوئی تاریخی سرمایہ نہیں رکھتی ہیں۔ اگر اُن کی کوئی تاریخ ہے بھی تو وہ خود اُس کو بھلا چکی ہیں۔ نہ اُن کو یہ معلوم ہے کہ اُن کے اسلاف کون تھے اور دنیا میں کیا کارنامے وہ چھوڑ گئے ہیں۔ نہ اُن کو کبھی اس کا احساس ہوتا ہے کہ اپنے اسلاف کی یاد تازہ رکھنے اور اُن کی عزت و ناموری کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں دنیا میں کیا کرنا چاہیے۔ آجکل دنیا کے ہر ہر گوشے میں آزادی، آزادی کا شور و غل ہو رہا ہے۔ ہر قوم دوسروں کی غلامی سے نکلنے اور آزادی کی نعمت حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ کیا غلام قوموں کی یہ بیداری سائنس کی رہین منت ہے؟ کیا سائنس نے اُن میں آزادی کی روح پھونکی ہے۔ کیا ایک غلام ملک میں سائنس ترقی پا سکتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ جب تک تاریخ کسی قوم میں آزادی کی روح نہ پھونکے اُسے خواب غفلت سے بیدار نہ کرے اُس وقت تک وہ علوم و فنون، صنعت و حرفت و تجارت غرضکہ کسی شعبہ میں بھی ترقی نہیں کر سکتی۔ آج سائنس داں اصحاب جس قدر اپنی حیرت انگیز ایجادات پر نازاں ہیں کیا یہ اُسی آزادی کا طفیل نہیں جس کی روح تاریخ نے اُن میں پھونکی تھی۔ جرمنی آج سے بارہ سال قبل معاہدہ وارسائی کے رو سے غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ اور وہ اب مسلح یورپ کے عین وسط میں اپنے آپ کو بے اسلحہ کے پاتا ہے کیونکہ اُسے ایک لاکھ سے زیادہ فوج رکھنے کا اختیار نہیں اور وہ بھی زبردست توپ خانوں، فوجی طیاروں اور ٹینکوں کے بغیر۔ اس لیے قدرۃً اُس کو ایسے دفاعی سامان حرب کی تیاری کا خیال پیدا ہوا جو اگرچہ ہلاکت خیزی کے لحاظ سے آہنی اسلحہ سے زائد خطرناک ہیں مگر معاہدۂ وارسائی کے رو سے ممنوع نہیں قرار دیے گئے ہیں۔ ضرورت کسی قانون کی پابند نہیں۔ قومیں اپنی حفاظت کے لیے قدرتی اصول کا تتبع کرتی ہیں۔ کسی ایسی قوم پر جس میں طبعی اور موروثی عظمت و قوت موجود ہو زیادہ دباؤ ڈالنے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو مجتمع کرتی اور عین وقت پر بھڑک اُٹھتی ہے۔ اسی اصول کے ماتحت آج جرمنی کے سائنس داں اپنی جدید طرز کی تجربہ گاہوں میں موت اور تباہی کے لرزہ افگن طلسم کی تیاری میں مصروف ہیں۔ چنانچہ برلن یونیورسٹی کے کیمیکل انسٹی ٹیوٹ کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر شلنک کا بیان ہے کہ

"جہاں دوسری قومیں اسلحہ کی تیاری میں مصروف ہیں وہاں ہم بھی بیکار نہیں۔ ہماری حالت بہت خطرناک ہے۔ ہمیں اسلحہ کی ایک خاص حد کے اندر رہنے پر مجبور کیا گیا ہے اور وہ بھی جدید وضع کے ترقی یافتہ اسلحہ نہیں۔ اس کا مقصد عیاں ہے کہ جرمنی چھوٹے سے چھوٹے ہمسایہ ملک کے مقابلہ میں بھی بے دست و پا بنا دیا گیا ہے۔ لیکن تحفظ نفس ایک زبردست قوت ہے۔ اگرچہ

مجھے اجازت نہیں کہ اُن گیسوں اور دیگر اشیاء کے متعلق کوئی بات ظاہر کروں جن کو ہم نے قومی تحفظ کی غرض سے ایجاد کیا ہے۔ پر انہیں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے سائنس داں جرمنی کے تحفظ کی تدبیروں میں بہت منہمک ہیں اور ہم اپنے اس کام میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔"

یہ جو قومی تحفظ کا ذکر پروفیسر صاحب نے کیا آخر اس کا احساس اُن میں کس طرح پیدا ہوا؟ عہدنامہ وارسائی کے رو سے جو پابندیاں جرمنی پر عائد کی گئی تھیں آخر اُن سے بیزاری کا کیا سبب ہے؟ کیا علم تاریخ ہی نہیں ہے جس نے جرمن قوم میں آزادی کی روح برقرار رکھی اور جب اُس پر زیادہ دباؤ پڑا تو اُس کی موروثی عظمت و شوکت کو کسی طرح گوارا نہ ہوا کہ ان پابندیوں میں جکڑا رہنا قبول کرے۔ انگریزی کا مشہور مقولہ ہے کہ Necessity is the mother of invention (ضرورت ایجاد کی ماں ہے) اسی ضرورت کے احساس نے جرمن قوم کو مختلف قسم کی ایجادات میں مصروف کر دیا۔ اگر اہل جرمنی اپنی تاریخ کو فراموش کر چکے ہوتے تو آج اُن میں یہ آزادی کی روح نظر آتی اور نہ ان پابندیوں کی ذلت کا احساس ہوتا۔ نہ اُنکو قومی دفاع کا خیال پیدا ہوتا اور نہ یہ حیرت انگیز سائنس کی ایجادات ظہور پذیر ہوتیں۔ یہ ہے تاریخ کی اہمیت سیاسی نقطہ نظر سے۔

مذہبی نقطۂ نظر سے اگر سائنس اور تاریخ کا مقابلہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ سائنس کو ہمیشہ مذہب سے پرخاش رہی اور اُس کی بنیاد محض ہٹ دھرمی اور جہالت پر ہے کیونکہ سائنس داں مذہب کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ اہل سائنس کا دارومدار عقلی استدلال پر ہے۔ وہ اُسی معیار پر ہر بات کو پرکھتے ہیں اور جو باتیں اُنکے اصولوں کے مطابق نہیں ہوتیں اُنکو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ صرف عقل ہی انسان کی واحد خصوصیت نہیں بلکہ اُس میں دوسری قوتیں بھی ہیں اور احقاق حق میں محض عقل ہی پر دارومدار نہیں ہوتا۔ بلکہ اور قوتیں بھی کام کرتی ہیں۔ مثلاً انسان کی اخلاقی و روحانی قوتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ عقل اُسی وقت تک کام دیتی ہے جب تک علت و معلول کا تعلق ہے۔ لیکن جہاں اسکے سوا اور بھی کچھ ہے وہاں روحانی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جب معمولی باتوں کی تحقیق میں، حالات و عادات و اغراض کی بنا پر عقل بھٹک جاتی ہے تو اُن معاملات میں اُس کی کیا پیش جا سکتی ہے جن کا تعلق زیادہ تر وجدان سے ہے۔ چونکہ مذہب کی بنیاد بعض مافوق العادات امور پر بھی ہے جو عقل سے بالاتر ہیں اسلیے اہل سائنس کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی اور وہ نافہمی سے اُس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ جب ایک سائنسداں کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو وہ صاف کہہ اُٹھتا ہے کہ یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہیں —— گویا

تمام قوانین فطرت اُس کے دیکھے بھالے ہیں اور وہ اُن سب پر حاوی ہو چکا ہے - حالانکہ وہ چند قوانین فطرت جن کے علم پر اہل سائنس کو ناز ہے، بالکل محدود ہیں - کیونکہ وہ صرف مادی حالات سے متعلق ہیں - عقل خود محدود ہے اور سائنس جس کی بنیاد اُس پر ہے اُس سے بھی محدود تر - اُسے غیر محدود کا علم یا معرفت کیسے ہو سکتی ہے - سائنس مادیات سے آگے نہیں بڑھ سکتا، اگرچہ اس میدان میں بھی اُس کا علم بہت محدود ہے - پھر اس محدود اور یک طرفہ علم پر اُسکے یہ دعاوی محض ہیچ ہیں اور بغیر اُس کو جو میں قدم رکھے جو مادیات سے ماورا ہے اور اُس کی کامل تحقیقات کیے اُسکا انکار کرنا قابل سماعت ہے - ایسی صورت میں اہل سائنس کا مذہب سے انکار کرنا یا اُس کا مخالف ہونا سراسر نادانی و کم فہمی ہے -

اس کے برخلاف تاریخ انسان میں ایسی روح پھونک دیتی ہے جسکے لیے انسان اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا - یہ تاریخ ہی ہے جو روحانی قوتوں کو نشو ونما دیتی، ہمارے اخلاق کو درست کرتی، نوع انسانی کا درد ہم میں پیدا کرتی اور انسان کو حقیقی معنوں میں انسان اور اشرف المخلوقات کے معزز لقب کا اہل بناتی ہے -

حامیان سائنس اگر سرسری نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بجاے اس فن شریف کو بنظر غائر ملاحظہ فرمائیں گے تو امید ہے کہ ایسے حقائق اُن پر منکشف ہوں گے جن کا اُن کو خواب و خیال میں بھی گمان نہ ہوگا اور اُس وقت وہ تاریخ کی حقیقی اہمیت کے قائل ہو جائیں گے -

غزل جناب منشی علی عظیم صاحب عظیم تینوی عظیم آبادی

نگاہ نیچی ہے گردن جھکائے جاتے ہیں
ہمیں وہ خاک میں ناحق ملائے جاتے ہیں

غضب کے تیر نظر وہ چلائے جاتے ہیں
دل و جگر مرے چھلنی بنائے جاتے ہیں

کھنچی ہے آنکھوں کی ڈوری خمار مستی ہے
اُٹھے ہیں سو کے وہ فتنے جگائے جاتے ہیں

الگ کھڑے ہیں وہ سرگوشیاں ہیں دشمن سے
ہمارے راز ہمیں سے چھپائے جاتے ہیں

ہماری مرگ سے کیا کیا رقیب ہیں شاداں
چراغ گھی کے گھروں میں جلائے جاتے ہیں

جگر کی پوچھتے کیا ہو یہی غنیمت ہے
نگاہ ناز سے دل کو بچائے جاتے ہیں

یہی بہت ہے کوئی ساتھ دیدے دنیا میں
لحد میں بھی کہیں اپنے پرائے جاتے ہیں

ٹھہر بھی اے دل مضطر یہ کیوں ہے بیتابی
شروع عشق میں سب آزمائے جاتے ہیں

صمیم قلب سے ملتے جو ہیں وہ کم ہیں عظیم
کہیں ہزار میں دو ایک پائے جاتے ہیں

تلوار ہم وہی ہیں لیکن وہ دم نہیں ہے

(جناب حکیم افتخار علی صاحب جگر صدیقی بسوانی)

اے امتِ محمدؐ کب تک یہ خوابِ غفلت
وہ کیا ہوئی شجاعت اب کیا ہوئی وہ جرأت

خالدؓ جری جناں میں بے چین ہو رہا ہے
بے ہمتی کا تیری رونا وہ رو رہا ہے

کہتا ہے آہ کیا تھے کیا آہ ہو گئے ہو
تم شیر تن تھے روباہ ہو گئے ہو

وہ دن ہیں یاد تم کو دجلے کے جب کنارے
ایرانیوں کا لشکر تھا سامنے ہمارے

سازو یراق سب میں باہم تھے وہ زیادہ
ہم شیر تھے وہ آہو ہم کم تھے وہ زیادہ

شمشیر حق نے کردی کفار کی صفائی
اک نہر خوں کی بہہ کر دریا سے ملنے آئی

مسلم جو یا محمد کہکر پکارتے تھے
بڑھ بڑھ کے سب مجاہد تلواریں مارتے تھے

زندہ بچا نہ اُن میں آخر کوئی سپاہی
یوں فوجِ خسروی پہ نازل ہوئی تباہی

یرموک کا وہ دن بھی تاریخ کا ہے عنواں
لاکھوں تھے روم والے گنتی کے تھے مسلماں

بکتے تھے ہنسکے کافر ہاں ہیں یہ مرنے آئے
دینِ محمدی پر قربان ہونے آئے

میداں میں سب سے آگے تھے خالدؓ دلاور
موئے محمدی کی پہنے کلاہ سر پر

اصحاب مصطفےٰ کے حملے کیے ہوئے تھے
ضرارؓ و عبد رحماںؓ برچھے لیے ہوئے تھے

دریائے فوج رومی یوں جوش کھا کے اُمڈا
گویا کہ غرق ہوں گے سب کوہ و دشت و صحرا

جھنکاریاں سناں کی ہر سو کھڑک رہی تھیں
تیغوں کی بجلیاں بھی کیا کیا چمک رہی تھیں

مُنہ مہر آسماں نے تھا خوف سے چھپایا
گردوں کا ابر روزِ یرموک ایسا چھایا

رومی تھا کوہ پیکر اک پہلواں جو آگے
ضرارؓ اس سے لڑنے گھوڑا بڑھا کے پہونچے

دل میں خیال آیا پہنے زرہ جو ہم ہیں
اچھا ہوا کہ اپنے دشمن سے قد میں کم ہیں

اندیشہ جو دل میں گزرا میداں سے آپ پلٹے
تن سے زرہ اتاری عریاں بدن ہی پہونچے

خالدؓ کے پوچھنے پہ ضرارؓ نے بتایا
تھا نفس نے محافظ میری زرہ کو سمجھا

خلاقِ دو جہاں کا ہے حافظ اور نگہباں
یہ کہہ کے آپ پہونچے سوئے حریفِ میداں

چلایا وہاں تھا رومی غصہ میں بھی بھرا تھا — ضرارؓ پہ وہ خنجر سے وار کر رہا تھا

ضرارؓ نے جو بڑھ کر بھر پور ہاتھ مارا

رومی تڑپ رہا تھا اور جسم تھا دو پارا

افریقہ مصر سے وہ تا ہند ملک لینا — وہ ہر قدم پہ فتح و نصرت کا ساتھ دینا

اے قوم تو وہی ہے اے قوم تو وہی ہے — اب کیا ہوا ہے تجھکو تو کیوں بدل گئی ہے

بے خوف دل میں خالص نیت نہیں ہے باقی — ہم ہیں وہی مسلماں ہمت نہیں ہے باقی

اب کوئی ہم میں باقی خالدؓ ضیغم نہیں ہے

تلوار ہم وہی ہیں لیکن وہ دم نہیں ہے

کوئی عمرؓ سا غازی دل ہم کو اگر خدا دے — سوتا ہوا مقدر پھر وہ جگر جگا دے

برشِ سیف

(حضرت سیف خیرآبادی)

دل مضطرب ہے جلوۂ دلدار دیکھکر — اے بیخودیٔ شوق خبردار! دیکھ کر

سودا کریں گے دل کا خریدار دیکھ کر — معشوق کوئی شوخ طرحدار دیکھ کر

بیخود ہوئے ہیں یار کا دیدار دیکھ کر — ہم دو جہاں سے کھو گئے اک بار دیکھ کر

رکھتے ہیں دل میں یاد تری تازہ روز و شب — شمس و قمر میں ہم ترے انوار دیکھ کر

کچھ مقصدِ حیات کا سودا نہ کر سکے — کھوئے کچھ ایسے دہر کا بازار دیکھ کر

دل میں رہی ہمارے ہمیشہ تمہاری یاد — بھولے کبھی نہ ہم تمہیں اک بار دیکھ کر

پھولوں میں دیکھ لے نہ کہیں دام ہو چھپا — اے عندلیب زار خبردار دیکھ کر

حوروں سے اجتناب ہے جنت سے دل اُچاٹ — آئے ہیں جب سے کوچۂ دلدار دیکھ کر

افسوس بیکسی میں کسی کا کوئی نہیں — اُس نے جھڑک دیا مجھے اک بار دیکھ کر

کیا جانے کس خیال سے اُس نے اُٹھا دیا — بیٹھے تھے ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر

اتنا قلق ہوا ہمیں آنسو نکل پڑے — صیاد! بلبلوں کو گرفتار دیکھ کر

حق کہنے والے موت سے ڈرتے نہیں ہیں سیفؔ

منصور ہنس دیا رسن و دار دیکھ کر

(مرسلہ مائل انصاری خیرآبادی)

"سادگی و پُرکاری"

(جناب احسان دانش صاحب کاندھلوی)

یہ سرد موسم، خموش جنگل، فضا میں مستی، ہوا میں نرمی
ہوا ہے مژگاں پہ سرد بوندیں، جگر میں سوزِ الم کی گرمی

نکلتے سورج کی زرد کرنیں ہوا سے چھن چھن کے آ رہی ہیں
درخت انگڑائی لیکے جاگے ہیں کھیتیاں لہلہا رہی ہیں

پرے کھٹولے پہ جھونپڑی میں کسان بیچارہ سو رہا ہے
بجائے پائے کے ایک پچکا ہوا کنستر لگا ہوا ہے

کڑھائی میں رس اُبل رہا ہے فضا میں خوشبو رچی ہوئی ہے
رچی ہوئی ہے دھوئیں سے تھونی، گھڑوں کی کائی جمی ہوئی ہے

پڑی ہے اک الگنی پہ صافی سیاہ جالے لٹک رہے ہیں
اُڑے ہوئے پھُس کے جن میں کتنے مہین تنکے اٹک رہے ہیں

ہے شب کے جاگے ہوئے کمیروں میں ایک پُر خواب اضطراری
مگر ابھی تک چلا رہے ہیں غریب بیلوں کو باری باری

ہیں آگ کے گرد جمع دہقاں، دورِ حقے کا چل رہا ہے
دھواں زمیں سے بلند ہو کر ہوا پہ کروٹ بدل رہا ہے

فضا میں بیلوں کی گھنٹیوں سے چھڑی ہوئی جلترنگ سی ہے
ہیں رقص میں زر فروش کرنیں ہر ایک شے پہ اُمنگ سی ہے

جو کھیت گنّوں کا کاٹتے ہیں اُٹھے ہیں خالق کا نام لیکر
کہ دن کی تکلیف اُنکو چھوڑ گئی رات کا انتقام لیکر

(۲)

یہ بات احسان راز کی ہے سوا مرے دل کے کون جانے
کہ سر فروشانِ خانقاہی سے پاک تر ہیں یہ کارخانے

یہاں کی تقدیس میں ریا ہے نہ آستینوں میں بت یہاں
یہاں تو ہر اک نظر ہے سجدہ یہاں ہر انساں نسخۂ قرآں

بہارِ فردوس کا ہے دامن ہر ایک رنگیں گناہ اُن کا
پناہ دیتا ہے شرک و بدعت کو نعرۂ لا الٰہ اُن کا

ان آدمی زاد بھیڑیوں نے ہزاروں کا خوں بہائے ہیں
گھنیری داڑھی کی جنبشوں نے چراغِ ایماں بجھا دیئے ہیں

گزرتا ہے عرس کی بدولت قمر جبینوں میں سال انکا
خدا بچائے ریا میں ڈوبا ہوا ہے سب حال و قال انکا

جو دورِ انسانیت کی منزل سے ہیں وہی رہنما بنے ہیں
شریر، عصیاں شعار دیکھو خدا کے ہوتے خدا بنے ہیں

نوٹ۔ یہ نظم ایک سجادہ نشیں کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی، جنھوں نے صرف اس بنا پر مجھے سب سے بعد فاتحہ پڑھنے کی اجازت دی کہ میں تہیدست و تہی دامن تھا۔

انتخاب مشاعرۂ بزم جگر

مصرع طرح :- قربان ہوئی اُس بتِ کافر پہ خدائی

ماسٹر باسط بسوانی
یکسو جو ہوا دل تری صورت نظر آئی — اب وصل کا ہے وصل جدائی کی جدائی

سکریٹری بزم جگر
اس طرح مجھے دوست نے محفل میں ستایا — بیساختہ دینے لگا دشمن کی دوہائی
کس دشمنِ جاں سے ہے مرے دلکو محبت — یہ بات بتاؤں گا کسی کو نہ بتائی
خاطر سے مری وہ نہ کہیں سست قدم ہو — رہبر پہ نہ ظاہر ہو مری آبلہ پائی
اُفتادہ یہ افتادہ تھی منزل نہیں چھوٹی — سرمایۂ ہمت ہے مری آبلہ پائی
آجائے جو باسط کوئی فریاد رسی کو — نالہ کی رسائی ہو مقدر کی رسائی

احمد خیرآبادی
بے علم نے تکلیف زمانہ میں اُٹھائی — بے علم نے راحت کبھی دنیا میں نہ پائی

ہدایت بسوانی
آنکھوں میں جو صورت ہے محمدؐ کی سمائی — اُس دن سے خدا ہی مجھے دیتا ہے دکھائی
خاک اہلِ جہاں نے مرے مدفن کی جو دیکھی — ہر ذرے میں دنیا کی حقیقت نظر آئی
جنت نظر آنے لگی ایک ایک قدم پہ — دی جس نے سرِ حشر محمدؐ کی دہائی

بیکس بگرامی۔
کچھ میں ہی نہیں اُسکا زمانے میں فدائی — قربان ہوئی اُس بتِ کافر پہ خدائی
اچھا ہی سمجھ کر اُنھیں دل نذر کیا تھا — یہ کب تھی خبر اس میں بھی کچھ ہوگی بُرائی
اللہ ری تاریکی شامِ غمِ فرقت — ظلمت کے سوا کچھ نہیں دیتا ہے دکھائی
تقدیر ہی برگشتہ ہے میں کیا کروں بیکس — کرتا ہوں بھلائی بھی تو ہوتی ہے بُرائی

راہم بسوانی
جو تجھسے ملا اُسکو ملی عمر خضر کی — جو تجھ پہ مٹا موت اُسے پھر نہیں آئی

سوز بسوانی
آواز دھڑکتے ہوئے دل نے یہ سنائی — ہشیار رہو غافل اجل آئی اجل آئی
تڑپے کبھی روئے کبھی ٹکرایا کبھی سر — جب قیدِ قفس میں خبرِ فصلِ گُل آئی
شداد کی تربت پہ یہی کہتی ہے عبرت — بنتا تھا خدا کیا ہوئی وہ تیری خدائی

رتن اوبگرآبادی
وہ روح کہ تھی جسم میں ہے دستِ اجل میں — جو چیز کبھی اپنی تھی وہ ہوئی آج پرائی
فرماتے ہیں پوچھا جو کبھی حال آپکا سب سے — جب ہم کو کبھی یاد رتن آپ کی آئی

حکیم
حسرت ہے کہ آجائے مجھے جسکی ہو آئی — دشمن کو بھی اللہ نہ دے داغِ جدائی

سید انوار حسین رئیس خیرآبادی

اُکتا پیرہنِ زیست کی بھی نوبت آئی — اے عشقِ جنوں خیز دہائی ہے دہائی
یہ ہاتھ ہے تقدیر کے یہ قسمت کی ہے بات — قابو میں ہے اپنے نہ بُرائی نہ بھلائی
تقدیر کی گتھی ہے یہ سمجھے یہ حکیم اب — کیا ناخنِ تدبیر سے ہو عقدہ کشائی

خلیل صدیقی بسوانی

بیتابیِ دل ہجر کے صدموں نے بڑھائی — گنتے رہے تارے شبِ غم نیند نہ آئی
تم بیٹھے رہے لاش اُٹھانے بھی نہ آئے — دُنیا سے اُٹھا کشتۂ غمہائے جدائی
منزل ہو مبارک تمہیں سب قافلے والو — اور مجھ کو مبارک ہو مری آبلہ پائی
پھر کعبۂ دل میں بتِ کافر کو جگہ دی — شرم اپنے خدا سے نہ خلیل آپ کو آئی

عارف خیرآبادی

کب دیکھیے ہوتی ہے مدینے میں رسائی — بیچین کیے ہے مجھے اب دردِ جدائی
صورت تری آئینہ مصور کا ہے گویا — یا اپنی ہی تصویر مصور نے بنائی
ہم بھیس میں واعظ کے سوئے میکدہ آئے — اس شان سے ہے آج قسم سے یہ چڑھائی
کیوں چاک گریبان کیا آپ نے عارف — اچھے بھلے بیٹھے تھے یہ کیا دل میں سمائی

مائل خیرآبادی

یہ ذائقہ یہ لطف یہ تیزی یہ صفائی — ساقی نے مئے تند مجھے آج پلائی
رکنے کی قسم قافلے والوں نے ہے کھائی — چلنے نہیں دیتی ہے مجھے آبلہ پائی
اُٹھے ہیں مرے قتل پہ یہ دستِ حنائی — اے یارِ طرحدار دہائی ہے دہائی

مختار بسوانی

نازاں رہے جلوے پہ دمِ جلوہ نمائی — موسیٰ کی غشی تم کو گوارا نہ آئی

نادر محمودآبادی

کھولا شبِ غم مجھکو اجل بھی نہیں آئی — مرتا ہوں میں بے موت مسیحا کی دہائی

واثق بسوانی

جب سے تری صورت مری آنکھوں میں سمائی — ہر شے میں تو ہی تو مجھے دیتا ہے دکھائی
ملتے نہیں خوش ہو کے ہم شیخ و برہمن — ہوتی نہیں آپس میں کسی طور صفائی
عاشق کے مقدر میں تڑپنا ہے بہرحال — وہ وصل کی صورت ہو کہ ہو شکلِ جدائی

حکیم جگر صدیقی وارثی

یادِ بتِ کافر میں ہمیں نیند نہ آئی — ہم جاگتے تھے رات کو سوتی تھی خدائی
ساتھی بھی چھٹے منزلِ مقصد کبھی نہ پائی — روتی ہے مقدر کو مری آبلہ پائی
دل خاک ہوا جل کے مگر تم یہ نہ سمجھے — کب آگ لگی کیسے لگی کس نے لگائی
ڈالیں بد و نیک پہ پردہ نہیں پڑتا — انسان کی چھپتی ہے بُرائی نہ بھلائی
گل کر چلے وہ ہنس ہنس کے چڑھا کے شگوفہ — پھر شمع مری قبر پہ رو رو کے جلائی
تم کیسے مسلماں ہو جگر کیوں نہ ڈرا دل — کہتی ہے خدا اُس بتِ کافر کو خدائی

نظرے خوش گزرے

بحمد اللہ، الناظر کی یہ جلد مکمل ہوگئی اور دورِ جدید کا سال اول بھی اتمام کو پہونچ گیا۔ چونکہ اس جلد میں مسلسل ہندسوں کا التزام رکھا گیا ہے اس لیے فہرست مضامین مرتب کرکے آخر میں اضافہ کی جاتی ہے۔ جو صاحب جلد بندھوائیں اس فہرست کو شروع میں چسپاں کرادیں۔ اس دفعہ بنظر اختصار مضمون نگاروں کے اسماے گرامی درج نہیں کیے گئے ہیں۔ آیندہ فہرستوں میں انشاء اللہ اس کا بھی التزام رہے گا۔

جولائی نمبر انشاء اللہ جنوری نمبر کی طرح زیادہ ضخیم ہوگا۔ اور خدا نے چاہا تو آیندہ سال مستقل حجم ۸۰ صفحے کردیا جاسکے گا۔

جن اصحاب کو جولائی سنہ ۲۳ء سے پرچے بھیجے جا رہے ہیں اُنکی میعادِ خریداری ختم ہوگئی۔ امید ہے کہ وہ جولائی نمبر کی اشاعت سے قبل چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں گے۔ ورنہ قسم اول کے خریدارو کے نام جولائی کا پرچہ بذریعہ وی پی روانہ ہوگا۔ مقامی خریداروں سے التماس ہے کہ وہ چندہ دفتر (جوہری محلہ۔ مکان محمد عمر محمد صدیق تاجران عطر و تمباکو) میں بھیجدیں یا جو آدمی جولائی کا پرچہ لے کر حاضر ہو اُسے مرحمت فرمائیں۔

برادر مکرم جناب منشی امیر احمد علوی صاحب کا سلسلۂ مضامین اس نمبر سے پھر شروع ہوگیا ہے۔ امید ہے کہ اس سال کے اندر یہ دلچسپ اور پُر معلومات سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے گا۔ منشی صاحب کی جدید کتاب "بہادر شاہ ظفر" جس کا ذکر کسی سابقہ پرچہ میں کیا گیا تھا اب چھپ کر تیار ہوگئی ہے۔ شایقین دفتر الناظر سے طلب فرمالیں۔ قیمت عہ ہے۔

دس گیارہ سال بعد، گزشتہ مہینے میں لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ کاروباری مصروفیتوں نے اسکا موقع نہیں دیا کہ لاہور کے کثیر التعداد ادبی دوستوں اور اردو نوازوں سے مل سکتا، صرف سر اقبال، مولانا سید ممتاز علی، اُنکے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج، اور مولانا تاجور سے مختصر سی ملاقاتیں ہوئیں جس سرگرمی اور جوش کے ساتھ زندہ دلانِ پنجاب اردو کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں اُنکے خواہ

ہر طرف نظر آئے۔ مطابع کی کثرت، تجارتی کتب خانوں کی فراوانی، اخبارات و رسائل کی بہتات کے ساتھ ساتھ ہر در و دیوار پر اردو کے سائن بورڈ، کتبے اور اشتہارات دیکھ کر مسرت ہوئی۔

یہ ضرور ہے کہ جو کچھ لاہور میں چھپتا ہے اُس کا بہت ہی قلیل حصہ ایسا ہوتا ہے جو اُردو زبان کے لیے باعثِ فخر کہا جا سکے۔ مگر امید قوی ہے کہ یہ حالت زیادہ دنوں تک برداشت نہ کی جائیگی۔

اب سے پچیس تیس سال قبل منشی محمد الدین صاحب فوق اور میر غلام بھیک صاحب نیرنگ کے سوا شاید کوئی تیسرا پنجابی ادیب و شاعر ایسا نہ تھا جسکا کلام زبان کی معمولی غلطیوں سے پاک اور جسکی انشا صحیح اُردو میں شمار ہونے کے لائق ہو۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب اُس وقت اہل پنجاب میں شمار نہیں کیے جا سکتے تھے۔ مگر نئی نسل نے بہت سے اہل قلم ایسے پیدا کر دیے ہیں جن کی نظم و نثر اہل زبان کے معیار پر اگر نہیں تو زباندانوں کے معیار پر ضرور پوری اُترتی ہے اور آثار ظاہر بتاتے ہیں کہ ایسے اصحاب کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔

لاہوری مطبوعات کی ظاہری حالت اب بہت کچھ سُدھر چلی ہے۔ گو حقیقی زیبائش کے مقابلہ میں نمائشی آرائش پر زیادہ ہمت صرف ہوتی ہے۔ لیکن محاسن باطنی کی طرف افسوس ہے کہ بہت ہی کم توجہ کی جاتی ہے۔ درسیات اور طلبہ کے لیے جو کتب تیار کرائی جاتی ہیں اُن سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو سنجیدہ مذاق کی کتابیں بہت کم شایع ہوتی ہیں اور وہ بھی ادبی حیثیت سے چنداں قابل اعتنا نہیں کہ بیشتر حصہ ایسے اہل قلم سے تیار کرایا جاتا ہے جنکے نزدیک صحیح و فصیح اُردو لکھنے کی کوشش کرنا ایک فعل عبث ہے۔ تفریحی ادبیات پر زیادہ توجہ ہونا تعجب انگیز نہیں کیونکہ انکی تیاری میں محنت کم، نفع زائد ہے اور دلچسپی، تفریح و قبولیت عام مستزاد۔ لیکن ادبی نقطۂ نظر سے یا صحت زبان و فصاحت بیان کے اعتبار سے جانچا جائے تو یہ حصہ بھی زیادہ وقیع ثابت نہیں ہوگا کیونکہ اہل قلم اور اہل تجارت دونوں کو تیار شدہ مال کی نوعیت سے زیادہ بحث نہیں بلکہ کام کی کثرت اور کتابوں کی نکاسی کا خیال زائد رہتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ حالات بھی جلد تبدیل ہو جائیں اور لاہور میں کوئی مرکزی ادارہ ایسا قائم ہو جائے جو شایع شدہ کتابوں پر مسلسل احتساب و تنقید کر کے لوگوں کو کھوٹے کھرے میں فرق و امتیاز کرنے کی دعوت دے اور صحیح و فصیح اُردو کی کتابیں تیار کرا کے نمونہ کے طور پر پنجاب میں شایع کرتا رہے۔

انجمن ترقی اُردو، دار المصنفین، یا اُردو اکاڈمی کا سا بھی کوئی ادارہ لاہور میں نہیں جسکے مطبوعات سنجیدہ اور با مذاق اہل علم میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جائیں۔ اور جو نوجوانوں میں ٹھوس علمی و ادبی خدمت کا ولولہ پیدا کرنے کا ذریعہ بنے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم

- فسانۂ عجائب
- انشاے سرور ۶

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات نامکمل
- صنم خانۂ عشق
- مرآۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین ۸
- مینائے سخن
- مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم

- سرمایۂ زبان اردو
- منتخب نہاے دلکش
- نظم نگارین
- رسالہ تذکیر و تانیث ۸
- افادۂ تاریخ ۸
- قواعد المنتخب ۴

مرزا محمد عباس حسین ہوش مرحوم

- فسانۂ نادر جہاں
- پیاری سہیلی ۱۲
- [illegible] ۸
- [illegible] ۱۲

منشی فضل حسین ثابت

- حیات دبیر
- دربار حسین

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ کامل ۴ جلد
- کامنی
- بچھڑی دلہن ۶

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۸
- حاجی بغلول ۸
- پیاری دنیا ۸
- کایا پلٹ ۸
- میٹھی چھری ۶
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس ۱۲

منشی جوالا پرشاد برق

- مرآۃ النبی ۱۲
- مار آستین ۱۲
- بنگالی دلہن ۱۲
- معشوقۂ فرنگ ۱۲
- ہرتاب ۱۲
- روہنی ۱۰

پریم چند

- پریم بتیسی
- پریم حسن

مولانا عبد الحلیم شرر

- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی
- تذکرہ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰
- الفانسو ۱۲
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- جویاے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گزشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر دجال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- مینا بازار

حکیم محمد علی خان مرحوم

- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اختر حسینیہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال ۴
- گنجینہ ۱۲
- سیکفرن اور لوسی ۲

خواجہ عبد الرؤف عشرت

- زبان دانی ۶
- اصلاح زبان اردو ۶
- قواعد میر ۶
- اصول اردو ۶
- جان اردو ۶
- شاعری کی پہلی کتاب
- ” دوسری کتاب
- ” تیسری کتاب
- لغات اردو

منشی محمد احسن وحشی

- محبوس گشت
- جام مہر

مولانا حکیم عبد الغنی مرحوم

- یاد ایام
- تذکرۂ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- ” ” ” دوم
- ” ” ” سوم
- ” ” ” چہارم
- ” ” ” پنجم
- ” ” ” ششم
- ” ” ” ہفتم
- ” ” ” ہشتم
- ” ” ” نہم
- ” ” ” دہم
- ” ” ” یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری

- الاسلام والنصرانیہ ۱۲
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی

- سیرۃ الصدیق
- علماے سلف
- تذکرۃ الشعراء حیدرآباد

حافظ اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت نبواتیہ
- خلافت عباسیہ
- عباسیۂ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری

- رحمۃ للعالمین
- سفرنامۂ حجاز

مولوی خلیل الرحمن

- اخبار الاندلس جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا ۱۲

مولوی محمد انشاء اللہ

- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات عراق عرب و ایران
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ ترکی دولت عثمانیہ

منشی سجاد حیدر لکھنوی

- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امراے ہنود

ہنومان ناٹک — مہاتما بدھ کی مختصر سوانح عمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ۴

ملنے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ